سوویت لوگوں کی داستانیں

سوویت لوگوں کی داستانیں

ترجمہ: مرزا اشفاق بیگ

لاہور • حیدر آباد • کراچی •

نام کتاب : سوویت لوگوں کی داستانیں

ترجمہ : مرزا اشفاق بیگ

اہتمام : ظہور احمد خاں

پبلشرز : فکشن ہاؤس لاہور

کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور

پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور

سرورق : ریاض ظہور

اشاعت : 2012ء

قیمت : -/300 روپے

تقسیم کنندہ:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-37249218-37237430

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدرآباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی

• لاہور • حیدرآباد • کراچی

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

فہرست

ترقی کی شاہراہ پر

عام طور پر حکومت کے سربراہ اپنے ملک کی راجدھانی ہی میں بودوباش اختیار کرتے ہیں۔
گالینا لوگونووا اس معاملے میں بالکل مختلف ہیں۔ وہ بیلوروس ریپلک کی پارلیمنٹ کی نائب صدر
ہیں لیکن ریپلک کے دارالخلافے منسک کے بجائے دور دراز وی تبسک علاقے میں رہتی ہیں۔
یہیں انہوں نے اپنی ترقی کی شاہراہ پر پہلا قدم رکھا تھا۔
''میری سرگزشت میرے ہزاروں ہم عمروں ہی کی طرح ہے۔ جب آنکھیں کھولیں تو
جنگ برپا تھی...'' پھر گالینا نے کہا:
''میرا آبائی گاؤں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر آباد ہے۔ اس کے چاروں طرف گھنا اور
پُراسرار جنگل ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو وہ آسمان کے پس منظر میں ایک ایسا اداس سا جھکتا
ہوا سیاہ سایہ دکھائی دیتا ہے جو تمام گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہتا ہو۔ اور جب سورج چمکتا
ہے تو جنگل میں جیسے جان آجاتی ہے، وہ پھیلنے لگتا ہے اور جگمگانے لگتا ہے۔''
... لیکن بھورے لباس والی اس بچی کو جنگل میں موت ہی موت نظر آتی تھی۔ جنگ کی ابتدا میں
ہی اس کا باپ جنگل چلا گیا تھا۔ ہر رات تمام علاقہ گولیوں کی تڑاتڑ اور سرنگیں پھٹنے کے بھداکوں سے
گونجتا رہتا۔ بعد میں لوگ دیکھتے کہ نازی اپنے فوجی افسروں کی لاشیں جنگل سے باہر لے جارہے
ہیں... اکثر رات کو چھاپے ماروں کے ہرکارے چھپ چھپا کر گاؤں میں آتے اور خبریں سناتے
تھے۔ کبھی کسی گاؤں والے کے بارے میں کہتے: ''وہ ایک بہادر کی موت مرا...'' ہر مرتبہ گالینا کی ماں
کے کان اپنے خاوند کا نام سننے کے لئے تیار رہتے... لیکن الکسئی لوگونوف نے برلن تک کا فاصلہ طے
کیا اور وہ جنگ کے خاتمے تک لڑتے رہے۔ گالینا کی ماں کا انتقال البتہ پہلے ہو گیا۔
تمام اناج جنگل میں چھپا دیا گیا تھا۔ جنگ کے زمانے میں بھوک فاقے کی حالت ایسی تھی
کہ باجرے کا ایک ایک دانہ سونے میں تولا جاسکتا تھا۔ گالینا کو یاد ہے کہ ''کھانے کے لئے کافی
گھاس تک نہیں تھی۔'' جنگل خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہاں کوئی بھی جگہ جنگ کے دغا باز
''اچنبھوں'' سے محفوظ نہ تھی۔ ہر درخت کے پیچھے ایک فتیلہ پوشیدہ تھا۔ اسے بس چھوا ہی... اور
آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والا ایک شعلہ بھڑکا، زمین بھک سے اڑی اور مٹی فر کے درختوں کے
اوپر تک بکھر گئی۔ یہ تھیں سرنگیں...
بچے جنگل کو مربھکوں کی طرح حسرت سے دیکھا کرتے تھے۔ وہ سیاہ درختوں کے پیچھے سے

زندگی انہیں اشاروں سے بلاتی تھی... اور موت بھی۔

جب بھی کوئی ماں جنگل کو جاتی تو اپنے بچوں کو اس طرح پیار کرتی تھی جیسے یہ آخری بار ہے۔ لڑکیاں سر پر پھٹے ہوئے رومال باندھے اور لڑکے فوجی ٹوپیاں پہنے اپنی ماؤں کو دیر تک تکتے رہتے تھے یہاں تک کہ وہ ریتیلے ڈھال پر سے گزر کر جنگل میں غائب ہو جاتی تھیں۔ کیا وہ لوٹیں گی؟! اکثر ایسا ہوا کہ وہ کبھی نہیں لوٹیں۔

ایک روز گالینا کی ماں بھی گاؤں سے باہر گئی اور کبھی نہیں لوٹی۔ گالینا نے اس سرنگ کو پھٹتے ہوئے نہیں دیکھا جس نے اس کی ماں کی جان لی تھی۔ اسے بس یہ معلوم تھا کہ یکایک لوگوں نے اسے یتیم کہنا شروع کر دیا۔ ایک مدت کے بعد جب اسے زمین کا صاف کیا ہوا ایک حصہ دکھایا گیا تب ہی وہ پانے ماں کے المیے کو پوری طرح سمجھ پائی۔

گالینا اپنی خالاؤں کے پاس رہنے لگی۔ موسم بہار میں وہ کھیتوں میں آلو جمع کرنے جایا کرتی تھیں ___ یہ پچھلی خزاں کے بچے ہوئے تھے۔ انہیں پالا مار گیا تھا۔ وہ پتھر کی طرح سخت ہو گئے تھے۔ لیکن گرمی سے وہ پگھل جاتے اور مٹھی میں تو ریزہ ریزہ ہو جاتے تھے۔ انہیں صاف کرنے اور پیسنے کے بعد بھورے رنگ کی چھوٹی چھوٹی چپاتیاں بنائی جاتی تھیں۔ اس زمانے میں وہ بے حد لذیذ خیال کی جاتی تھیں اور ان سے پیٹ بھی خوب بھرتا تھا۔

غذائیت کی کمی کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ لوگوں کے جسم پر پھوڑے پھنسیاں نکل آتی تھیں۔ چنانچہ لڑکیوں کے سر مونڈ دیئے گئے تھے۔ نیک دل خالاؤں نے گالینا کے لئے نقلی فلالین کی جیکٹ سی دی۔ بچپن میں اس کے لئے یہ بہت بڑا واقعہ تھا۔

''اب یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ وہ زمانہ کتنا مشکل تھا۔ خاص کر بعد از جنگ کے چند سال۔ ہر چیز تباہ و برباد کر دی گئی تھی۔ گاؤں کے گاؤں اور کنبے کے کنبے صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے گئے تھے۔ ہر طرف سے دھرتی اور اس کے باسیوں کی چیخیں سنائی دیتی تھیں ___ بھوک! بھوک! نوجوان مائیں، جو قبل از وقت بوڑھی ہو گئی تھیں، چند آلو چننے کے لئے کھیتوں کی ریگھاریوں پر چاروں ہاتھ پیر سے رینگا کرتی تھیں، وہ ہلوں میں اپنے آپ کو جوتتی تھیں ___ اور یہ سب اس لئے کہ ہم بچے زندہ رہ سکیں... اس وقت میری عمر سات سال کی تھی۔ میں ان باتوں کو کبھی نہیں بھولوں گی ___ بھوری زمین، سیاہ جنگل اور میرے کٹے ہوئے بال جو آگ میں جلائے گئے تھے۔

ایک مرتبہ گالینا سے سوال کیا گیا: ''تمہیں کن خوبیوں کی وجہ سے پارلیمنٹ میں چنا گیا؟''
ایسے موقع پر حسب معمول لوگوں کا جواب انکساری سے کندھے اچکا کر یہ ہوتا ہے: ''میرا خیال ہے کہ لوگ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔''

لیکن گالینا یہ کہتی ہیں:

''جی ہاں، مجھے معلوم ہے۔ میرے کام کی بدولت۔ جو لوگ کام کرنا جانتے ہیں عوام ان کی عزت اور قدر کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میں اس عزت کے لائق تھی۔''

یہ 20 جون 1955ء کا واقعہ ہے جب گالینا نے آٹھویں کلاس پاس کر کے ایک فارم پر کام کرنا شروع کیا تھا۔ اس تاریخ کو وہ کبھی نہیں بھولیں گی۔

ان کی ملازمت کی کتاب میں پہلا اندراج یہ تھا: ''مددگار مزدور۔'' ابتدا میں انہیں مددگار کے طور پر ایک گروپ میں شامل کر دیا گیا جس میں چار عورتیں سوروں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہر وقت انہیں ''طلب'' کیا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑتی رہتی تھیں۔ گالینا ایسی کارکن نہیں تھیں جن سے کام کرایا جائے۔ وہ گرمیوں کے کیمپ میں پھرکی کی طرح ادھر ادھر کے چکر لگاتی رہتیں، لمبے بوٹ ان کی پتلی پتلی ٹانگوں میں پھٹ پھٹ کرتے رہتے تھے۔ مددگار مزدور ایک شاگرد سا ہوتا ہے۔ ان کی استانی ایک مہربان دل خاتون زینا اگنا تینکو تھیں جو آج بھی فارم میں کام کرتی ہیں۔ وہ ایک اچھی استانی بھی تھیں اور اچھی سہیلی بھی۔ انہوں نے اس لڑکی کی بڑی مدد کی اور ہمت بڑھائی جس نے ابھی ابھی کام کرنا شروع کیا تھا۔

گالینا نے دوسری منزل میں قدم رکھا۔ ایک موسم سرما میں ان کی شاگرد کی حیثیت ختم ہو گئی۔ اب وہ خود سوروں کے ایک گلے کی نگراں تھیں۔ ابتدا میں گلے کی تعداد تین سو تھی جو بعد میں بڑھ کر پانچ سو، پھر سات سو اور اس سے بھی زیادہ ہو گئی۔

''رات کو جب میں گھر آتی اور کھانا کھانے بیٹھتی تو چمچہ میرے ہاتھ میں کانپنے لگتا تھا۔ میں اتنی تھک جاتی تھی۔''

''اگر واقعی کوئی لفظ ''کام'' کا مطلب سمجھنا چاہتا ہے تو اسے پو پھٹنے سے پہلے اٹھنا چاہئے اور ستاروں کے ساتھ ساتھ گھر لوٹنا چاہئے۔ یہ اسکولوں اور کتابوں سے نہیں بلکہ زندگی کے تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ کام کی جانب تمہارا کیا رویہ ہے۔ بعض لوگ

جب لفظ ''فارم'' سنتے ہیں تو ان کے ذہن میں صرف کیچڑ اور گندگی کی تصویر ہی ابھرتی ہے۔ دوسرے لوگ اس روسی کہاوت کا حوالہ دیتے ہیں: 'سور کو تارے نظر نہیں آتے'۔ غالباً سور کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ تارے دیکھ سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن ہم انسانوں کے لئے لازمی ہے کہ تارے دیکھیں، ان تک پہنچنے کی سعی کریں۔ اسی سوال پر ژینیا ژابروفسکایا سے میرا سخت جھگڑا ہوا، جو میری سب سے پیاری سہیلی تھی۔''

ژینیا بھی فارم پر کام کرتی تھی۔ تمام دن سخت محنت کرنے کے باوجود دونوں لڑکیاں کنسرٹ کی مشقوں میں حصہ لیتیں یا اپنی پوری آواز سے گیت گاتی ہوئی گاؤں میں گھومتی تھیں۔ انہیں ساتھ کام کرتے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ گالینا نے ایک نئی بات محسوس کی: فارم کے کام اور دیہاتی زندگی سے ژینیا کی شکائتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔

''یہاں رکھا کیا ہے؟'' ایک روز وہ گالیا سے کہہ ہی بیٹھی۔ ''کیا ہمیں زیادہ دلچسپ زندگی گزارنے کا حق نہیں ہے؟''

ژینیا کا باپ جو پنچایتی فارم میں بڑھئی تھا وہ بھی یہی کہا کرتا تھا: ''کیا اسے زندگی کہتے ہیں ــ ہمیشہ غلاظت میں بطخ کی طرح سپڑ سپڑ کر کے چلتے رہنا۔'' اس نے اپنی بیٹی کے شہر جانے اور بہتر زندگی تلاش کرنے کی حمایت کی۔ ژینیا نے شہر کراسنودار کی راہ لی۔ ایک سال گزر گیا، دو سال گزر گئے۔ پھر وہ چھٹیاں گزارنے گاؤں آئی۔ اس کی وضع قطع دیکھ کر اور جس شان سے اس نے اپنے خاوند کا تعارف کرایا گاؤں والوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس کا لباس اس کے سرو قد اور نازک بدن پر واقعی خوب پھب رہا تھا۔ پھر سب نے اس کے خاوند کو بھی پسند کیا: وہ نیک دل اور اچھا آدمی نظر آتا تھا۔ لیکن ژینیا کے لئے زیادہ دلچسپ چیز گالیا کا ردعمل معلوم کرنا تھا۔ کیا وہ دل ہی دل میں جل رہی ہے؟ ایسا بالکل نہیں تھا۔ گالینا نے اس سے صرف یہ کہا:

''ہوشیاری سے کام لو۔ اپنی زندگی کو یوں ضائع مت کرو۔''

''کیا تم اب بھی فارم پر کام کرتی ہو؟'' ژینیا نے پوچھا۔

''ہاں، سوروں کا پالن پوسن کرتی ہوں۔ اور تھوڑے ہی دن ہوئے نوجوان کمیونسٹ لیگ کی ضلعی کمیٹی کی ممبر چنی گئی ہوں۔''

''واقعی؟'' بڑی بے نیازی کے انداز میں ژینیا نے کہا۔ پھر اسے ''بے چاری'' گالینا پر رحم

آ گیا اور بولی:

''چلو، میں تمہیں یہاں سے شہر لے جانے میں مدد دوں گی۔ کیا اپنی تمام زندگی سوروں کے ساتھ گزار دو گی؟''

لیکن دلچسپ زندگی ہے کیا؟ ہر چیز اضافی ہوتی ہے۔ اگر کسی کو ایک چیز پسند ہے تو وہی دوسروں کے لئے سخت بور بھی ہو سکتی ہے۔ بعض لوگ پہلے دنیا کے چاروں کونوں کی خاک چھانتے ہیں اور پھر مطلوب چیز حاصل کرتے ہیں، دوسروں کو اپنے سامنے ہی وہ سب کچھ مل جاتا ہے جس کی انہیں ضرورت ہوتی ہے۔ اور گالینا کے لئے یہ تھی زمین۔ وہ سوچا کرتی:

''یہ دھرتی ہماری ہے اور اس پر جو کچھ ہے وہ بھی ہمارا ہے۔ اگر ہم کہیں اور چلے جائیں تو دھرتی کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ معلوم ہے ''پولوتا'' ریاستی فارم کتنا بدل گیا ہے؟ نئی نئی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں، نئی نئی مشینیں آئی ہیں۔ اور اب بھی آسمان کے پس منظر میں دیو ہیکل نیلا جنگل ابھرتا ہے، ریتیلے ٹیلے دور دور تک پھیلتے جاتے ہیں، سبز درختوں کی پھننگیں ناچتی رہتی ہیں۔ یہ سب میری دھرتی ہے اور اسی سے میری قسمت وابستہ ہے۔''

جب سورج ڈھل جاتا اور نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنا دن بھر کا کام ختم کر لیتے تو وہ فارم کے کلب کی طرف روانہ ہوتے تھے۔ ''پولوتا'' ریاستی فارم میں نوجوان کمیونسٹ لیگ کی ایک بڑی اور سرگرم تنظیم تھی۔ اس کے دو سو سے زیادہ رکن تھے۔ گالینا اس کی کمیٹی کی ممبر تھیں۔ دن میں کام سے گالینا خواہ کتنی ہی شل کیوں نہ ہو جاتیں وہ برابر کلب آتیں اور نوجوانوں کے ساتھ شامیں گزارتی تھیں۔ وہ زندہ دل گیت گاتیں اور ایک قسم کا بیلوروسی پولکا ناچ ''لیا وونیٹا'' ناچتی تھیں جس کے متعلق مذاقاً کہا جاتا ہے کہ اس میں ''سو چکر بائیں جانب اور سو ہی دائیں جانب ہوتے ہیں۔'' انہیں ''کروژاچوک'' بھی رقص کرنا آتا تھا جو کام سے تھکے ہوئے ہاتھوں کی پُر شور تالیوں کے تال پر ناچا جاتا تھا۔ ناچ گالینا کا محبوب مشغلہ تھا۔ لیکن سب سے زیادہ تیز اور حسین ''کروژاچوک'' انہوں نے اپنی شادی کے دن اس نوجوان کے ساتھ ناچا جس سے وہ محبت کرتی تھیں اور جس کے لئے انہوں نے بڑا انتظار کیا تھا۔ بوریس کھدائی کی مشین چلاتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک دلدل زرخیز قطع میں بدل دی تھی۔ وہ ایک مضبوط اور کشادہ شانوں والا نوجوان تھا اور انتہائی پُرسکون مزاج کا مالک۔

دونوں شاموں کو ملتے جب دھند لکے کے بعد تارے جھلکنے لگتے اور فارم پر چاند کی مہتابیں چھوٹنے لگتی تھیں۔

بورلیس لازمی فوجی ملازمت پر چلا گیا، بیلوروس سے بہت دور۔ اب مقامی ڈاکیہ پابندی سے ایسے لفافے لانے لگا جن پر تکونے فوجی ڈاک ٹکٹ لگے ہوتے تھے۔ ہر خط میں ایک ہی سوال کیا جاتا تھا: ''کیا تم انتظار کررہی ہو؟''۔ اور جواب بھی یہی ہوتا: ''ہاں، میں انتظار کررہی ہوں۔''

خطوں میں گالینا اپنی ذات سے زیادہ اپنے کام کے متعلق لکھا کرتی تھیں۔ ''مجھے ریپبلک نوجوان کمیونسٹ لیگ کی مرکزی کمیٹی کا ممبر چن لیا گیا ہے۔'' ''میں پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے امیدوار نامزد کی گئی ہوں۔'' ''اجلاس میں شرکت کے لئے منسک گئی تھی اور وہاں مجھے ریپبلک کی پارلیمنٹ کا نائب صدر چنا گیا۔''

بورلیس خط پڑھ کر کبھی متفکر ہو جاتا اور سوچتا: اس کی منگیتر کہیں بدل تو نہیں گئی؟ شہرت نے اس کا دماغ خراب تو نہیں کردیا؟

پر گالینا اس معاملے میں بالکل نہیں بدلی تھی۔

فوجی ملازمت ختم کرنے کے بعد بورلیس گھر لوٹا۔ اب پھر وہ کھودنے کی مشین چلانے لگا اور دلدلیں سکھا کر انہیں زرخیز قطعوں میں بدلنے لگا۔ اور اب پھر یہ دونوں شام کی خاموشیوں میں ملا کرتے اور اس زمین پر سیر گشت کرتے جہاں ان کی محنت صرف ہوئی تھی۔

گالینا اب بھی سوروں کا پالن پوسن کیا کرتی تھیں۔ ان کا مقولہ تھا: ''میں دکھاوے کے لئے کام نہیں کرتی بلکہ اس میں پوری طرح اپنا تن من لگا دیتی ہوں۔'' تخلیقی کام کا راز یہی ہے کہ اس میں آدمی دل و جان سے جٹ جاتا ہے۔

اس کا اندازہ عالمی ٹریڈ یونین فیڈریشن کے خبرنامے ''لا پریس سنڈیکال'' کے پیش کئے ہوئے اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے:

سماجی زندگی میں عورتوں کا حصہ

سوویت یونین

13 انجینئروں میں ایک انجینئر عورت ہے۔
5 ڈاکٹروں میں ایک ڈاکٹر عورت ہے۔
3 پارلیمنٹ کے ممبروں میں ایک ممبر عورت ہے۔

امریکہ

100 انجینئروں میں ایک انجینئر عورت ہے۔
14 ڈاکٹروں میں ایک ڈاکٹر عورت ہے۔
37 پارلیمنٹ کے ممبروں میں ایک ممبر عورت ہے۔

فرانس

20 انجینئروں میں ایک انجینئر عورت ہے۔
10 ڈاکٹروں میں ایک ڈاکٹر عورت ہے۔
60 پارلیمنٹ کے ممبروں میں ایک ممبر عورت ہے۔

گالینا سوروں کے ایک بڑے گلے کی نگراں تھیں۔ پارلیمنٹ کے اجلاس کے بعد وہ اپنے گاؤں واپس آتیں اور نازک اونچی ایڑی کے جوتے اتار کر ربر کے لمبے بوٹ پہن لیتی تھیں... جب گالینا پہلی بار چند روز کے لئے کسی کام پر باہر جانے لگیں تو ان کی قائم مقام نے گڑگڑا کر مزید امداد مانگی: ''مجھ اکیلی سے یہ کام بالکل نہیں سنبھلے گا۔ مجھے ایک اور آدمی دو۔'' تب پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ گالینا دو آدمیوں کے برابر کام کرتی ہیں۔

''میں نہیں جانتی تھی کہ مجھے ریپبلک کی پارلیمنٹ کا امیدوار نامزد کیا جا رہا ہے۔ میں مویشیوں کے علاج کے اسکول کا امتحان دینے کے لئے بیگوسوف آئی ہوئی تھی۔ وہاں مجھے تار ملا۔ اس میں لکھا تھا کہ میرے ساتھ کام کرنے والے درخواست کرتے ہیں کہ میں پولوتسک انتخابی حلقے سے امیدوار کھڑی ہوں۔ اس وقت میری عمر 24 سال کی تھی۔''

گالینا کو ووٹروں سے اپنی پہلی ملاقات ابھی تک یاد ہے۔ وہ ایک ایسے گاؤں میں ہوئی تھی

جہاں مشکل سے کوئی انہیں جانتا تھا۔ ان کا تعارف کرنے کے لئے ایک خاتون انستاسیا شومیلووا مقرر کی گئیں جو ریاستی فارم میں مویشیوں کی ماہر تھیں۔ جب یہ دونوں ووٹروں کے پاس آئیں تو نہ جانے کیوں سب ہی نے سوچا کہ امیدوار یہ شرمیلی لڑکی نہیں جو اسکول کے ڈیسک پر زیادہ بے تکلف دکھائی دے سکتی ہے، بلکہ سنجیدہ اور قابل اعتماد نظر آنے والی انستاسیا ہیں۔ جب گالینا اپنی تقریر ختم کر چکیں تو لوگ ان کے آس پاس جمع ہو گئے اور سوالوں کی بوچھار کر ڈالی۔ آخر میں انہیں متفقہ طور پر امیدوار نامزد کر لیا گیا۔ لوگوں نے دیکھ لیا کہ وہ مستعد اور معاملہ فہم ہیں۔

ابھی کچھ دن ہوئے بیلوروس کی نوجوان کمیونسٹ لیگ کی مرکزی کمیٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے گالینا نے لیگ کی کئی شاخوں سے خطاب کیا۔ ہر جگہ انہوں نے بتایا کہ بیلوروس کے نوجوانوں کی زندگی میں کیا کیا نئی تبدیلیاں ہوئی ہیں، وہ کن کن نئی تعمیرات میں حصہ لے رہے ہیں اور کس طرح وہ زمین سدھارنے میں مشغول ہیں۔ انہوں نے اپنے وطن کی عظمت کے ساتھ وفاداری کی بیلوروسی نوجوانوں کی روایتوں کا ذکر کیا۔ اور ظاہر ہے ریپبلک کے ان اہم مسائل پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی جن کے حل میں وہ پارلیمنٹ کے ممبر کی حیثیت سے ذاتی طور سے حصہ لیتی ہیں۔

یوں کہنا چاہئے کہ گالینا نوجوان کمیونسٹ لیگ کی ''شاگرد'' ہیں۔ اور لیگ کے ممبر انہیں پارلیمنٹ میں اپنا ہی نمائندہ تصور کرتے ہیں۔ گالینا لوگونووا کے بارے میں اور بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ابھی ابھی انہیں نیا کام ملا ہے ــــ ''پولوتسکئی'' ریاستی فارم کی ڈائرکٹری۔ یہ کمیونسٹ تعمیرات میں ان کی ایک اور دین ہوگی۔

ان سے آخری سوال کیا گیا: ''گالینا، تمہاری سب سے عزیز تمنا کیا ہے؟''

''انقلاب کے وقت اور خانہ جنگی کے زمانے میں عوام نے ان لوگوں کو اقتدار سونپا تھا جنہوں نے انتہائی بہادری اور ثابت قدمی دکھا کر کمیونزم کے نصب العین سے اپنی وفاداری ثابت کی تھی۔ چنانچہ برگیڈ کے کمانڈر عوامی کمیسار بنے، بودینی کے گھوڑ سواروں کو پنچائتی فارموں کی صدارت ملی اور سرخ سپہ سالار سفیروں کی کرسی پر رونق افروز ہوئے۔ اور وہ سب کے سب بڑے فخر کے ساتھ اپنے آپ کو 'محنت کشوں کے فرزند' کہا کرتے تھے۔ میری تمنا ہے کہ میں بھی ان جیسی بنوں۔''

از: لیف کورنیشوف

بیسویں صدی کا پیشہ

جب سائنس دانوں نے ایٹمی مسلسل ردعمل دریافت کیا تو اس سے مدتوں پہلے اچھے کاموں کا مسلسل ردعمل موجود تھا۔ حالانکہ دونوں کے نام مختلف ہیں لیکن اصول یکساں ہے: اچھے انسان سے ایک قسم کی برقی لہر نکلتی ہے جو دوسروں کو متاثر کرتی ہے اور انہیں بھی نیک بناتی ہے۔ لاری ڈرائیور میخائیل پری ستاوکا، اشترا کی محنت کے ہیرو ایک ایسے ہی انسان ہیں جن سے ہمیشہ ایسی ہی لہریں پھوٹتی رہتی ہیں۔

ان کے حلیے سے بالکل پتہ نہیں چلتا کہ وہ ہیرو ہو سکتے ہیں۔ وہ چھوٹے سے قد کے شرمیلے آدمی ہیں۔ مگر جب وہ لاری چلانے بیٹھتے ہیں تو خود اعتمادی کا نمونہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنا اعزازی تمغہ پہننے سے اس لئے شرماتے ہیں کہ لوگ متوجہ ہوں گے اور انہیں گھور گھور کر دیکھیں گے۔ لیکن وہ لوگوں کی نظروں میں رہتے ہیں۔ لوگ انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ کتنا اچھا کام کرتے ہیں اور کتنی معقول زندگی گزارتے ہیں۔

35 سال ہوئے جب گاوریلا پری ستاوکا نے اپنے چھوٹے بھائی میخائیل کو، جو لازمی فوجی ملازمت ختم کرنے کے بعد لوٹے تھے، مشورہ دیا تھا:

''ڈرائیور بنو۔ یہ قابل عزت پیشہ ہے، بیسویں صدی کا پیشہ۔ یہ دلچسپ ہے اور آدمی کو سرگرم رکھتا ہے۔''

افسوس ہے کہ گاوریلا کو وہ دن دیکھنا نصیب نہیں ہوئے جب ان کے چھوٹے بھائی نے اس پیشے کو چار چاند لگائے۔ چھ سال بعد گاوریلا پری ستاوکا جو وطن کی جنگ عظیم شروع ہوتے ہی آبدوز جہاز پر ملاح کی حیثیت سے بھرتی کئے گئے تھے اپنے ملک کی مدافعت کرتے ہوئے کام آئے۔

6 مہینے کی ٹریننگ حاصل کر کے میخائیل ٹپ اپ لاری چلانے لگے۔ یہ زمانہ یاد کر کے اب وہ ہنستے ہیں کہ انہیں اپنے طاقتور ''گھوڑے'' پر کتنا فخر تھا حالانکہ وہ بہت معمولی لاری تھا! اہم بات بہرحال یہ تھی کہ انہوں نے زندگی بھر کے لئے لاری ڈرائیوری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔

میخائیل نے اپنے کام کی ابتدا کرو پوتکنسکایا بند سے کی جہاں ماسکو دریا کے کناروں کو ہموار کیا جا رہا تھا۔ یہاں ڈرائیوروں کا کام نہ صرف محنت طلب تھا بلکہ اس کے لئے مہارت اور صحت کی بھی ضرورت تھی۔ لاریاں اوپر تک ملبے سے بھری ہوئی ہوتیں اور انہیں عین دریا کے کنارے لے جا کر ملبے کو پانی میں گرانا پڑتا تھا۔ میخائیل بھی دوسرے ڈرائیوروں کی طرح پھرتی اور قابلیت سے

کام کرنا چاہتے تھے لیکن یہ بھول گئے تھے کہ ان کا تجربہ صفر کے برابر ہے۔ چنانچہ دس دن کے بعد معلوم ہوا کہ نوجوان ڈرائیور اتنا پیٹرول پھونک چکا ہے جو دولاریوں کے لئے کافی ہوتا۔

آج تک میخائیل کو ان تجربے کار ڈرائیور کا نام یاد ہے جو بغیر پوچھے خود ہی گھنٹوں تک ان کے انجن کو دیکھتے رہے، آگ پکڑنے والے پرزے کو ٹھیک کیا اور نئے ڈرائیور کی غلطی بتائی۔ یہ تھے الکسئی سوروچکا۔

میخائیل بڑے فخر سے کہتے ہیں: ''میں خوش قسمت ہوں کہ اپنی زندگی میں مجھے ہمیشہ نیک دل لوگ ملے، حالات چاہے اچھے ہوں یا برے۔ خاص طور پر مشکلات کے وقت وہ بہت کام آئے۔''

لیکن یہ قسمت کی بات نہیں تھی کہ میخائیل کو ایسے لوگ ملتے رہے۔ اس کا انحصار بڑی حد تک خود اپنے اوپر ہوتا ہے۔ میخائیل پری ستاوکا ایک ایسے انسان ہیں جو اپنی پہل پر دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔ مسلسل ردعمل کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کو اپنے سے بہتر خیال کرتے ہیں اور ان جیسے بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ جب دن بھر کا کام ختم کر کے وہ اپنی لاری ڈپو میں لا رہے تھے تو لاؤڈ اسپیکر پر اپنا نام سنا۔ اعلان کرنے والا کہہ رہا تھا کہ اس دن سب سے اچھا کام الکسئی وروخوپکا اور میخائیل پری ستاوکا نے کیا ہے۔

جلد ہی دونوں میں گہری دوستی ہوگئی۔ اور وہ آپس میں مقابلہ کرنے لگے کہ کون دن میں سب سے کم پیٹرول صرف کر کے سب سے زیادہ فاصلہ طے کرتا ہے۔ اس پر ان میں خوب بحثیں بھی ہوتی تھیں۔ لفظ ''مقابلے'' سے غلط فہمی نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ مقابلے نے ان کے درمیان فاصلہ نہیں بڑھایا بلکہ مشترکہ کوششوں کی بدولت وہ ایک دوسرے کے قریب آئے۔ ان کے نزدیک مقابلے کا مطلب تھا دوستی اور باہمی امداد۔ اور یہ امداد نہ صرف قریبی دوستوں کو بلکہ سب ساتھ کام کرنے والوں کو دی جاتی تھی۔ یہ بات قابل تعریف و ستائش ہے کہ 25 برس پہلے دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے دوران میخائیل جن اصولوں پر کاربند تھے آج بھی وہ ان پر عمل پیرا ہیں۔

ماسکو کے بالکل ایک سرے پر رہائشی عمارتوں کے بلاک نمبر 38-37 تھے۔ اگر صحیح کہا جائے تو یہ عمارتیں تعمیر نہیں ہوئی تھیں بلکہ ابھی ان کے نقشے صرف ڈرائنگ بورڈ پر نظر آتے تھے۔

جہاں شاہراہ لینن ختم ہوتی ہے وہاں فقط آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لاریوں اور ٹرکوں کی لمبی قطار ہی نظر آتی تھی۔

جائے تعمیر پر سب سے پہلے نہ عمارت کی بنیاد تعمیر کرنے کی ضرورت تھی اور نہ زمین کھودنے کی مشینوں اور کرین کی۔ کرین جو کئی ٹن وزنی کنکریٹ کی سلیں کھلونے کی طرح ہوا میں اٹھا لیتی ہیں خاص لاریوں کے ذریعے وہاں لائی جاتی تھیں۔

اب تو رہائشی عمارتوں کے بلاک نمبر 38-37 کافی مشہور ہو چکے ہیں۔ سوویت یونین میں اور بیرونی تکنیکی رسالوں میں بھی ان پر بے شمار مضمون شائع ہوئے ہیں۔ اور جدید تعمیری تجربے کی بہترین مثال کے طور پر انہیں نصابی کتابوں میں شامل کیا گیا ہے۔

تعمیر کے سارے کام کی ابتدا اندرونی سڑکوں سے ہوئی۔ اس وقت جب کوئی بھی عمارت کھڑی نہیں ہوئی تھی پہلے مختلف سمتوں میں سڑکیں اور روشیں بنائی گئیں۔ اسفالٹ کی ان پٹیوں سے پتہ چلتا تھا کہ مستقبل میں رہائشی مکان کس کس جگہ ہوں گے۔ نیو ڈالنے سے پہلے لاریاں لوہے کی سلاخوں اور کنکریٹ کے بنے ہوئے بڑے بڑے ستون لاتی رہیں۔ ان ہی سے عمارتوں کی بنیاد ڈالی گئی۔

پہلی عمارت کی بنیاد ڈالنے کے بعد لاریوں اور ٹرکوں کے آنے جانے کا سلسلہ بندھ گیا۔ غور سے مشاہدہ کرنے والا دیکھ سکتا تھا کہ ان کی آمد و رفت میں ایک خاص موزونیت ہے۔ فلیٹوں کی ان پندرہ عمارتوں کی تعمیر میں چار مہینے صرف ہوئے۔ اس تمام عرصے میں تعمیر کے ٹائم ٹیبل میں ایک دفعہ بھی گڑبڑ نہیں ہوئی جو عام طور پر ہر ایسی جائے تعمیر پر ہوتی ہے، جہاں کام تنظیم کے تحت کیا جاتا ہے۔ یہاں لاریاں بالکل ٹھیک وقت پر پہنچتی تھیں۔ ان کی رفتار نہ تیز ہوتی تھی اور نہ سست۔

انجینئروں نے تعمیری کام شروع کرنے سے بہت پہلے ہر لاری کے لئے تفصیلی نقشہ اوقات تیار کر لیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عمارت کے ہر حصے کو جائے تعمیر پر بالکل صحیح وقت پر پہنچنا چاہئے۔ مثلاً ٹھیک آٹھ بجے لاریاں فاصلی دیواریں لاتی تھیں، تین منٹ کے بعد تیار کھڑکیاں اور پھر ایک منٹ بعد فرش کے لئے کنکریٹ کی سلیں۔ ایک بڑے شہر میں اور خاص کر ایک وسیع و عریض ملک کے دارالخلافے میں منٹ اور سکنڈ کے حساب سے کام کرنا تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ یہ ڈرائیوروں اور انجینئروں دونوں کے لئے مشکل تھا۔ معماروں کے لئے پابندی اوقات کی بے حد

اہمیت تھی۔ اس کے بغیر عمارت کھڑی کرنے کے لئے اس کے بے شمار حصوں کو بلاخلل اور باقاعدہ جوڑنا ان کے بس سے باہر تھا۔

کارخانے جو عمارتوں کے لئے آہن بستہ کنکریٹ کے حصے تیار کرتے ہیں تمام ماسکو میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لاریاں تیرہ میل سے فرش کے لئے سلیں، چھ میل سے نیو کے لئے ستون اور دس میل سے بلاک لایا کرتی تھیں۔ انہیں گہما گہمی والے ماسکو شہر کی سڑکوں کے جال سے گزرنا پڑتا اور ٹریفک کی درجنوں روشنیوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ عام ٹیلی فون عملاً استعمال کے لئے بے سود تھے۔ چنانچہ اپنا الگ ریڈیو اسٹیشن نصب کیا گیا، جس کا اشاریہ نام تھا ''کھڑی چٹان''۔ جائے تعمیر سے ریڈیو آپریٹر عمارت کے حصے بنانے والے مختلف کارخانوں سے مخاطب ہوتا تھا:

''40 منٹ میں ہمیں بلاک چاہئے اور ایک گھنٹے میں زینہ۔'' اور کارخانے سے جواب ملتا:

''بلاک روانہ کر دیئے گئے ہیں۔ زینہ پندرہ منٹ میں لاریوں پر لاد دیا جائے گا۔''

یہ ایک ایسی غیر معمولی اور انتہائی منظم جائے تعمیر تھی جہاں ہنگاموں اور شور و شغب کا نشان تک نہیں تھا، اور نہ آس پاس تعمیری سامان کے ڈپو تھے۔

اسے بہت زمانہ نہیں گزرا جب کوئی نگراں تعمیر کا منصوبہ پورا کرنے میں دیر کرتا تھا تو اسے اس قسم کا لیکچر پلایا جاتا تھا:

''کفایت شعار آدمی کیسے کام کرتا ہے؟ پہلے وہ لکڑی اور شیشے کے آخری تختوں سمیت تمام تعمیری سامان اکٹھا کرتا ہے۔ پھر فورمینوں اور مزدوروں کو بلاتا ہے۔ اس طرح دو برس سامان جمع کرنے میں اور ایک برس اصل تعمیر میں صرف ہوتے ہیں۔''

اس جائے تعمیر پر نہ ہی سامان تھا اور نہ کسی قسم کے ڈپو اور گودام۔ اگر کوئی فورمین عمارت کے حصے جمع کرنے کی کوشش کرتا تو اس کی خوب خبر لی جاتی تھی۔ سامان کے ڈپو بس ''پہیوں'' پر ہوتے تھے۔ اور یہ پہیے عین اس لمحے عمارت کے وہ حصے اس جگہ پہنچا دیتے تھے جہاں ان کی معماروں کو ضرورت ہوتی تھی۔ یہ جادو کا کھیل سا معلوم ہوتا تھا۔ جائے تعمیر صاف ستھری نظر آتی تھی۔ مزدوروں کو کام کرتے وقت راستوں میں رکاوٹیں نہیں ملتی تھیں۔ تعمیر کے اس طریقے سے پیسے کی بھی بہت بچت ہوتی تھی۔ یہاں اس کی ضرورت نہیں تھی کہ پہلے کرین لاری سے سامان اٹھائیں اور پھر ایک گھنٹے اور بعض وقت ایک ہفتے کے بعد اسے ضروری جگہ پر منتقل کیا جائے۔ پختہ سڑکوں کو

دعائیں دیجیے کہ ڈرائیور اپنی لاری کو ٹھیک اس مقام پر لے آتا جہاں سے کرین چلانے والا سہولت کے ساتھ سامان اٹھا کر منتظر معماروں کے حوالے کر دیا کرتا تھا۔ اس طرح لاری سے براہ راست عمارتوں کے حصے اٹھائے جاتے تھے۔

یہی وہ جائے تعمیر تھی جہاں لوگوں نے لاری ڈرائیوروں کے اہم رول کا پوری طرح اندازہ لگایا۔ اور اسی جگہ لاری ڈرائیوروں نے پہلی بار معماروں کو بڑے بڑے رہائشی مکان بنانے میں براہ راست مدد دی۔

عام طور پر سنیچر کو کام کا دن چھوٹا ہوتا ہے۔ ایک سنیچر کو میخائیل کو اچھا موقع مل گیا۔ ان کے کام کا پلان ایسا تھا کہ وہ تین بجے کام سے فارغ ہو جائیں۔ پھر وہ خاندان سمیت جنگل کی سیر کر سکتے تھے۔

انہوں نے آخری بار کنکریٹ کے بلاک پہنچا دیئے۔ معمار انہیں ٹھیک جگہ پیوست کرنے لگے۔ میخائیل نے شہر کا رخ کیا تا کہ لاری کو ڈپو میں کھڑی کریں اور منہ ہاتھ دھو کر گھر روانہ ہوں۔

لیکن آدھے گھنٹے کے بعد وہ پھر جائے تعمیر پر موجود تھے۔ اس بار ان کے ساتھ دوسرا سامان تھا۔

ہوا یہ کہ شاہراہ لینن اور شاہراہ لومونوسوف کے چوراہے پر ان کی نظر ایک لاری پر پڑی جو بے بسی کے عالم میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ٹریلر پر بھاری ستون لدے ہوئے تھے اور ڈرائیور مایوسی سے انجن کو بار بار دیکھ رہا تھا۔

میخائیل نے پہلے ہی موڑ پر اپنی لاری روک دی اور باہر نکل کر پوچھا:

''کیا گاڑی کے چلنے میں بہت دیر لگے گی؟''

ڈرائیور نے چڑچڑاہٹ سے جواب دیا: ''خدا ہی بہتر جانتا ہے۔''

میخائیل پری ستاوکا نے فوراً سوال کیا: ''کیا 37 ویں بلاک جا رہے ہو؟'' اور جواب سن کر کہا:

''اچھا تو اپنے ٹریلر کو الگ کر دو۔ اسے میں اپنی لاری سے باندھ کر لے جاؤں گا۔''

میخائیل اس ڈرائیور کا نام تک نہیں جانتے تھے اور نہ ہی انہوں نے اس کی صورت اچھی طرح دیکھی تھی۔ لیکن وہ اس کی اور جائے تعمیر کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

جب وہ جائے تعمیر پہنچے اور فورمین نے غیر معمولی لاری دیکھی تو وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ اور

میخائیل کے پاس آ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگا:

''تم نے ہمیں بچالیا! مزدوروں نے ابھی ابھی آخری ستون نصب کیا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب سارا کام ٹھپ ہو گیا۔ فیکٹری کو فون کیا۔ پھر فیصلہ کیا کہ خود جاؤں اور دیکھوں کیا معاملہ ہے۔ لاری کہاں پھنس گئی ہے؟''

میخائیل اس واقعے کو بالکل بھول گئے۔ لیکن فورمین نے اسے یاد رکھا اور اچھے کام کا اچھا ہی صلہ دیا۔

تب گرمی کا موسم تھا اور اب سردیوں کا۔ فروری میں دو دن تک برف کا شدید طوفان جاری رہا۔ لاریوں کے لئے ایسا خراب موسم اور بھی مصیبت بن جاتا ہے جب ان پر لمبی اور بھاری چیزیں لدی ہوئی ہوں۔ میخائیل پری ستاوکا شاہراہ چیلکوفسکی سے گزر رہے تھے کہ انہیں اپنی لاری کھڑی کرنی پڑی۔ ان کے سامنے تقریباً دو درجن لاریاں برف میں پھنسی ہوئی تھیں۔ آگے موڑ کے قریب برف اتنی زیادہ تھی کہ گاڑیاں ایک انچ بھی نہیں ہل سکتی تھیں۔ دس منٹ کے اندر اندر برف میں پھنسی ہوئی لاریوں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی۔ ڈرائیور تنگ آ کر سڑک پر جمع ہو گئے۔ گرتی ہوئی برف سے بچنے کے لئے وہ آگے کو جھک کر کھڑے ہو گئے اور چلا چلا کر بحث کرنے لگے کہ اس مصیبت کا ذمے دار کون ہے۔

میخائیل پری ستاوکا نے ایک لمحہ ضائع نہیں کیا اور قریب ہی ایک جائے تعمیر کی طرف لپکے جہاں روشنی کے مینار کی طرح ایک اونچے کرین کی چوٹی پر قمقمے چمک رہے تھے اور دور دور تک نظر آتے تھے۔ گہری برف میں دقت سے قدم بڑھاتے ہوئے وہ جائے تعمیر پر پہنچے اور بلڈوزر چلانے والے سے درخواست کی:

''بھائی، کیا تم ہماری مدد نہیں کرو گے؟ بس تھوڑا ہی وقت لگے گا۔ ہمیں دیر ہو گئی ہے اور جائے تعمیر پر ہمارا انتظار ہو رہا ہے۔ ہمیں وہاں فوراً آہن بستہ سلیں پہنچانا ہے۔''

بلڈوزر ڈرائیور جو ایسی بات سننے کے لئے بھی تیار نہیں تھا بولا:

''میرے پاس خود اپنا کام بہت زیادہ ہے۔ ذرا دیکھو یہاں کتنی برف اٹی پڑی ہے۔''

میخائیل نے دیکھا کہ ایک شخص ان کی جانب آ رہا ہے۔ فورمین کے علاوہ یہ اور کون ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کو آپ ایک ہی نظر میں بھانپ سکتے ہیں۔ یہ ہر موسم میں کام کرتے ہیں۔ جاڑوں

کے جھکڑ انہیں منجمد کر دیتے ہیں، گرمی کی دھوپ انہیں جھلس ڈالتی ہے اور تند ہوائیں ان کا رنگ سانولا کر دیتی ہیں۔ فوراً فیصلہ کرنے اور اپنے اوپر تمام ذمے داری لینے کے سبب ان میں خود اعتمادی اور عزم پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ آپ فورمین کی چال سے دیکھ سکتے ہیں۔

"کامریڈ فورمین!" میخائیل نے التجا کے انداز میں شروع کیا۔

جب ایک لاری ڈرائیور برف کے سخت طوفان میں بلڈوزر کے قریب کھڑا ہوا ملتجی نگاہوں سے دیکھ رہا ہو تو یہ قیاس کرنا مشکل نہیں ہے کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے اور کیا چاہتا ہے۔

فورمین نے میخائیل کو اچھی طرح دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی اور بات کاٹتے ہوئے کہا:

"یہ بالکل ناممکن ہے۔ ہمارے پاس اپنی ہی سڑک صاف رکھنے کے لئے کافی کام ہے۔"

میخائیل نے ہمت نہیں ہاری اور وہ فورمین کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ اور جب ان کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا تو بولے: "تمہارا رویہ غیر رفیقانہ ہے!"

فورمین ایک دم رک گیا اور مڑ کر تھمت تراشنے والے کو غور سے دیکھنے لگا۔ پھر یکایک اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

اس نے بلڈوزر ڈرائیور کو سر سے اشارہ کیا: "واسیلی چلاؤ اسے"۔ پھر میخائیل سے مخاطب ہوا: "واہ، تم مجھے بھول گئے؟ یاد ہے گرمیوں میں ہماری مڈبھیڑ ہوئی تھی 37 ویں بلاک پر۔ تم کسی دوسرے ڈرائیور کے آہن بستہ ستون لائے تھے۔ تم نے وقت پر ہمیں بچا لیا۔ اگر چند منٹ اور گزر جاتے تو ہمارے پورے پروگرام کا بیڑہ غرق ہو جاتا! ہم اپنا کام وقت پر ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے لیکن دیر ہوتی جا رہی تھی"...

سڑک صاف کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی بلڈوزر چلانے والا واسیلی اپنے کام میں ماہر تھا۔ اس نے یہ کام جلد ہی ختم کر لیا۔ اب لاریوں کی قطار پھر سڑک پر چل رہی تھی۔ میخائیل پری ستاد کا لاری چلانے کا پہیہ مضبوطی سے تھامے ہوئے سامنے دھندلی سڑک کو غور سے دیکھ رہے تھے اور اپنے خیال پر مسکراتے جاتے تھے: اگر لوگ ایک دوسرے کی مدد کریں تو مشکل راستہ بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اس مرتبہ پھر اچھے کاموں کے "مسلسل ردعمل" نے اپنا مظاہرہ کیا۔

انسان میں اس کی اپنی خصوصیات کس وقت پیدا ہوتی ہیں؟ آدمی پیدائش سے نہیں بلکہ اپنی عمر کی کسی منزل میں پہنچ کر سخی بن جاتا ہے یا کنجوس، سست یا محنت پسند۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ

تین برس کی عمر میں کردار ڈھل جاتا ہے۔اور ایک روسی کہاوت یہ ہے کہ کتنی ہی کھاد ڈالی جائے اور کتنا ہی پانی استعمال ہو، ناشپاتی کا درخت سیب کے درخت میں نہیں بدلتا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ زندگی ایک ایسی یونیورسٹی ہے جہاں تعلیم کبھی ختم نہیں ہوتی۔ وہ ایک سال کے بچے سے لے کر سو سال کے بوڑھے تک سب کو سکھاتی ہے۔ وہ آدمی بڑا ہی بدنصیب ہے جو زندگی سے سیکھنا نہیں چاہتا ــــ صرف الجبرا ہی نہیں بلکہ انسانی تعلقات کے بارے میں بھی، صرف ادب ہی نہیں بلکہ رفاقت کی شادمانیوں کے متعلق بھی۔

میخائیل پری ستاوکا نے جنگ سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ نوجوان جنہیں پچھلی جنگ کا علم بس عام کتابوں اور فلموں کے ذریعے سے ہوا ہے شاید یہ سن کر مایوس ہوں کہ جنگ کے پورے چار برسوں میں میخائیل پری ستاوکا نے ایک بار بھی گولی نہیں چلائی۔ لیکن اگر وہ ایسی کتابیں پڑھیں جو پچھلی جنگ میں موٹر ڈویژن کا رول بتاتی ہیں اور جنگ کے سخت ترین زمانے میں ان کی بہادری کو سراہتی ہیں تو یہی نوجوان پھر اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

جنگ کے وقت ڈرائیور پہلے لام بند کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ میخائیل پری ستاوکا بھی محاذ پر چلے گئے۔ انہیں بندوق ضرور ملی لیکن اس سے پہلے ایک ٹرک ان کے حوالے کر دی گئی۔ جنگ کے دوران یہ بندوق ہمیشہ ان کے ساتھ رہی۔ وہ اسے وقتاً فوقتاً صاف بھی کر لیا کرتے تھے لیکن اس کے استعمال کا کبھی موقع نہیں ملا۔ میخائیل فاشستوں کے خلاف دوسرے ہتھیار سے لڑے۔ یہ تھی ان کی ٹرک۔ اسے وہ چوڑی شاہراہیں ہوں یا ناقابل گزر جنگل، دن ہو یا رات، جھلسنے والی گرمی ہو یا سخت پالا، عقب کی خاموشی ہو یا محاذ کے نزدیک گولیوں کی تڑتڑاہٹ برابر چلاتے رہے۔

پوری جنگ کے دوران میں انہوں نے کتنے میل گاڑی چلائی، اس کا حساب لگانا مشکل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جنگ کے شروع میں وہ ماسکو سے روانہ ہوئے اور خاتمے پر برلن پہنچے تو اس سے یہ نہیں چلتا کہ اس درمیان میں وہ کہاں کہاں گھومے۔

ڈرائیوری کے تمام اسکولوں میں یہ اصول ضرور سکھایا جاتا ہے: ہمیشہ اپنی نظر سڑک پر رکھو۔ لیکن جنگ کے زمانے میں گاڑی چلاتے وقت ڈرائیور کو نہ صرف زمین بلکہ آسمان پر بھی نظر رکھنا پڑتی تھی اس لئے کہ خطرہ زیادہ تر سر کے اوپر منڈلاتا تھا۔

سوویت ڈرائیوروں نے جلد ہی فاشست ہوائی جہازوں کو جل دینا سیکھ لیا۔ وہ خوب جانتے

تھے کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے، ان کی رفتار معلوم کی جا رہی ہے اور بمباری کا نشانہ بنانے کے لئے لاریوں کی شست لی جا رہی ہے۔ لیکن بظاہر وہ بے تعلقی سے اسی رفتار پر گاڑی چلاتے رہتے تھے۔ لیکن جوں ہی انہیں جہاز سے سیاہ نقطہ نیچے اترتا ہوا دکھائی دیتا وہ فوراً بریک لگا دیتے تھے۔ چنانچہ بم ان سے آگے سڑک پر گر کر پھٹتا اور وہ بچ جاتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بم زمین پر گرنے سے عین پہلے ڈرائیور بڑی تیزی سے موڑ کر ٹرک سے خندق کے اوپر چھلانگ لگاتے تھے۔ ایسے داؤں پیچ کھیلنے کے لئے آدمی کو انتہائی ماہر اور پُرسکون ہونے کی ضرورت تھی۔

فوجی ڈرائیوروں کو کبھی آرام نصیب نہیں ہوا۔ لڑائیوں کے وقت وہ محاذ پر گولہ بارود پہنچانے میں مصروف رہتے۔ اور جب لڑائی رک جاتی تو فوج کو کھانے پینے کی چیزیں فراہم کرتے تھے۔ اور سڑکیں کبھی بھی محفوظ نہیں ہوتی تھیں۔

جب میخائیل پری ستاوکا عام لاری کے بجائے پیٹرول بردار ٹرک چلانے لگے تو یہ ان کے لئے بڑی تبدیلی تھی۔ جنگ کے زمانے میں روز بروز پیٹرول کی مانگ بڑھتی جا رہی تھی۔ تمام محاذوں پر زیادہ سے زیادہ ٹینک اور ہوائی جہاز بھیجے جا رہے تھے۔ ان سب کو ایندھن کی ضرورت تھی۔ میخائیل کی ٹرک مسلسل پیٹرول کے ذخیروں سے ہوائی اڈوں تک چکر لگایا کرتی تھی۔ اسے ان راستوں پر سے گزرنا پڑتا تھا جہاں دشمن کے ہوائی جہاز برابر بم برساتے رہتے تھے۔ ایک اور دشواری یہ تھی کہ لڑائیوں میں فتوحات کے ساتھ ساتھ محاذ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پیٹرول کی ٹرکیں اور زیادہ فاصلہ طے کریں۔

میخائیل پری ستاوکا نے برلن تک سفر کیا۔ لیکن وہاں وہ پیٹرول نہیں لائے۔ یکم مئی 1945ء کو جب ہارے ہوئے فاشست جرمنی کی راجدھانی میں ان کی لاری داخل ہوئی تو وہ کھانے پینے کی چیزوں سے لدی ہوئی تھی۔ اور یہ سب برلن کی بھوکی آبادی کے لئے تھا۔

ان کی گاڑی انجانی سڑکوں پر آہستہ آہستہ چل رہی تھی جہاں ہر چوراہے پر سوویت سپاہی ٹرافک کی نگرانی کر رہے تھے۔ چاروں طرف بمبار شدہ عمارتوں کے کھنڈرات سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ لوگ سڑکوں کے ملبے اور ٹوٹی پھوٹی اشیا سے صاف کرنے میں مصروف تھے۔

ڈرائیور میخائیل ہمیشہ اپنے آپ کو ایک معمار تصور کرتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک عمارت کھڑی کرنے میں سینکڑوں لوگوں کی محنت اور پسینہ صرف ہوتا ہے۔ انہوں نے پوری جنگ

گولہ بارود اور پیٹرول منتقل کرنے میں گزاری تھی تاکہ کرۂ ارض کو امن ملے اور اس پر پُر امن تعمیر شروع ہو۔ جنگ نے انہیں امن کی بھرپور قیمت بتائی تھی۔ جنگ ہی نے انہیں خطروں سے آزاد سڑک کے صحیح معنی سمجھائے تھے جس پر وہ گامزن ہو کر پھر پُر امن کام کی خوشی سے سرشار ہوں گے۔ یہ سوچ سوچ کر ان کا دل جذبات سے لبریز ہو رہا تھا اور وہ چلانا چاہتے تھے: اب ہر طرف دنیا میں تعمیر ہی تعمیر کا شور سنائی دے!

اب ان کے سامنے جو راستہ تھا وہ انہیں گھر کی جانب لے جاتا تھا۔ برلن سے وہ اودیسہ پہنچے۔ یہاں آس پاس کے ضلعوں میں فصل کی کٹائی ہو رہی تھی۔ کچھ دنوں تک وہ اپنی فوجی ٹرک میں گاھنے کے فرش سے اناج بھر بھر کر ایلی ویٹر پہنچاتے رہے۔

1945ء کی آخری رات کو میخائیل پری ستاوکا ماسکو پہنچے اور کیف ریلوے اسٹیشن سے سیدھے اپنے گھر آئے۔ خاندان کے سب لوگ جاگ گئے۔ ان کی بیوی خوشی کے مارے رونے لگیں۔ سات سالہ بیٹا ولودیا جو اب بڑا ہو گیا تھا اور کافی بدل چکا تھا گھور گھور کر نووارد کو دیکھنے لگا گویا باور کرنا چاہتا ہے کہ وہ واقعی اس کا باپ ہے۔ پھر ناراضگی سے بولا:

"آپنے گھر لوٹنے میں اتنے دن کیوں لگائے؟"

چند دن آرام کرنے کے بعد میخائیل پھر اپنے موٹر ڈپو میں موجود تھے۔ ساتھیوں نے گرمجوشی سے ان کا خیر مقدم کیا:

"خاندان میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔"

... اگر آپ فن تعمیر کی تاریخ سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو کتابیں پڑھنے سے بہتر ہے کہ عمارتوں پر نظر ڈالیں۔ انہیں دیکھتے ہوئے سڑک پر چلنا ایسا ہی ہے جیسا کتاب کے ورق الٹنا۔ ایک سڑک سے دوسری سڑک تک آپ کو دس مختلف تاریخی دور مل سکتے ہیں۔ ایک عمارت کے سامنے کبھی پوشکن چہل قدمی کیا کرتے تھے، دوسرا مکان پچھلی صدی کے آخر میں ایک دولت مند تاجر نے بنایا تھا، تیسرے کی تعمیر پہلے پانچ سالہ منصوبے کے دوران ہوئی تھی اور یہ چوتھی عمارت، راہگیروں کی آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو رہی ہے۔ پہلی تین عمارتیں بنانے میں دو یا دو سے زیادہ سال لگے تھے اور یہ چوتھی عمارت تین ہفتوں میں تیار ہو جائے گی اور ایک مہینے کے اندر گھر کی مالکنیں نئے فلیٹوں میں پردے لٹکاتی ہوئی دکھائی دیں گی۔

صدیاں گزر گئیں لیکن فن تعمیر کی ٹکنیک میں زیادہ تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔ صرف بیسویں صدی سے، اور اگر ٹھیک کہا جائے تو دوسری عالمی جنگ کے بعد سے عمارتیں تعمیر کرنے کے تصور میں ایک انقلاب برپا ہوا جو آج بھی جاری ہے۔

جدید تعمیر میں انقلابی ٹکنیکی تبدیلیوں کے متعلق نصابی کتابوں سے بہتر ایک ٹرک ڈرائیور بتا سکتا ہے جو جائے تعمیر پر مکانوں کے حصے لاتا ہے۔

میخائیل پری ستاوکا نے اپنی لاری پر جتنی اینٹیں ڈھوئی ہیں ان کا شمار کروڑوں ہی میں کیا جا سکتا ہے۔ پھر وہ پلاسٹر کی سلیں لے جانے لگے جو پہلی بار 1947ء میں سوکولینی کی پہاڑیوں پر ایک عمارت کھڑی کرنے میں استعمال ہوئی تھیں۔ اس کے بعد کنکریٹ کے بڑے بڑے بلاکوں ___ دیو قامت ''اینٹوں'' کی باری آئی۔ ایسی چار اینٹوں سے کمرے کی ایک دیوار بنائی جا سکتی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد انہوں نے شیشے دار دوہری کھڑکیوں والی پوری کی پوری دیوار لے جانا شروع کر دی۔ اور اب وہ کارخانے سے دو کھڑکیوں والی دیوار براہ راست جائے تعمیر پر پہنچاتے ہیں جو دیکھتے ہی دیکھتے نصب کی جا سکتی ہے۔ ان کی طاقتور لاری ''ماز'' (MAZ) بہ آسانی آہن بستہ کنکریٹ کی چار سلیں ماسکو کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لے جا سکتی ہے۔ واقعی یہ کرتب معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ ان کا وزن ساڑھے 12 ٹن سے کم نہیں ہوتا! ان کی لاری پر ایک پورا کمرہ لادا جا سکتا ہے جس میں کاغذ سے آراستہ دیواریں، چھت اور لکڑی کا فرش سب شامل ہوتے ہیں۔ لوگوں کے رہنے کے لئے وہ فوراً تیار کیا جا سکتا ہے۔ آج کل ایسے ہی تیار شدہ کمروں سے رہائشی مکان تعمیر کئے جاتے ہیں۔ نودیئے چیریوموشکی محلے میں ایک مکان اسی طرح بنایا گیا ہے۔

ان نئے تعمیری طریقوں کی بدولت بیس برس سے کم عرصے میں شہر ماسکو تین گنا بڑھ گیا ہے۔

میخائیل پری ستاوکا ''نئے'' ماسکو کے متعلق بہت کچھ بتا سکتے ہیں۔ یہاں مشکل ہی سے ایسی کوئی عمارت ہوگی جس کی تعمیر میں ان کا ہاتھ نہ ہو۔

جنگ کے بعد سب سے پہلا بڑا تعمیری منصوبہ میٹرو اسٹیشن ''سوکل'' کے قریب پورا کیا گیا تھا۔ میخائیل یہاں اینٹیں، گارا چونا اور ریڈیئٹر لاتے تھے اور مٹی لاد کر لے جاتے تھے۔ پھر تعمیری سامان سے لدی ہوئی ان کی لاری کو گورکی سڑک پر دیکھا گیا جہاں مرکزی ڈاک خانے اور ماسکو سوویت کے درمیان رہائشی مکان تعمیر کیا جا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ شاہراہ لینن گراد، شاہراہ

کوتوزوف غرض کہ ماسکو میں ہر جگہ ہی نظر آئے جہاں نئی نئی عمارتیں بنائی جا رہی تھیں۔

ایک دفعہ میخائیل سے اتوار کے دن کام کرنے کو کہا گیا۔ اس روز انہوں نے معمولی کپڑوں کے بجائے اپنا بہترین سوٹ زیب تن کیا۔ وہ کنکریٹ کی فیکٹری گئے، وہاں لاری میں کنکریٹ بھرا اور ماسکو سے باہر لینن پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں سینکڑوں لوگ ان کے منتظر تھے۔ مجمع نے لاری کو گزرنے کے لئے راستہ دیا۔ ایک مقررہ جگہ میخائیل نے لاری روک دی، باہر آئے اور لاری کا پچھلا حصہ نیچے کر دیا۔ کنکریٹ زمین پر گرنے لگی۔ اس بار یہ اینٹیں چننے کے لئے نہیں بلکہ خارا کے ایک بڑے سنگ بنیاد کے لئے تھی۔ اس پر یہ الفاظ کندہ تھے: ''یہاں ماسکو یونیورسٹی تعمیر ہو گی۔''

ایک مدت ہوئی یہ یونیورسٹی تعمیر ہو چکی ہے۔ میخائیل نے اس نئی یونیورسٹی کا، جو یورپ میں سب سے بڑی ہے، محض سنگ بنیاد ہی نہیں رکھا بلکہ انہوں نے لینن پہاڑیوں پر اس دیو ہیکل عمارت کی تعمیر میں بھی حصہ لیا۔ وہ یہاں کئی سال تک تعمیری سامان لاتے رہے۔

اگر آپ چہل قدمی کرتے ہوئے لینن پہاڑیوں کے ایک سرے پر جائیں، جہاں ماسکو دریا پر اس کی اُنگ کی جست لگانے کا بورڈ کھڑا ہے، تو وہاں سے آپ کو اس عظیم الشان ماسکو یونیورسٹی کا بہترین منظر دکھائی دے گا۔ اس کا وزن کروڑوں ٹن ہی ہو گا۔ اس کا تمام تعمیری سامان میخائیل پری ستاد کا اور ان کے بے شمار ساتھی ڈرائیوروں نے منتقل کیا ہے۔

پھر یہاں سے ماسکو دریا پر نظر ڈالیں۔ سامنے اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ مرکزی لینن اسٹیڈیم پھیلا ہوا ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ صرف اس کی بڑی فیلڈ میں ایک لاکھ لوگ فٹ بال کا میچ دیکھ سکتے ہیں۔ اسپورٹ محل میں پندرہ ہزار تماشائیوں کے لئے جگہ ہے۔ اس کے علاوہ یہاں دوسری عمارتیں بھی ہیں۔

اس اسٹیڈیم کے بنانے میں بھی میخائیل پری ستاد کا کا حصہ ہے۔ ''تندرستی کے اس چھوٹے سے شہر'' کی تعمیر کی وسعت اور اس پر جتنی محنت صرف ہوئی ہے اس کا سرسری طور سے قیاس کرنا بہت مشکل ہے۔ یہاں اس جگہ پر پہلے خستہ حال جھونپڑیاں، آڑھی ترچھی گلیاں، کوڑے کرکٹ اور گند کے ڈھیر اور گڑھوں سے پٹی ہوئی زمین تھی۔ لاکھوں من ملبہ مٹی ڈھوئی گئی۔ کروڑوں من سیمنٹ، اینٹیں اور اسفالٹ استعمال کیا گیا۔ بے شمار فولاد کے ڈھانچے کھڑے کئے گئے۔ یہ سب

کام لاریوں کے ذریعے ہوا۔

میخائیل پری ستاوکا بڑے خوش نصیب انسان ہیں۔ انہوں نے ماسکو کی سب سے زیادہ دلچسپ اور اہم ترین عمارتوں کی تعمیر میں حصہ لیا ہے۔ مثلاً کانگرس محل کو لیجئے یا بھاری بھرکم ہوٹل ''روسیا'' کو جو آسمان سے باتیں کرتا ہے۔ ایسی عمارتیں کھڑی کرنے میں ان کی محنت بھی شامل ہے۔

عام طور پر لاری ڈرائیور چہل قدمی پسند کرتے ہیں۔ دن بھر بیٹھ کر کام کرنے کے بعد یہ ان کے لئے اچھی تبدیلی ہوتی ہے۔ میخائیل پری ستاوکا کی بھی پسندیدہ تفریح شام کے وقت شہر میں گھومنا ہے۔ جب ان کے دونوں بیٹے ولودیا اور یوراذرا بڑے ہو گئے تو پوراکا پورا کنبہ شاہراہ لینن، شاہراہ لینن گراد یا نئے محلے نودیئے چیریوموشکی کی سیر کرنے لگا۔ چلتے چلتے میخائیل کسی عمارت کی طرف اشارہ کر کے کہتے:

''اس کے بنانے میں میں نے بھی حصہ لیا ہے۔''

پھر فوراً لڑکے پوچھنے لگتے:

''ابا، یہ مکان؟''

''اس میں بھی۔''

''اور یہ جو ہے؟''

''ہاں۔''

ماسکو کے نئے محلوں میں بہت سے رہنے والے میخائیل پری ستاوکا کے مشکور ہیں جن کی محنت کی بدولت انہیں نئے فلیٹ ملے۔ انہوں نے صرف ماسکو میں ہی لاری پر 20 لاکھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہے۔ اس کا آدھا حصہ تمام شہر میں جائے تعمیرات کو ضروری سامان پہنچانے پر شامل ہے۔ اسی سامان سے نئے، جدید فلیٹ تعمیر ہوئے اور ہزاروں ہی لوگوں کو خوشی بخشی۔

1963ء کی گرمیاں تھیں۔ ایک دن میخائیل پری ستاوکا کے موٹر ڈپو میں ٹیلی فون آنے کا سلسلہ بندھ گیا۔ فون کرنے والے مختلف لوگ تھے لیکن سوال ایک ہی کیا گیا:

''میں میخائیل پری ستاوکا سے فوراً کہاں مل سکتا ہوں؟''

ڈپو سے جواب ملا: ''یہ کوئی مشکل نہیں ہے۔ وہ بالکل ٹائم ٹیبل کے مطابق کام کرتے ہیں۔

آپ ان سے کب ملنا چاہتے ہیں۔"

"یہی دو بجے۔"

"ٹھیک دو بج کر تین منٹ پر وہ میدو ویدکووا جائے تعمیر کے چھٹے بلاک پہنچیں گے۔"

دو بجے میدو ویدکووا جائے تعمیر کے چھٹے بلاک کے باہر سات موٹر کاریں اور بہت سے لوگ کیمرے لئے ہوئے میخائیل کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ بڑی "ماز" لاری کو دیکھ کر جو آہستہ آہستہ تنگ سڑکوں سے گزر کر جائے تعمیر آ رہی تھی، یہ لوگ اس کی طرف دوڑے۔ ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھول کر خوش مزاجی سے فورمین سے کہا:

"لو یہ رہیں تمہاری سلیں ــــــ تندور سے براہ راست گرم گرم!"

ایک فوٹو گرافر خوشی سے چلایا: "بہترین شاٹ!"

پھر فوٹو رپورٹر وہاں سے غائب ہو گئے۔

میخائیل نے حیران ہو کر فورمین سے پوچھا:

"بھئی، کیا معاملہ ہے؟"

فورمین نے کندھے اچکا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

اس روز میخائیل پری ستاوکا شام کو دیر سے گھر پہنچے۔ دن بھر سخت کام کے بعد وہ تھکے ہوئے تھے۔ آج کچھ پہلے ہی سونا چاہتے تھے۔

رات کو ساڑھے دس بجے دروازہ کی گھنٹی بجی۔ اندر داخل ہوتے ہی پڑوسی نے کہا:

"مبارک ہو!"

میخائیل پوچھنے ہی والے تھے کہ یہ کس لئے کہ پھر کسی نے گھنٹی بجائی۔ اس بار پڑوسیوں کا بڑا مجمع تھا اور ان میں دوسری منزلوں پر اور نزدیک مکان میں رہنے والے سب ہی تھے۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ ابھی ابھی ریڈیو نے اعلان کیا ہے کہ سوویت یونین کی اعلیٰ سوویت کے فرمان کے مطابق میخائیل پری ستاوکا کو آرڈر آف لینن اور اشترا کی محنت کے ہیرو کا اعزاز عطا کیا گیا ہے۔

میخائیل محلہ تیکستیلشیکی میں رہتے ہیں اور محلہ کمیٹی کے صدر ہیں۔ یہاں کے بوڑھے، نوجوان سب انہیں جانتے ہیں۔

موسم بہار آنے سے بہت پہلے میخائیل پریشان ہونے لگتے ہیں کہ اتوار کے دن

رضا کارانہ طور کام کرنے کے لئے محلے والوں کو کیسے منظم کیا جائے گا۔ پبلک باغیچوں میں کب کھدائی ہوگی اور پودے لگائے جائیں گے۔ ان کے احاطے میں کافی درخت ہیں۔ گرمیوں میں لوگ شاموں کو دیر تک ان کے نیچے آرام کرتے ہیں۔

اگر کم سے کم لفظوں میں میخائیل پری ستاوکا کا کردار بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے: وہ ایسے انسان ہیں جو دوسروں کی جانب اپنی ذمے داری محسوس کرتے ہیں اور جو اپنی سماجی ذمے داریوں سے کبھی غافل نہیں رہ سکتے۔

منسک سے ٹیلی فون: 27 مارچ 1964ء کی رات کو بارہ بجے منسک کا موٹر ساز کارخانہ اپنی ''جوبلی لاری'' تیار کرے گا۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے ماسکو کے سب سے اچھے ڈرائیور کو پیش کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ فون میخائیل پری ستاوکا کے لئے کیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ نئی چمکتی ہوئی ''ماز'' لاری کو لینے کے لئے منسک گئے۔

کارخانے میں انہوں نے تحسین کی نظروں سے دیکھا کہ مختلف پرزے اور حصے کنویئر بیلٹ پر آہستہ آہستہ سرکتے ہیں، وہ جڑنے جاتے ہیں اور لاری کی شکل بنتی جاتی ہے۔ وہ سوچنے لگے کہ رہائشی مکانات بھی اسی طرح مختلف حصوں سے جڑ جڑ کر ہی تعمیر ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ جدید معماروں کے کام میں بھی اتنی ہی صحت کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے جتنی تکنیکی مشینیں بنانے کے لئے ضروری ہے۔ عمارت کی تعمیر بھی ایک طرح کا کنویئر ہے۔ اور سڑکیں اس کی بیلٹ ہیں جو کارخانوں کو جائے تعمیر سے ملاتی ہیں۔ ان پر لاری چلا کر میخائیل پری ستاوکا ہزاروں لوگوں کو خوشی دیتے ہیں۔ ان کی چشم تصور نے دیکھا کہ ان کے شانہ بشانہ موٹر ساز، ڈرائیور، معمار، فولاد ڈھالنے والے، فن کار، ڈاکٹر اور بال سنوارنے والے سب کے سب ایک عظیم الشان کنویئر کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور لوگوں کے لئے خوشی کے محل تعمیر کر رہے ہیں...

میخائیل سوچ میں اتنے محو ہو گئے کہ وہ تقریباً نئی چمکتی ہوئی ''ماز'' لاری کی ''پیدائش'' دیکھنے سے رہ گئے۔ اس کی منادی پُرشور تالیوں نے کی۔ تقریب کے اعزاز میں فیکٹری کے سب ہی لوگ جمع تھے۔ بہت سے کارکن اپنے خاندان والوں کو بھی ساتھ لے آئے تھے۔ جب ایک چھوٹے سے قد کا آدمی، سونے کا ستارہ اپنے سینے پر آویزاں کئے ہوئے، اس لاری کی جانب بڑھنے لگا تو تالیوں کا شور اور بھی زیادہ ہو گیا۔ اس کے مشاق ہاتھوں نے لاری کا دروازہ کھولا اور وہ آرام سے

سیٹ پر بیٹھ گیا۔لاری خراماں خراماں فیکٹری کے دروازے سے باہر نکلنے لگی۔

ایک دن بعد یہ چمکیلا نیا جوبلی "ماز" ماڈل ماسکو کی سڑکوں پر تھا جہاں ہزاروں موٹریں اور لاریاں ادھر سے ادھر زن زن کرتی رہتی ہیں۔ اس کا نمبر عام لاریوں کی طرح (MOP 60—05) تھا لیکن اس کا چلانے والا تھا میخائیل پری ستاوکا۔ وہ اس پر ساڑھے بارہ ٹن کا وزن لادے ہوئے اس جگہ جارہا تھا جہاں پرانی عمارتیں ختم ہوتی تھیں اور نئے راستے شروع ہوتے تھے۔اس کے پیچھے پیچھے دوسری لاریاں آرہی تھیں۔انہیں بھی وہی لوگ چلارہے تھے جن کے پیشے نے ہماری صدی میں جنم لیا ہے__یہ بیسویں صدی کا پیشہ ہے۔

از: اناتولی روبینوف

سنگتراشی کا دیو ہیکل

روسی فن کی مشہور بزرگ شخصیت، سیر گئی کونین کوف کا اسٹوڈیو پشکن چوراہے پر واقع ہے۔
دو سیڑھیاں چڑھنے کے بعد اس کا دروازہ کھولئے تو سامنے ایک غیر معمولی کمرہ نظر آتا ہے۔ اسے نہ ہال کہہ سکتے ہیں اور نہ ڈرائنگ روم۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچپن کا کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔ آپ جہاں بھی نظر ڈالیں مبہوت ہو کر رہ جائیں گے۔ ایک آرام کرسی پر راج ہنس کی گردن کی حسین کمان ہے تو دوسری پر سانپ کی کنڈلی۔ قریب ہی عقاب پنکھ پھیلائے کھڑا ہے۔ وہیں داستانی آتشی پرندے کی شکل میں، جس کا سر ایک حسین عورت کا ہے، انوکھے طرز کی بنی ہوئی میز اور کرسی رکھی ہے۔ دوسری میز پر چہچہاتی ہوئی چڑیاں اور اچھلتی ہوئی گلہریاں لوگوں کی توجہ مبذول کرتی ہیں۔ ایک کرسی سے مضحکہ خیز بونا جھانک رہا ہے۔ پریوں کی کہانیوں جیسی لکڑی سے تراشی ہوئی یہ تمام چیزیں محض نظر کی دلفریبی کے لئے نہیں بلکہ استعمالی فرنیچر کی حیثیت سے بنائی گئی ہیں۔ اس چھوٹی بنچ کو ہی لیجیے جو طلسمی جانور ''چوڈو__یوڈو'' کی شکل کے مطابق تیار کی گئی ہے۔ اس پر آپ آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔ ان تمام پُراسرار میزوں اور کرسیوں کی مشترکہ خصوصیت، جو درختوں کے تنوں اور جڑوں سے تراشی گئی ہیں، بلند ترین ہنر اور مہارت ہے۔

استاد کی آمد کے انتظار سے ہمارے دل دھڑک رہے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ، پُروقار انداز سے جسم کو تانے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کی لمبی سفید ڈاڑھی پیغمبرانہ شان رکھتی ہے اور چمکتی ہوئی آنکھیں عمر رفتہ کی یاد دلاتی ہیں۔ وہ ہمارا خیر مقدم کرتے ہیں اور مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ ہم اس نازک لیکن مضبوط ہاتھ کو عزت اور قدردانی کے جذبات سے اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اسی ہاتھ اور ان ہی نازک انگلیوں نے سنگ خارا اور مرمر کی چٹانوں سے کتنی خوبصورت چیزیں تراشی ہیں اور لکڑی کے لٹھوں میں جان ڈالی ہے اور انہیں حسن بخشا ہے۔ ایسی ہی چیزوں سے یہ اسٹوڈیو، عمارت کی نچلی منزل اور کھلے احاطے میں ان کا موسم گرما کا اسٹوڈیو بھرا پڑا ہے۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ ایک فرد تنہا بے شمار تخلیقات کا مالک ہو سکتا ہے۔ یہ ہے ان کی بے پناہ محنت کا ثبوت۔

کونین کوف کے فن کی جڑیں لوک روایات میں پیوست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر روسی ان کے مجسموں اور دوسری تخلیقات کو آسانی سے سمجھ لیتا ہے اور انہیں پسند کرتا ہے۔ ان کا اسٹوڈیو لوگوں سے بھرا رہتا ہے اور ان کی نمائشوں میں ہمیشہ بھیڑ لگی رہتی ہے۔

1964ء میں سوویت لوگوں نے سیرگئی کونین کوف __ سوویت یونین کے عوامی فنکار، لینن انعام یافتہ، اشتراکی محنت کے ہیرو اور اکادمیشن کی جوبلی سالگرہ منائی۔ اس سال وہ نوے برس کے ہوئے تھے اور اسی سال انہوں نے اپنی فنی زندگی کے ستر برس پورے کیے تھے۔ اس موقع پر فن کار کی تخلیقات کی ایک دلچسپ نمائش منظم کی گئی جس میں ان کی پوری تخلیقی زندگی کی جھلکیاں موجود تھیں۔

کونین کوف کی فنی صلاحیت ہمہ پہلو ہے لیکن بعض موضوع ان کی تخلیقات میں ہمیں بار بار ملتے ہیں۔ دراصل ان کا سرچشمہ سنگتراش کا سماجی احساس ذمے داری، انسانی ضمیر اور یہ عقیدہ ہے کہ فن کار سماج میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ اور یہ موضوع ہیں انسان کی محنت، اس کی قوت ارادی، اس کی بھرپور دانش اور گہری تخلیقی صلاحیتیں، فن، سائنس اور انقلابی جدوجہد میں اس کی جرأت۔ کونین کوف جب انسان کی اندرونی ہم آہنگی اور سالمیت کو فطرت کی ہم آہنگی اور اس کے حسن کے عکس کی طرح پیش کرنا چاہتے ہیں تو وہ بڑی چابکدستی سے اپنے فن میں قومی لوک روایات، حکایتوں، لوک گیتوں اور داستانوں کے عناصر کو تحلیل کر لیتے ہیں۔

کونین کوف کی ابتدائی زندگی اور خاص کر ابتدائی فنی زندگی آسان نہیں تھی۔ سطحی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس سے ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کی تشکیل اور ترقی میں رکاوٹیں حائل ہوئیں۔ لیکن دراصل ان ہی ابتدائی مشکلات کی چٹیل زمین سے وہ چشمہ پھوٹا جس نے ان کے فن کی آبیاری کی اور اسے پروان چڑھایا اور ان کے فن کو عوام کی امیدوں اور ان کے خوابوں سے گہرے طور پر وابستہ کیا۔

مستقبل کے عظیم سنگتراش سرگئی کونین کوف 10 جولائی (پرانے کلنڈر کے مطابق 28 جون) 1874ء کو کراکودچی نامی گاؤں میں ایک پرانی، دھوئیں سے اٹی ہوئی سیاہ جھونپڑی میں پیدا ہوئے جو اسمولنسک کے گھنے جنگلوں سے گھرا ہوا تھا۔ یہ جھونپڑی دیسنا دریا کے پہاڑی کنارے پر واقع تھی جہاں سے اس کا پُرسکون اور شفاف پانی نظر آتا تھا۔ ان کا بڑا کنبہ تھا جس کے افراد آپس میں گھل مل کر رہا کرتے تھے۔ وہ سب کے سب بہت محنتی تھے۔

سیرگئی اپنے بچپن سے ہی کدال، بیلچے اور کلہاڑی سے کام کیا کرتے تھے۔ ان کا استعمال کرنے میں ان کے ہاتھوں کو اچھی مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ اور جب وہ فن کار بن گئے تو یہ بات

بہت مفید ثابت ہوئی۔ وہ ہل چلانے والوں، فصل کاٹنے والوں، جنگل کی دیکھ بھال کرنے والوں اور پتھر کاٹنے والوں کے بیچ میں بڑھے پلے۔ خود انہوں نے کم عمری ہی میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جلد ہی ان لوگوں کی قدر کرنے لگے جو زمین پر محنت کرتے ہیں اور اس کی دولتوں سے سب کو مالا مال کرتے ہیں۔ لڑکپن میں انہوں نے چراگاہوں میں گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتے وقت کئی راتیں گزاریں اور الاؤ کے قریب پیر پھیلائے ہوئے درختوں کی سرسراہٹ اور ان کی سرگوشیاں سنیں اور روس کی فطرت سے اپنی روح کو بالیدہ کیا۔ جاڑوں کی طویل راتوں میں جب سارا کنبہ تیل کے دیے کی روشنی میں چھوٹے موٹے کاموں میں لگ جاتا تو کونین کوف روسی لوک گیت اور کہانیاں سنا کرتے تھے جو اسمولنسک علاقے میں نسلوں سے چلی آ رہی تھیں۔

یہ چیزیں لڑکے کے ذہن پر نقش ہو گئیں۔ اور اوائل عمر میں ہی موسیقی ان کے شعور میں داخل ہو گئی۔ کراکودچی گاؤں میں کئی چیزیں دلچسپ تھیں، جن میں موسیقار بھی تھے۔ ان میں قابل ذکر فومین کوف نامی دو بھائی تھے جو بہت ہی عمدہ وائلن بناتے تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ وائلن بنانے کے لئے انہوں نے جنگل سے لکڑی کاٹی اور مقامی زمیندار نے انہیں کئی بار سزا دی۔ کونین کوف بچپن میں ہی وائلن، اکورڈین اور بانسری بجانا سیکھ گئے تھے۔ وہ اکثر دیسنا کے کنارے چکر لگایا کرتے تھے جہاں مقامی کمہار مٹی سے بڑے ہنر کے ساتھ کوزے، سیٹیاں اور بعض وقت چھوٹی چھوٹی مورتیاں بھی بنایا کرتا تھا۔ کونین کوف اسے بڑی دلچسپی سے تکتے رہتے اور خود ایسی چیزیں بنانے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے مٹی کی مینائیں بنا ڈالیں اور انہیں جنگلے پر سجا دیا۔ پھر وہ باڑے کی دیواروں پر کوئلے سے گھوڑوں، گاؤں اور مرغوں کی تصویریں بنانے لگے۔ اپنے اردگرد کے ماحول میں جو چیزیں انہیں دلچسپ نظر آتیں ان کی وہ تصویریں بنا لیتے۔ پھر انہیں کاٹ کاٹ کر جھونپڑی میں کھڑکیوں پر چپکا دیتے تھے۔ جب راہگیر گزرتے تو انہیں دیکھ کر حیرت کرتے تھے۔ یہ ان کی پہلی ''نمائشیں'' تھیں۔ اس کے متعلق کونین کوف لکھتے ہیں: ''بڑی حد تک بچپن کے تاثرات سے آدمی کا مستقبل معین ہوتا ہے۔ یہ وہ جام ہے جس سے ہم سیر حاصل اور حیات بخش شراب پیتے ہیں۔''

لڑکے کی ذہانت دیکھ کر باپ اور چچا نے اسے ابتدائی تعلیم دینے کا فیصلہ کیا (ماں کا انتقال کم عمری میں ہو چکا تھا)۔ دقت یہ تھی کہ کراکودچی اور آس پاس کے دیہات میں ایک بھی اسکول

نہیں تھا۔ کئی خاندانوں نے تھوڑا بہت پیسہ جمع کر کے قلیل معاوضے پر ایک مدرس کو رکھ لیا۔ ان کا اصول یہ تھا کہ شاگرد کو تعلیم دینے کے بجائے اس کے دماغ میں علم پیٹ پیٹ کر بھرنا چاہئے۔ بہرحال سیرگئی نے پڑھنا سیکھ لیا۔ اب اس کے سامنے کتابوں کی ایک نئی دنیا کھل گئی تھی۔ جب علاقے میں میلہ لگتا تو کتابیں وہاں سے خرید لی جاتیں یا کبھی کبھار کوئی بھولا بسرا پھیری والا کراکووچی سے گزرتا ہوا بیچ جایا کرتا تھا۔

باپ اسے پنسلیں اور کاغذ خرید کر دیا کرتے تھے تاکہ وہ ڈرائنگ کی مشق کر سکے۔ کچھ دنوں کے بعد اطلاع ملی کہ روسلاول کے پرائمری اسکول میں سیرگئی داخل ہو سکتا ہے۔ یہاں اسے فن کے اچھے ٹیچر ملے۔ یہیں اس نے بعض دوستوں کے گھروں میں آرٹ کے پرانے رسالے دیکھے اور پہلی بار فن اور مصوری پر سنجیدہ گفتگو سنی۔ پرائمری اسکول ختم کرنے کے بعد کونین کوف قطعی فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ فن کار بنیں گے۔ یہ مشکل فیصلہ پورا کرنے میں ان کی امداد کے لئے خاندان والے تیار تھے۔

اس سال فصل اچھی ہوئی۔ کونین کوف کے گھر والوں نے جتنا ممکن ہو سکا پیسہ جمع کیا اور لڑکے کو ماسکو روانہ کر دیا تاکہ وہ مصوری، سنگتراشی اور فن تعمیر کے اعلیٰ اسکول میں داخلے کا امتحان دے۔ یہ اپنے وقت میں ایک جمہوری ادارہ شمار کیا جاتا تھا اور یہاں پڑھانے والے بھی مشہور تھے۔ 1892ء واقعی ایک یادگار سال تھا۔ اسی سال کسان کے بیٹے سیرگئی کونین کوف جنہوں نے کبھی روسلاول سے بھی آگے قدم نہیں رکھا تھا ماسکو آئے اور آرٹ کے اعلیٰ اسکول کا سخت امتحان پاس کیا۔ یہاں وہ مشہور روسی سنگتراش ایوانوف اور ولوخن کے زیر ہدایت سنگتراشی کے شعبے میں پڑھنے لگے۔ شہر میں ان کے سامنے روسی فن کے خزانے کھلے ہوئے تھے __ مثلاً تریتیاکوف آرٹ گیلری اور بے شمار کتب خانے۔ ماسکو کے ثقافتی ماحول نے ان کی صلاحیتیں چمکانے میں بڑا رول ادا کیا۔

یہاں سے کونین کوف کی تخلیقی زندگی میں ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ ابتدا میں زندگی مشکل تھی۔ گھر سے جو پیسہ آیا کرتا تھا وہ بند ہو گیا۔ نوجوان سنگتراش نے کتنے ہی دن خالی چائے اور کالی روٹی پر بسر کئے۔ لیکن مادی مشکلات نے ان کی علم حاصل کرنے کی پیاس نہیں بجھائی، بلکہ وہ بڑھتی ہی گئی۔ آہستہ آہستہ استادوں پر ان کی صلاحیتیں آشکار ہونے لگیں۔ وہ انہیں

معاوضے پر سنگتراشی کے چھوٹے موٹے کام دینے لگے۔ بعد میں اسکول کے خرچ پر انہیں عظیم استادوں کے فن کا مطالعہ کرنے کے لئے تعلیمی سفر پر فرانس، اٹلی اور جرمنی بھیجا گیا۔ اسی سفر کے دوران وہ مائیکل اینجلو کے شاہکاروں سے روشناس ہوئے اور زندگی کے آخری دنوں تک ان سے متاثر رہے۔

کونین کوف کے لئے نئے تاثرات دلچسپ ضرور تھے لیکن وہ ان موضوعات سے قریب رہے جن کا تعلق مادر وطن سے تھا۔ چنانچہ 1898ء میں اسکول کی ڈگری کے لئے انہوں نے اپنے مجسمے کے لئے ''پتھر کوٹنے والا'' کا موضوع منتخب کیا۔

اس کا پس منظر کیا تھا؟ کونین کوف اکثر اپنی چھٹیاں کراکووچی میں گزارتے تھے۔ ایک دفعہ گاؤں کے قریب ان کی ملاقات ایوان کوپرن سے ہوئی جو سڑک پر پتھر کوٹ رہے تھے۔ کوپرن نے اپنی دکھ بھری کہانی سنائی۔ کونین کوف نے فوراً انہیں سنگتراشی کا ماڈل چن لیا۔ جب مجسمہ تیار ہو گیا تو واقعی وہ عوامی فن کا نمونہ تھا اور اس سے محنت کش انسان کے ساتھ محبت اور احترام کے گہرے جذبات ظاہر ہوتے تھے۔ اس مجسمے میں نوجوان سنگتراش نے شرافت، سوز و گداز، دانش اور روحانی قوت کے تمام عناصر سمو دیئے تھے۔ اور ان ہی خوبیوں کی بدولت مجسمہ غیر معمولی کہا جا سکتا تھا۔ بعد میں جب کونین کوف نے اپنی معرکتہ الآرا فنی تخلیق ''مفکر'' تراشنی شروع کی تو اسی گاؤں کے پرانے دوست کے چہرے کو اپنے تصور کی نظر میں رکھا۔ انسان __ محنت کش اور انقلابی، یہی موضوع ان کے لئے ہمیشہ تخلیقی محرک رہا ہے۔

ماسکو کے آرٹ اسکول سے ڈگری لینے کے بعد بھی کونین کوف کی علم کی پیاس نہیں بجھی۔ انہوں نے پیٹرسبرگ کی فنون کی اکادمی میں تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ یہاں ماسکو کے مقابلے میں تعلیم کے طریقے جمہوری نہیں تھے۔ اگرچہ یہاں انہیں بیکلے میشیف جیسے جفادری سنگتراش کے اسٹوڈیو میں کام کرنے کا موقع حاصل تھا لیکن انہیں اپنے نئے استاد کی قربت نصیب نہیں ہوئی۔ اس پر طرہ یہ کہ جب انہوں نے ڈگری کے لئے ''سیمسن اپنی زنجیریں توڑ رہا ہے'' کا موضوع منتخب کیا تو اس پر اکادمی کے سربراہ خوش نہیں ہوئے۔ کونین کوف نے یہ موضوع اپنی فنی زندگی میں کئی بار اختیار کیا ہے۔ اس کا سبب وہ گورکی کے ان الفاظ میں بتاتے ہیں: ''روسی عوام ایک بے لگام حکومت کی سخت گیر اور بھاری مشین کے تلے اسی طرح کچلے ہوئے ہیں جیسے زنجیروں

میں جکڑا ہوا اندھا سیمسن ـــ صحیح معنوں میں ایک طاقتور مظلوم!'' کونین کوف اپنے سیمسن کے متعلق کہتے ہیں: ''وقت آئے گا جب یہ ستم رسیدہ دیو پیکر انسان گہری سانس لے گا... وہ اپنی تمام قوت کو جمع کر کے ایک بار پھر کوشش کرے گا اور اس کی زنجیریں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گی۔''

بیکلے میشیف نے اپنے نوجوان شاگرد کی کوئی خاص مدد نہیں کی۔ وہ کبھی کبھار اسٹوڈیو کا چکر لگا لیا کرتے تھے لیکن نوجوان سنگتراش کے کام پر کبھی کوئی رائے نہیں دیتے تھے۔ کونین کوف نے پیٹرسبرگ کی بندرگاہ پر کام کرنے والے جسیم گودی مزدوروں میں سے ایک مزدور کو اپنے ماڈل کے لئے چنا۔ وہ اس کے گٹھیلے جسم کو مٹی میں اس طرح ڈھالنے لگے کہ اسے دیکھ کر دیو پیکر انسان کی بے پناہ قوت کا احساس پیدا ہو۔ آخری مہینوں میں انہوں نے اس مجسمے پر روزانہ بارہ بارہ گھنٹے کام کیا۔ رات کو اسٹوڈیو میں بجلی نہیں ہوتی تھی اور وہ تمام رات موم بتی کی روشنی میں کام کیا کرتے تھے۔ ایک اور مصیبت یہ نازل ہوئی کہ اپنے دس فٹ بلند مجسمے کو ڈگری کے لئے پیش کرنے سے عین پہلے وہ مچان سے گر پڑے اور اپنا بازو توڑ ڈالا۔ لیکن اکادمی کے حکام تھوڑی سی بھی مہلت دینے پر رضامند نہیں ہوئے۔

ان حالات میں انہوں نے مجسمہ پیش کیا۔ اکادمی کی طرف سے امتحان لینے والوں نے کونین کوف کے جرأت آمیز تصورات اور مجسمہ سازی میں ان کے نئے اسلوب کو نہیں سراہا۔ صرف ان کے ساتھی طالب علموں اور ریپن نے مجسمے کی تعریف کی۔ کونین کوف کو مشکل سے ڈگری تو مل گئی لیکن بیرونی ممالک جانے کے لئے وظیفہ نہیں ملا جو اکادمی سے پاس ہونے والے ہونہار طالب علموں کو دیا جاتا تھا۔

اپنے اس تخلیقی کام پر انہوں نے خون پسینہ ایک کر دیا تھا۔ یہ ان کے تصورات کا پیکر تھا۔ جب اس کی داد نہیں ملی تو ان کا دل ٹوٹ گیا اور وہ اکادمی سے الگ ہو گئے۔ وہیں پیٹرسبرگ میں اپنے فیل قامت مجسمے کو چھوڑ کر وہ ماسکو چلے آئے۔ تین سال کے بعد اکادمی نے انہیں یہ اطلاع بھیجی ـــ چونکہ یہ معلوم نہیں تھا کہ مجسمے کو کس پتے پر بھیجا جائے اس لئے اسے تلف کر دیا گیا! اگرچہ اصل باقی نہیں رہا تھا لیکن اس کی تصویر کونین کوف کے ذہن میں محفوظ رہی اور ان کی دوسری تخلیقات میں مزید واضح شکلوں میں نمودار ہوئی۔

وہ وقت جلد ہی آ گیا جب کونین کوف کو مجسمے کے تلف ہونے پر افسوس ہوا۔ 1905ء میں

روس کے انقلابی عوام آزادی کی لڑائی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔اس جدوجہد میں کونین کوف نے بھی بذات خود حصہ لیا۔اس کے بارے میں انہوں نے اپنی کتاب ''نوجوانوں سے چند باتیں'' میں لکھا ہے:

''ہر طرف ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔دسمبر کا مہینہ آیا،مزدور سڑکوں پر نکل آئے۔انہوں نے پولیس والوں سے ہتھیار چھین لئے اور انہیں پسپا کر دیا۔''

''اربات ماسکو کا ایک مرکزی محلہ ہے۔یہاں ہم نے آریوں سے ٹیلی فون کے کھمبے کاٹے، دروازوں کے تختے اکھاڑے،انہیں تار سے باندھا اور سڑکوں پر مورچے کھڑے کر دیئے۔''

''مجھے اربات کے مسلح مزدوروں کے دستے کا لیڈر چنا گیا تھا۔''

''ہمارا فریضہ یہ تھا کہ پراگ ریستورانٹ سے لے کر اسمولنسکی بازار تک مورچوں کی حفاظت کریں۔رات بھر ہمارے لوگ سڑکوں پر گشت لگاتے تھے اور کراسنایا پریسنیا کے باغی انقلابی مزدوروں سے ربط قائم رکھتے تھے۔''

''مجھے مورچوں کی یہ راتیں یاد ہیں۔چھتوں اور بالا خانوں سے گولیاں چلتی رہتی تھیں۔ہر طرف بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔اس موقع پر میرے ہم وطن مزدور ایوان چورکن نے بڑی ہمت دکھائی۔''

''ہم دس دن تک مورچوں پر ڈٹے رہے۔پھر ایک روز سیمیونوفسکی رجمنٹ نے پہلے پریسنیا اور پھر اربات کے مورچوں پر گولہ باری کرنا شروع کر دی... توپ خانے کے لئے ہماری سادہ دفاع کو تباہ کر دینا کوئی مشکل نہیں تھا۔پھر فوج کے ساتھ فائر بریگیڈ کے لوگ آئے اور انہوں نے ہمارے تباہ شدہ مورچے جلا ڈالے۔''

ان واقعات کے بعد سخت رجعت پرستی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔لیکن جن مجاہدوں نے بہتر زندگی کی خاطر جدوجہد کی تھی ان کی یاد کونین کوف کے دل میں باقی رہی۔سنگتراش نے انہیں سنگ مرمر، کانسے اور پتھر میں تراشا، ڈھالا اور اس شکل میں تاریخ محفوظ رکھی۔اس سلسلے کے مجسمے ہیں ــــ ''شہری محافظ ایوان چورکن 1905ء میں''، ''دھریہ''، ''سلاف''، ''کسان''... یہ مجسمے سوویت یونین کے مختلف عجائب گھروں میں موجود ہیں۔ایسے ہی بے باک، جری اور ثابت قدم لوگوں میں کونین کوف نے ملک کا مستقبل دیکھا۔رجعت پرستی کے بدترین دنوں میں بھی انہیں

پرولیتاریہ کی فتح پر یقین رہا۔ایک عام روسی لڑکی کے خوبصورت مجسمے ''ٹیکے ـــ فتح'' میں فن کار نے اپنی اسی امید اور نئے اور بہتر مستقبل کی سعی دکھائی ہے۔کونین کوف نے عورتوں کے جتنے مجسمے بنائے ہیں ان میں یہ حسین ترین شمار کیا جاتا ہے۔ملک کی روزمرہ زندگی میں جو افسردگی پھیل گئی تھی اس نے بھی اپنا رنگ دکھایا۔اگر ہم ان کی تخلیقات ''خوابیدہ سر'' یا ''گذرنی ناستیا'' کو لیں تو ان میں ہمیں ایک خاص متانت ملتی ہے۔لیکن ''زانو پر جھکی ہوئی عورت'' سے بالکل مختلف تاثر پیدا ہوتا ہے۔ہمیں ایک نڈھال خمیدہ عورت نظر آتی ہے جو بازوؤں سے اپنا چہرہ چھپائے ہوئے ہے۔ بایں ہمہ، اس کی پشت کا لوچدار خم اور سبک خطوط اس عریاں مجسمے کو غیر معمولی حسین بنادیتے ہیں۔ یہ مجسمہ مایوسی کا تاثر پیدا کرتا ہے۔کونین کوف نے جتنے عریاں مجسمے تراشے ہیں ان سب کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں پلاسٹک آرٹ کے ساتھ ساتھ گرافک آرٹ بھی موجود ہے۔

یہ زمانہ مشکل تھا۔لیکن کونین کوف کا فن برابر ترقی کرتا رہا۔اب ان کا شمار چوٹی کے فن کاروں میں کیا جانے لگا۔ان کی باغی روح ماضی کے کسی ہمدم کی تلاش میں تھی۔اور یہ انہیں اٹلی کے کمپوزر اور وائلن نواز پگانینی (1840ء۔1782ء) کی شبیہ میں مل گیا۔وہ خود موسیقی کے شوقین تھے اور خاص طور پر پگانینی اور باخ کی موسیقی کو خوب سمجھتے تھے اور پسند کرتے تھے۔پگانینی کی شبیہ پچاس سال تک (1956ء۔1906ء) ان کے ذہن پر چھائی رہی۔انہوں نے وائلن نواز کے سنگ مرمر اور لکڑی سے کئی مختلف مجسمے بنائے۔ان تمام مجسموں میں موسیقار کا ولولہ، فن سے محبت، مصائب، وجدانی کیفیت، حساس چہرے کا تناؤ اور نازک انگلیوں والا ہاتھ ـــ یہ تمام خصوصیات بڑی خوبی سے سموئی گئی ہیں۔لوگوں کا خیال ہے کہ اندرونی گہرائی اور نقوش کے تناسب کے لحاظ سے کونین کوف نے پگانینی کا بہترین مجسمہ 1908ء میں سنگ مرمر سے تراشا تھا۔بدقسمتی سے اب اس کا صرف پلاسٹر کا قالب ہی باقی رہ گیا ہے۔1956ء میں انہوں نے پھر لکڑی سے پگانینی کا مجسمہ بنایا۔یہ اپنے اظہار اسلوب، آرائش اور خیال آرائی کا اچھا نمونہ ہے اور اس میں ان تمام امکانات سے پوری طرح فائدہ اٹھایا گیا ہے جو لکڑی فراہم کرتی ہے۔

جب ہم کونین کوف کے سلسلے میں لکڑی کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے تصور میں ان کی تمام تخلیقات کی اکثریت آجاتی ہے۔وہ روسی جنگل میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ان کا میلان ہمیشہ چوب تراشی کی طرف رہا۔لکڑی کو وہ روسی مجسمے سازی کا پرانا، قومی کچا سامان سمجھتے

تھے۔انہوں نے اس کچے سامان کو استعمال کر کے چوب تراشی کو بحال کیا جسے انیسویں صدی کے روسی فن کار تقریباً بھول چکے تھے۔انہوں نے ثابت کر دیا کہ ایک استاد کے لئے لکڑی میں غیر محدود امکانات ہیں۔اپنی قدرتی شکل میں درختوں کی جڑیں اور تنے غیر معمولی تاثر پیدا کر سکتے ہیں۔انسانی جسم کے خطوط اور اس کی ہم آہنگی کے حسن کا اظہار کرنے کے لئے لکڑی کی اپنی ساخت انتہائی موزوں ہے۔

دو انقلابوں کے درمیان (1917ء۔1905ء) کونین کوف نے زیادہ تر چوب تراشی سے کام لیا،اس لئے کہ سنگ مرمر، کانسہ یا پتھر ان کے مخصوص تخلیقی تصورات کا اظہار اچھی طرح نہیں کر سکتا تھا۔1907ء میں اپنے بچپن کے دن یاد کرتے ہوئے انہوں نے پریوں کی کہانی کا ایک کردار ''شہد کی مکھیاں پالنے والا بوڑھا'' لکڑی سے تراشا۔انہیں یہ کردار بہت پسند تھا جو نیک دل جنگل کا رکھوالا تھا اور سادہ کسان۔

کونین کوف نے قدیم دیومالاؤں کے بھی بہت سے موضوع اختیار کئے ہیں۔لیکن ان سب کا لہجہ روسی ہے۔مثال کے طور پر ''باکوس'' کو لیجئے۔وہ ہاتھ میں انگور کا خوشہ لئے ہوئے ضرور دکھایا گیا ہے لیکن اس کا چہرہ یونانی نہیں بلکہ روسی ہے۔یہ مجسمہ اپنی تراش خراش، آرائش اور تناسب کی وجہ سے خاص طور پر جاذب نظر ہے۔ان کی نقوش دار تصویر ''رنگ رلیاں'' بھی اسی صف میں شامل ہے۔اس میں موزوں تناسب کی وجہ سے روشنی اور سائے کا تقابل بڑھ جاتا ہے۔یہاں بھی کونین کوف نے مثالی روسی حسینائیں پیش کی ہیں۔ہاروں میں انگور کے خوشے اور غیر معمولی پھل گندھے ہوئے ہیں لیکن روسی کدو بھی موجود ہے۔''استر یبوگ'' دیوتا کا مجسمہ سلاف بت پرستوں کی مورتی کا مکمل نمونہ ہے۔''

کونین کوف حسن کے روسی تصور کے قائل ہیں۔''لادا'' مجسمے کو لیجئے۔اسے لوگ ''روسی مونا لیزا'' کہتے ہیں۔اس کے ہاتھوں اور بازوؤں میں گداز اور نسائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور پورا مجسمہ پاکیزگی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

کونین کوف کی زندگی کا یہ وہ دور ہے جب ان کا لوہا مانا جانے لگا تھا اور ان کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ان کی تخلیقات بڑی بڑی نمائشوں میں دکھائی جاتی تھیں،ان پر اخباروں اور رسالوں میں تبصرے شائع ہوتے تھے اور ہاتھوں ہاتھ ان کے مجسمے خرید لئے جاتے تھے۔یہی وہ

دور ہے جب کونین کوف نفسیاتی مرقع نگاری کے ماہر کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔

ان کے مجسموں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ تناسب و توازن کے اعتبار سے گوناگوں ہیں اور ان میں انسان کی روحانی دنیا کی گہرائیاں ملتی ہیں۔ کونین کوف مجسمے تراشتے وقت ہمیشہ ان میں انسان کا جوہر سمونے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ جب مجسمہ تیار ہو جاتا ہے تو اس میں انسان کی اندرونی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ اسی نفسیاتی گہرائی کے سبب دو نوجوان عورتوں (کارپودا اور سویشنیکووا) کے ان کے بنائے ہوئے مجسمے بڑے جاندار معلوم ہوتے ہیں۔ 1907ء سے 1917ء تک کونین کوف نے مردوں کے جو مجسمے تراشے ان سے بھی ان کی نفسیاتی رسائی کا اندازہ ہوسکتا ہے، خاص کر ان کی اپنی شبیہہ سے جسے انہوں نے 1916ء میں پتھر سے تراشا تھا۔ قدرے سخت چہرہ، ابھری ہوئی پیشانی اور مستحکم نظریں بتاتی ہیں کہ یہ انسان تخلیقی مقصد اور لامحدود توانائی کا مالک ہے۔ فن کار نے کھردرا پتھر استعمال کر کے اور مجسمے کی سطح کو بھی کھردری بنا کر اس کیفیت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ وائلن نواز روماشکوف کے کانسے کے بسٹ میں خطوط نمایاں ہیں اور چہرے پر روحانیت ہے۔ ''جہاز گروموبوئی کا ملاح'' سنگ مرمر کا مجسمہ ہے۔ شکل جو بے باک اور واضح ہے اس سے کردار کی دیانت اور قوت کا پتہ چلتا ہے۔

کونین کوف کے موضوع بے شمار اور گوناگوں ہیں۔ لیکن ان کا عزیز موضوع وہی عام محنت کش انسان ہے جسے سرمایہ دارانہ سماج کچلتا ہے لیکن وہ کبھی اپنی روحانی قوت، خودداری اور احتجاج سے منہ نہیں موڑتا۔ ان کے ہاں اکتوبر انقلاب سے عین پہلے یہ موضوع خاص شدت سے ابھرنے لگا تھا۔ اس دور کے بہترین نمونوں میں سے یہاں دو کا ذکر کیا جا سکتا ہے ـــ ''چچا گریگوری'' (چوبی) اور ''بھیک منگے'' (چوبی)۔ ''چچا گریگوری'' کا چہرہ، کام سے گھسے ہوئے بھدے ہاتھ اور ننگے پیر آس پاس کی دنیا اور عمر رفتہ کی سفاکیوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اپنی اس تخلیق میں فنکار نے عمل نہیں بلکہ خیال پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے مجسمے میں دو بوڑھے بھکاریوں کے سراپے اس طرح بنائے گئے ہیں گویا زندگی کی تلخیوں کے خلاف احتجاج کر رہے ہوں۔ خاص کر لمبے فقیر کا سنجیدہ چہرہ ایسے آدمی کا چہرہ نہیں جو خیرات کے لئے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ کونین کوف کی تخلیقات کا سرچشمہ زندگی اور لوگ ہیں۔ لیکن یہ ان کے جادو کے ہاتھ ہیں جنہوں نے ان کے فن پاروں کو قوت اور اہمیت بخشی اور انہیں شاہکاروں کا درجہ دیا۔

یہاں ''جنگل کا بوڑھا رکھوالا'' مجسمے کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ تریتیاکوف آرٹ گیلری کی زینت ہے اور کافی لوگ اسے پسند کرتے ہیں۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ کون ہے ___ روسی جنگلوں اور کھیتوں کا نیک فرشتہ یا روسی لوک کہانیوں کا کوئی کردار؟ وہ تجسس کے ساتھ اپنی بھنچی ہوئی آنکھوں سے دنیا کو دیکھ رہا ہے اور اس کی پُر اسرار مسکراہٹ کو گھنی ڈاڑھی چھپائے ہوئے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وہی بوڑھا گڈریا ہو جس کے ساتھ کونین کوف بچپن میں کھیتوں میں بیٹھا کرتے تھے۔ وہ جو کوئی بھی ہو، مجسمے میں وہ ڈنڈا پکڑے کھڑا ہے، پیروں میں چھال کے جوتے ہیں اور پیٹی سے تمباکو کی تھیلی لٹک رہی ہے۔

کونین کوف کے فنی ارتقا کو سمجھنے میں ان کے یونان کے سفر سے بہت مدد ملتی ہے جو انہوں نے 1912ء میں کیا تھا۔ کلاسیکی یونانی سنگتراشی نے جو تاثرات ان کے ذہن پر چھوڑے وہ جلد ہی ان کی تخلیقات میں ظاہر ہونے لگے۔ اب وہ سمجھنے لگے کہ انسانی جسم کی ہم آہنگی اور اس کا حسن، جس کی پرانی دنیا کے سنگتراش بہت زیادہ قدر کیا کرتے تھے، انسان کی اندرونی تکمیل، اس کی ہم آہنگی اور سالمیت کا ہی اظہار ہے۔ اس خیال نے جن فن پاروں کو جنم دیا ان میں قابل ذکر یہ ہیں ___ ''خواب''، ''دوشیزہ''، ''زخمی عورت''، ''جل پری''، ''عورت کا دھڑ''، ''رقاصہ ایئسا ڈوراڈنکن''۔

1917ء کا عظیم اکتوبر انقلاب آیا۔ اس نے روس کے عوام کو سرمائے داری کی غلامی سے نجات دلا دی۔ سیرگئی کونین کوف نے کھلے دل سے اس کا خیر مقدم کیا اور جوش و خروش کے ساتھ نئی عوامی، اشتراکی ثقافت کی داغ بیل ڈالنے میں مصروف ہو گئے۔ ان کی لینن سے بھی ملاقات ہوئی جسے انہوں نے ہمیشہ یاد رکھا۔ انہوں نے عظیم قائد کے کئی مجسمے بنائے۔ لینن کا آخری مجسمہ انہوں نے 1964ء میں تیار کیا تھا۔ اسی سال ان کی 90 ویں جوبلی سالگرہ منائی گئی۔

1918ء میں حکومت کی فرمائش پر کونین کوف نے رنگین سیمنٹ کی ایک بڑی یادگار تختی (510 سنٹی میٹر لمبی اور 340 سنٹی میٹر چوڑی) بنانا شروع کی۔ یہ کریملن کے ایک مینار کے لئے تھی۔ اس پر کندہ تھا: ''ان لوگوں کی یاد میں جو امن اور قوموں کے درمیان بھائی چارے کی جدوجہد میں کام آئے۔'' یہ کام انہوں نے انقلاب کی پہلی سالگرہ کے لئے ختم کر لیا۔ کچھ عرصہ ہوا یہی تختی بحال کرنے کے بعد سنگتراش کی جوبلی نمائش میں دکھائی گئی۔ اس نقشی تختی میں جوش ابھارنے والا ایک عورت کا چہرہ ہے جو آزادی کی روح اور انقلابی عوام کی کامرانی کا نشان ہے۔

اس کے ایک ہاتھ میں امن اور قوموں کے درمیان دوستی کا نشان ___ زیتون کی شاخ ہے اور دوسرے ہاتھ میں سرخ پرچم۔ عورت کو لہراتے ہوئے لال جھنڈے کے پس منظر میں دکھایا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اڑ رہی ہے۔ اس سے مجموعی تاثر بہت گہرا ہو جاتا ہے۔ 8 نومبر 1918ء کو اکتوبر انقلاب کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اس یادگار نقشی تختی کی نقاب کشائی کی گئی تھی۔

سیرگئی کونین کوف کی بنائی ہوئی ایک اور یادگار کا افتتاح یکم مئی 1919ء کو لال چوک میں ہوا۔ اس کا افتتاح خود لینن نے کیا تھا۔ یادگار مشہور روسی باغی کسان لیڈر استیپان رازن اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں ہے۔ یہ یادگار لکڑی سے بنائی گئی تھی، اس لئے اسے مستقل کھلی ہوئی لال چوک میں نہیں رکھا گیا۔ وہ لینن گراد کے روسی عجائب گھر کو بھیج دی گئی۔ یہ بھی جوبلی نمائش میں پیش کی گئی تھی۔ اس میں شکلیں اور جسم بہت باریکی سے نہیں تراشے گئے ہیں اور پورا یادگار مجسمہ ایک عام مرقع پیش کرتا ہے۔ لیکن ہم اسے روسی کردار کا ایک زبردست نمونہ کہہ سکتے ہیں۔

آخر کار عظیم سنگتراش کا خواب پورا ہو گیا اور وہ اہم سماجی موضوعات کو اپنی تخلیقات میں پیش کرنے لگے۔ اب ان کے شاہکاروں کے ہیرو آزاد لوگ تھے۔ وہ نئے جوش سے لکڑی کے آرائشی مجسمے بنانے لگے۔ ان کا موضوع کسان اور مزدور تھا۔ بدقسمتی سے یہ سب مجسمے آگ کی نذر ہو گئے۔ ان میں سے صرف ایک ''ٹیکسٹائل مزدور عورت'' باقی ہے جس کا مضبوط جسم مجسمے کو واقعی یادگار بناتا ہے۔

انقلاب کے بعد کونین کوف ماسکو کے سنگتراشوں اور فن کاروں کی یونین کے صدر چنے گئے۔ اس کے علاوہ وہ ان نوجوان مزدوروں کو سنگتراشی بھی سکھانے لگے جو اعلیٰ فن اور ڈیزائن کے انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ اس وقت یہ اپنی قسم کا واحد آرٹ اسکول تھا۔

1923ء میں کونین کوف دوسرے فن کاروں کے ہمراہ سوویت یونین کی نمائش کے سلسلے میں امریکہ گئے۔ وہاں وہ کئی سال رہے اور بہت سی امریکی شخصیتوں اور روسی ثقافت کے مشہور نمائندوں کے مجسمے بنائے۔ اس زمانے میں انہوں نے امریکی سائنس دانوں، فن کاروں اور ادیبوں کے جو بسٹ تراشے وہ حقیقت پسندی کے حامل ہیں۔ ان میں کونین کوف کے قریبی دوست البرٹ آئنسٹائن بھی شامل ہیں۔ وہ اپنی قومی ثقافت سے بھی قریب رہے۔ گورکی، پاولوف، شالیاپن، رخمانینوف، دستوئیفسکی اور پوشکن کے ان کے بنائے ہوئے مجسمے انہی برسوں

کی یادگار ہیں۔

1928ء میں کونین کوف نے اپنی بیوی مارگریتا کے ساتھ اٹلی کا سفر کیا۔ وہ روم سے سورینتو پہنچے جہاں اس زمانے میں گورکی آرام کر رہے تھے۔ یہاں کام ختم کرنے کے بعد ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے یا کھانے کی میز پر گفتگو کے دوران وہ گورکی کو اپنی امیدوں، منصوبوں اور فن کے ساتھ اپنے مخصوص تعلق کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ ایسی ہی بحثوں کے بعد وہ فن میں حقیقت پسندی کے اصول برتنے کے اور بھی قائل ہو گئے۔

یہاں کونین کوف نے گورکی کا جو مجسمہ تیار کیا اس میں ان کے روسی خدوخال، چوڑی ذہین پیشانی، گھنی بھنوؤں کے نیچے فہم رسا آنکھیں اور ان کا مصمم دہانہ نمایاں ہیں۔ فن کار نے اسے کانسے میں ڈھال کر خطوط کو اور بھی ابھار دیا ہے۔

اپنے نیویارک کے اسٹوڈیو میں انہوں نے پاولوف، شالیاپن اور مغنیہ پلیویتسکایا کے صرف مٹی کے چربے ہی تیار کیے۔ روس لوٹ کر 1952ء میں انہیں سنگ مرمر میں تراشا۔

کونین کوف اس کے قائل ہیں کہ ہر مجسمہ سنگتراش کے ذاتی تصور اور ماڈل کے ساتھ اس کے تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔

یہاں مشہور روسی مغنی شالیاپن کا مجسمہ اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں وہ نوجوان نہیں دکھائے گئے ہیں۔ وطن سے جدائی کے کئی سال چہرے پر عیاں ہیں۔ غم اور آرزو نے چہرے پر جھریاں ڈال دی ہیں، تنی ہوئی ابروؤں کے درمیان شکن پڑ گئی ہے اور بھرے ہوئے گال ایک تھکے ہوئے بوڑھے آدمی کے گال ہیں۔ لیکن مجسمے کی عظمت صرف اس حقیقت نگاری میں نہیں ہے۔ شالیاپن کونین کوف کی نظر میں ایک دیو ہیکل تھے، ہر میدان میں خواہ اسٹیج ہو یا زندگی۔ وہ ایک غیر معمولی ذہین فن کار تھے۔ مجسمے میں ان کا ذرا اوپر اٹھا ہوا سر کلاسیکی حسن کا نمونہ ہے اور چہرے سے وجدانیت کی شعائیں پھوٹ رہی ہیں۔ ان کی ستواں ناک، پروقار اور خوش امید سراپا، ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ، لوچدار ڈھلی ہوئی ٹھوڑی اور مضبوط گردن ـــــ یہ تمام عناصر اتنی خوبصورتی کے ساتھ ہم آہنگ ہیں کہ ہم مجسمے میں شالیاپن کی روح اور ان کی نفسیاتی گہرائیوں کو جھانک سکتے ہیں۔ شالیاپن خود بھی شوقیہ مصور اور سنگتراش تھے۔ جب انہوں نے اپنا مجسمہ دیکھا تو تسلیم کیا کہ کونین کوف نے واقعی ان کی روح کی گہرائیاں پالی ہیں۔

پلیو یتسکا یا کا مجسمہ عام طور پر ''روسی سرفان میں ملبوس ایک عورت'' کے نام سے مشہور ہے۔ اسے محض ایک فرد کا بسٹ کہنا زیادتی ہوگی۔ دراصل یہ کلاسیکی روسی حسن کا قصیدہ ہے۔

عظیم روسی صاحب بصیرت کا انسانی روح میں قدرتی تضاد کا تلخ علم، اس کی غیر معمولی ذہانت اور اس کا اندرونی کرب ___ دستوئیفسکی ناقابل حل شکوک کے شکار تھے اور انہیں پرانے سماج نے مقید کر رکھا تھا۔ اس کا احساس نہ صرف ان کے چہرے سے بلکہ تنے ہوئے بازوؤں سے بھی ہوتا ہے۔

ایسا ماہرانہ نفسیاتی مرقع صرف وہ سنگتراش ہی کھینچ سکتا ہے جو برسوں ریاض کر چکا ہو۔

کونین کوف کی زندگی میں تناؤ بھی تھے۔ انہیں اپنے ملک لوٹنے کا خیال بار بار ستاتا تھا۔ وہ اپنے نت نئے خیالات کو عمل میں لانا چاہتے تھے۔ لیکن پردیس میں یہ ممکن نہیں تھا۔ مدافعت وطن کی جنگ ان کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اب وہ اپنی سرزمین سے الگ نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ جیسے ہی سوویت یونین نے جنگ میں فتح حاصل کی اور دنیا کو فاشزم سے نجات دلائی وہ بلاتوقف سامان جمع کر کے اپنی بیوی کے ساتھ ایک چھوٹے سے جہاز ''اسمولنی'' میں وطن روانہ ہو گئے۔ جہاز بحرالکاہل میں طوفانوں کے تھپیڑے کھاتا ہوا ولادی وستوک پہنچا۔ 1945ء میں کونین کوف ماسکو میں تھے۔

روسی سرزمین نے کونین کوف کو نئے منصوبے بخشے۔ یہاں سے ان کی فنی زندگی میں ایک نیا ثمر خیز دور شروع ہوا۔ ایک عرصے کے بعد انہوں نے نئی نئی چیزیں دیکھیں، لوگوں سے ملے اور سوشلزم کے کارناموں سے واقفیت حاصل کی۔ ان سے وہ بہت متاثر ہوئے اور ان کے دل میں انہیں مجسموں کی شکل دینے کی بے پناہ خواہش پیدا ہوئی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وقت کے تقاضوں سے فن کار کا تعلق اور عوام کے مفاد سے اس کا گہرا جذباتی رشتہ ہی فن کا فریضہ ہے۔ کونین کوف نے لکھا: ''اشتراکی حقیقت نگاری بہت ہی بلند اسٹائل، دل کی تپش اور اس کی گہرائیوں کا نتیجہ ہے۔'' ایک اور جگہ کہا: ''امن اور انسانیت کے درخشاں مستقبل کی جدوجہد میں فن ایک باعزت مقام رکھتا ہے۔ فن ہمارے خوابوں کو حیرت انگیز طریقے سے ظاہر کرتا ہے... فن انسانی کردار کے بہترین پہلوؤں کو عظمت عطا کرتا ہے، وہ ہمیں رجعت پرستی اور بدی سے نفرت کرنا سکھاتا ہے۔ فن وطن سے، حسن سے، سورج اور روشنی سے محبت کے گن گاتا ہے... تخلیق کرنے

والوں کے لیے ہم عصریت کا احساس سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ فن کی رگ جاں ہے۔"

ماسکو آنے کے بعد کونین کوف نے اپنی ثمر خیز اور بھرپور تخلیقی زندگی کے لگ بھگ بیس برس کے دوران تین قسم کے فن پاروں کی تخلیق پر گزارے ___ ہم عصر لوگوں کے مجسمے، فن کی یادگاری آرائشی تخلیقات اور بے شمار چوب تراشیاں جن کا سیر حاصل سرچشمہ روسی داستانیں ہیں۔

کونین کوف کے اس نئے تخلیقی دور کا پہلا شاہکار ایک زبردست مجسمہ "آزاد انسان" ہے جسے انہوں نے 1947ء میں مکمل کیا۔ اس عظیم تخلیق میں "سیمسن اپنی زنجیریں توڑ رہا ہے" کا موضوع نہایت فاتحانہ انداز میں اور بڑے زور شور سے پھر جنم لیتا ہے۔ ٹوٹی ہوئی زنجیریں اس کے قدموں میں پڑی ہوئی ہیں، اس کے بازو جن پر ٹوٹی ہوئی کڑیوں کے نشان ہیں فخر سے اوپر اٹھے ہوئے ہیں اور آزاد انسان مقصد کے ساتھ مستقبل میں قدم رکھ رہا ہے۔ جب 1965ء میں کونین کوف کی جوبلی سالگرہ کے سلسلے میں ان کے فن پاروں کی نمائش ہوئی تو اپنے قد و قامت کے سبب اسے لینن گراد کے روسی عجائب گھر سے ماسکو منتقل کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ یہاں یہ مجسمہ تمام نمائش پر چھا گیا۔ واقعی یہ انقلاب کی فتح کا نشان ہے۔

چھٹے عشرے میں کونین کوف نے سنگتراشی کے دو بڑے آرائشی مجموعے مکمل کئے۔ ایک ماسکو میں ارضی کیمیا کے ویرنادسکی نامی انسٹی ٹیوٹ کے لئے اور دوسرا خودمختار ریپبلک کریلیا کے دارالخلافے پیتروزاوودسک کے موسیقی اوپیرا تھیٹر کے واسطے۔ ایک لحاظ سے یہ ایک دوسرے کے متضاد کہے جاسکتے ہیں۔ پہلے مجموعے کی شبیہیں سائنس کی مثالی شکلیں ہیں جو کلاسیکی طرز میں بنائی گئی ہیں۔ دوسرا مجموعہ براہ راست ان چیزوں کی عکاسی کرتا ہے جو سنگتراش کو کریلیا کے ماحول میں ملیں۔ یہ ہیں ریپبلک کے قدرتی مناظر، لوگوں کی روزمرہ کی اور ساتھ ہی روحانی زندگی، ان کے فنون، رواج اور خواب۔ کونین کوف کریلیا کے دیہات اور قصبوں میں گھومے، انہوں نے اونیغ کے فیکٹری مزدوروں، مچھیروں اور جنگل کاٹنے والوں سے ملاقاتیں کیں، نئے اور پرانے قومی گیت سنے اور قومی تہواروں میں حصہ لیا۔ تھیٹر کے اس آرائشی شاہکار کو دیکھ کر یہی سب چیزیں ذہن میں گھومنے لگتی ہیں۔ ان کی تخلیقات میں سوویت لوگوں کے درمیان دوستی اور بھائی چارے اور سوویت سرزمین پر رہنے کی مسرت کا اظہار ملتا ہے۔ خود ان کے الفاظ میں: "فن کی عظیم یادگاری تخلیقات ہمیشہ لوگوں میں بلند جذبات اور خیالات پیدا کرتی ہیں، وہ صاف نظر آتی ہیں،

اور لوگوں کو اپنی جانب کھینچتی ہیں اور کئی نسلوں کو تربیت دیتی ہیں۔'' ان کی رائے میں عظیم فن کے بغیر، اور حسن کے احساس کے بغیر انسان کے لئے زندگی ممکن نہیں۔ فن کار کا خاص فریضہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کی روحانی دولت بڑھائے، فن کے ایسے شاہکار تخلیق کرے جو انہیں اپنے وطن کی خاطر بڑے بڑے کام کرنے کے لئے ابھاریں اور ان میں جمالیاتی ذوق پیدا کریں۔

کونین کوف نے یادگاری تخلیقات کے علاوہ بسٹ بھی بنائے ہیں۔ ان میں ہماری صدی کے سورماؤں ___ سیاست دانوں، عالموں، پنچایتی فارم کے کسانوں، ادیبوں اور فن کاروں سب ہی کے بسٹ شامل ہیں۔ ان کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ ان کے علاوہ غنائی فن پارے بھی ہیں جو معصوم بچپن اور جوانی کی تصویریں ہیں اور پچھلے زمانے کے مشہور فن کاروں اور سائنس دانوں کی شبیہیں بھی۔ ان میں یونانی محب وطن نکوس بیلویانس جنہیں سزائے موت دی گئی تھی، اور مانولیس گلیزوس کی شبیہیں ہیں جو برسوں جیلوں میں بند رہے۔ بسٹ میں وسیوولد وشنیفسکی کا چہرہ جاندار دکھائی دیتا ہے تو پیانو نواز گولڈن ویسر پُر سکون اور ہمہ تن مستغرق نظر آتے ہیں۔ مایا کوفسکی کا بسٹ ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے جن سے کونین کوف جوانی میں مل چکے تھے۔ دبلے چہرے پر گال کی ابھری ہوئی ہڈیاں، روشنی اور سائے کا تیز تقابل، چبھتی ہوئی آنکھیں اور جسم کا تناؤ ___ انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ سنگتراش نے شاعر کے سرکش اور پیچیدہ کردار کی گہرائیوں میں اتر کر اسے پتھر میں تراش دیا ہے۔ اس چھوٹے سے بسٹ میں مجاہد شاعر کی بے باک توانائی اور باعزم دلیری سموئی ہوئی ہے۔ جن تاریخی ہستیوں کے بسٹ کونین کوف نے تراشے ہیں، ان میں قابل ذکر سقراط، ڈارون، موسورگسکی، سوریکوف، دستوئیفسکی اور ھرتسن ہیں۔ یہ بسٹ گہرائی، ندرت اور فنکار کے مخصوص اسٹائل کی وجہ سے ممتاز تسلیم کئے جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں انہوں نے لکھا کہ ہر مجسمہ تراشتے وقت تصور میں وہ بھی اسی زمانے میں پہنچ گئے جس زمانے کا موضوع تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے ہیں: ''مجسمہ بناتے وقت ہمیشہ یہ سوچنا چاہئے کہ ہیرو محنت کش ہے۔''

کونین کوف کو لوگوں کی جو خوبی سب سے زیادہ پسند ہے وہ کام سے ان کی لگن ہے۔ خود وہ عمر کے آخر تک مشقت سے کام کرتے رہے۔ اکثر وہ اسمولنسک علاقے میں اپنے پیدائشی گاؤں جایا کرتے ہیں۔ اس پسماندہ علاقے میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں انہیں دیکھ کر ان کا دل باغ باغ ہو

جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک سفر کے بعد انہوں نے ''پنچائتی کسان، زوئف'' کے مجسمے بنائے۔ کسان عورت کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی ہے اور اس کا لباس ہوا میں اڑ رہا ہے۔ درخت کی جڑیں تراش کر لباس کی شکنیں دکھائی گئی ہیں۔ اس سے جو تصویر ابھرتی ہے وہ پُر مسرت زندگی اور کسان عورت کا یہ احساس ہے کہ وہ زمین کی مالک ہے۔ انسان کا عروج ___ سنگتراش کو اسی خیال نے اپنے ہم عمر کسان زوئف کا مجسمہ بنانے پر اکسایا جو امارت اور وقار کا نمونہ ہے۔

گورکی کی پوتی مارفکا کا بسٹ لبھانے والی نوجوانی کا بھرپور عکس ہے اور پڑپوتی نینوچکا کی شبیہ میں بچی کے چہرے کی بے ساختگی اور اس کے اظہار کیفیت کو بڑی کامیابی سے دکھایا گیا ہے۔

اپنے فن کی بے شمار تخلیقات میں کونین کوف کا خود کا اپنا بنایا ہوا مجسمہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ پہلے فن کار تھے جنہیں اس مجسمے کے صلے میں 1957ء میں لینن انعام ملا۔ سنگتراش کا وجدانی چہرہ جس کے دونوں طرف بالوں کی لمبی لٹیں بکھری ہوئی ہیں، ترشی ہوئی بلند پیشانی، ستواں ناک اور ان کی پُر سکون اور پُر شکوہ جمی ہوئی نظریں مجسمے کو انسان کی دانش کی طاقت اور اس کی تخلیقی قوت کا نشان بناتی ہیں۔ مجسمے میں ہاتھوں پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ یہ محنت کش کے دبلے پتلے لیکن مضبوط ہاتھ ہیں جو تمام عمر سخت اور سرکش خارا اور مرمر کی چٹانوں کو تراشتے رہے اور نرم اور فرمانبردار لکڑی کے لٹھوں کو چابکدستی سے نئی نئی شکلیں دیتے رہے۔ ان ہی ہاتھوں نے تقریباً 80 سال سے زیادہ کام کیا اور کبھی تھکنے کا نام نہیں لیا۔

اس کا اندازہ یوں لگایئے کہ 1960ء میں 86 برس کی عمر میں انہوں نے گوگول کا مجسمہ بنایا۔ اس میں ان کی بلند تخلیقی صلاحیتیں بدستور موجود ہیں۔ زندگی کے آخری دنوں میں کونین کوف نے لینن کا ایک اور مجسمہ تیار کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے فن کار یاروشینکو، سنگتراش ایرزی، فلم ڈائریکٹر الکساندر دوژینکو اور رقاصہ گالینا اولانووا کے دلچسپ بسٹ تراشے۔ کونین کوف نے لینن کے ایک اور یادگاری مجسمے اور تولستائی کے مجسمے کا خاکہ تیار کیا۔

جب بھی میں کونین کوف کے اسٹوڈیو میں داخل ہوتا ہوں میری نظر ان درجنوں مجسموں پر پڑتی ہے جو تیاری کی کسی نہ کسی منزل میں ہیں۔ اور ان سب ہی میں وہ تمام خوبیاں نظر آتی ہیں جو ان کی نوجوانی کی تخلیقات میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں لوناچارسکی کا ادھورا مجسمہ ہے تو وہاں سوریکوف کا نصف پیکر۔ ان سب کو کونین کوف کے زرخیز اور بار آور ذہن نے جنم دیا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ

نوجوانوں کو نصیحت کی: ''اپنے بازو پوری طرح پھیلا کر اڑو۔'' وہ خود بھی اسی اصول پر عمل پیرا رہے ہیں اور اپنے تخلیقی تصور کے طاقتور بازوؤں کے بل پر ہی فن کی زندگی میں انہوں نے بلند مقام حاصل کیا ہے۔

اس عظیم سنگتراش کو 90 ویں سالگرہ کے موقع پر اشترا کی محنت کے ہیرو کا اعزاز دیا گیا۔ اس طرح ملک نے فن کی ترقی میں ان کی زبردست دین پر اپنے تشکر کا اظہار کیا۔ ان کے ساتھی اور مداح بجا طور پر انہیں سوویت سنگتراشی کا دیوہیکل کہتے ہیں۔

(18 اکتوبر 1971ء کو سیرگئی کونین کوف کا انتقال ہو گیا۔)

از: کسینیا کراوچینکو

یتیمی سے صدارت تک

یادگار صادقووونا نصرالدینو، 1970ء میں سوویت یونین کی اعلیٰ سوویت کے قومیتوں کے ایوان کی صدر منتخب ہوئیں۔ لیکن اس سے پہلے ان کی زندگی میں بے شمار واقعات پیش آئے جو غمگین بھی تھے اور خوشگوار بھی۔ جہاں تک ممکن ہے انہیں میں تاریخ وار بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

واقعات کا تسلسل ہمیں اس زمانے میں لے جاتا ہے جب قومیتوں کے ایوان کی صدر تین برس کی تھیں، بلکہ اس سے بھی کچھ پہلے۔

لوگ اس بچی کو یادگار کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اور یہ لڑکے کا نام بھی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ والدین کی یاد میں دیا جاتا ہے۔ اگر آپ کسی ایسے ازبک لڑکے یا لڑکی سے ملیں جس کا نام یادگار ہو تو سمجھ لیجئے کہ وہ یتیم ہے۔ تو یہ بچی اپنے باپ کی موت کے تین مہینے بعد پیدا ہوئی تھی۔ وہ صرف بیس سال کا نوجوان تھا، خوبرو اور طاقتور۔ صادق ایک زمیندار کے کھیتوں پر کام کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے کپاس کی اکٹھی دو بھاری گانٹھیں اٹھالیں۔ اس کا پیر پھسل گیا اور وہ گھٹنے کے بل گر پڑا۔ تب اپنا پورا زور لگا کر بڑی دقت سے وہ کھڑا ہو پایا اور گانٹھیں اپنی جگہ پہنچا دیں۔ جب گھر لوٹا تو پسینے سے شرابور اپنا کرتا تک نہ اتار سکا۔ وہ وہیں ٹھنڈے فرش پر گر پڑا اور پھر کبھی نہیں اٹھا۔

اس وقت اس کی بیوہ قمرا سولہ سال کی تھی۔ اب وہ کہاں جائے؟ اپنے باپ کے پاس؟ لیکن اس کی تو چار بیویاں تھیں جن میں سے کوئی بھی سگی ماں نہ تھی۔ جب سوتیلی ماں سوتیلی بیٹی کو نہیں چاہتی تو یہ ایک مصیبت ہے اور وہاں تو اکٹھی چار مصیبتیں تھیں! قمرا کو ایک ایسا مرد مل گیا جو اسے اپنی بیوی بنانے پر راضی ہو گیا لیکن اس کی بیٹی یادگار کو ساتھ رکھنے پر تیار نہیں ہوا۔ پڑوس ہی میں ایک بے اولاد خاندان رہتا تھا۔ روایت کے مطابق اپنے بچے کی پیدائش کے واسطے خدا کو خوش کرنے کے لئے ایک یتیم کو گھر میں رکھنا چاہئے۔ چنانچہ ماں نے یادگار ان کے حوالے کر دی۔ پھر اس سے بے اولاد خاندان کی تمنا پوری ہو گئی، ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ جب انہیں یادگار کی ضرورت نہیں رہی تو انہوں نے اسے دوسرے لاولد خاندان کے سپرد کر دیا۔ اس بچی کے ساتھ یہاں بھی خوشی آئی۔ اس طرح یادگار ہر سال ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہوتی رہی۔ اور سات سال تک یہ بچی دوسروں کے ہاں خوشی لاتی رہی۔

لیکن خود یادگار لفظ ''خوشی'' سے آشنا نہ تھی، بہت سے دوسرے الفاظ کی طرح۔ اسے کون بتاتا کہ ''کتاب'' کیا شے ہے؟ وہ گیارہ برس کی تھی جب اس نے پہلی بار اپنی زندگی میں سفید صفحوں پر سیاہ نشان دیکھے۔ اور یہ بورڈنگ اسکول میں ہوا جو قوقند کے قریب ایک گاؤں کوداش میں کھلا تھا۔ یہاں تقریباً ہر چیز اس کے لئے نئی تھی۔ پہلی سالم نا ندنہ کہ روٹی کا ٹکڑا۔ پیوند بغیر اس کا پہلا لباس۔ اس کے پہلے جوتے جو کسی کے اتارن نہیں تھے، جنہیں وہ موزوں کے ساتھ پہنتی تھی۔ اور اب ان جوتوں کو کوئی آگ میں نہیں پھینک سکے گا جیسا کہ ایک بار اس کے سوتیلے باپ نے کیا تھا۔ خزاں کی ایک شام جب بارش ہو رہی تھی وہ اپنی بیمار ماں کو دیکھنے آئی تھی۔ اور اس نے اپنے بھیگے ہوئے جوتے سکھانے کے لئے چولہے پر رکھ دیئے تھے جہاں ہانڈی میں شوربا پک رہا تھا۔ سوتیلے باپ نے اسے اپنے کھانے کی توہین سمجھی، جوتوں کو آگ میں جھونک دیا اور ننگے پیر لڑکی کو سڑک پر گھر سے باہر نکال دیا۔

بعد میں اس نے یہی حرکت اس کی ماں کے ساتھ بھی کی۔ قمر اپنے دو بچوں کو ساتھ لے کر سب سے بڑی بیٹی کے پاس بورڈنگ اسکول چلی آئی۔ پھر یہ چاروں قوقند روانہ ہو گئے۔ وہاں عرصے تک انہیں جائے رہائش نہیں ملی اور بے شمار مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن مزید مصائب اور ذلتوں کو گنانے سے کیا حاصل جن کی ہماری یادگار شکار ہوئی۔ میں نے قلم اس لئے نہیں اٹھایا کہ قارئین کے دلوں میں رحم کا جذبہ پیدا کروں۔ تو جلد میں آپ کو مزدوروں کی فیکلٹی کے ایک کشادہ ہال میں لے جانا چاہتا ہوں جہاں سن رسیدہ لوگوں کے ساتھ ایک لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ لمبا ازبک لباس پہنے ہے اور اس کی رنگیلی ٹوپی کے نیچے گوندھی ہوئی چالیس سیاہ باریک چوٹیاں آویزاں ہیں۔ اس کے سر کی ہلکی سی جنبش سے یہ چالیس چوٹیاں لرزاں ہو جاتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ننھی ننھی چالیس گھنٹیاں بج رہی ہوں۔

جب یادگار کا داخلہ مزدوروں کی فیکلٹی میں ہوا تو وہ صرف تیرہ برس کی تھی۔ یہاں ایک بزرگ استاد قرا شارلی کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ وہ اس مکان کے قریب ہی رہتے تھے جہاں آخر کار قمر اور اس کے بچوں کو سر چھپانے کی جگہ مل گئی تھی۔ ایک دن سڑک پر قرا شارلی کو ایک لڑکی دکھائی دی جس کی آنکھیں ان کے خیال میں بے حد غمگین تھیں۔ جلد ہی انہیں اس کی بپتا معلوم ہو گئی۔ انہیں پتہ چلا کہ وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ لیکن جب اپنے کنبے کے پیٹ بھرنے کا

سوال ہو تو کیسے کوئی تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ قرا شارلی مزدوروں کی فیکلٹی میں ریاضیات اور طبیعیات کے ٹیچر تھے۔ وہاں طلباء کو وظیفہ ملتا تھا۔ ٹھیک ہے وہ کم تھا پھر بھی سہارا ہو سکتا تھا۔ کاش اس لڑکی کو فیکلٹی میں داخلہ مل جائے! لیکن اس نے تو صرف چار سالہ اسکول ختم کیا ہے۔ فیکلٹی میں داخلے کے لئے سات سال کی شرط ہے۔ اور اگر... لیکن قرا شارلی کا خیال پورا کرنے کے لئے آدمی کو ایک خاص کردار کا مالک ہونا چاہئے۔ بوڑھے نے سوچا کہ اس لڑکی کا کردار بالکل ایسا ہی ہے... وہ مزدوروں کی فیکلٹی کے ڈائرکٹر سے یوں ہمکلام ہوئے: ''یہاں میں دس برس سے پڑھا رہا ہوں۔ ابھی تک میں نے نہ عرضی لکھی ہے اور نہ کوئی درخواست کی ہے۔ یہ میری پہلی التجا ہے۔ آپ اس لڑکی کو اپنے تمام ضوابط کے مستثنیٰ کے طور پر قبول کر لیجئے۔ بے شک، وہ صرف تیرہ سال کی ہے اور اس نے صرف چار برس پڑھا ہے۔ لیکن اسے آپ میری بیٹی سمجھیں اور اس کی سرپرستی فرمائیں۔ ماشا اور میں اس کی ہر ممکن مدد کریں گے۔''

ماشا قرا شارلی کی اہلیہ تھیں ـــ ماریا کنستانتی نووونا۔ وہ پیٹرسبرگ میں پیدا ہوئیں اور انہوں نے لڑکیوں کے مشہور بیستوژیف کالج کے شعبہ لسانیات اور تاریخ سے ڈگری حاصل کی۔ اگرچہ مشرق میں رہتے ہوئے انہیں کئی سال گزر چکے تھے لیکن دل میں وہ پیٹرسبرگ ہی کی باسی رہیں ـــ بیستوژیف کی چیلی، اپنی نوجوانی کے زمانے کی ریت اور روایات سے وفادار۔ سخت ترین گرمی کے دنوں میں بھی وہ تنگ کالر کا سیاہ اونی لباس زیب تن کیا کرتی تھیں۔ وہ بے حد پابند انسان تھیں اور اپنے شوہر کے برعکس بہت کم گو۔ ان کے شوہر مذاق سے کہا کرتے تھے کہ اگرچہ وہ خود خشک ترین سائنسوں کے پرستار ہیں، وہ اپنی ماہر لسانیات بیوی کی خاموشی کا خلا پُر کرتے ہیں۔ ماریا کنستانتی نوونا کو دل کی سخت بیماری تھی۔ اس لئے وہ عرصے سے کام نہیں کر رہی تھیں۔ وہ شاذ و نادر گھر سے باہر نکلتیں اور اکثر بستر پر لیٹے لیٹے ہی یادگار کو سبق پڑھایا کرتی تھیں۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ انہیں اس لڑکی سے انس ہو گیا تھا جس کا کردار قرا شارلی نے بالکل صحیح بھانپا تھا۔

ہر کوئی انسان اتنا بھاری بوجھ برداشت نہیں کر سکتا ـــ دن کے وقت مزدوروں کی فیکلٹی میں آٹھویں، نویں اور دسویں جماعت کا نصاب پڑھنا اور شام کو ''گھر کی فیکلٹی'' میں پانچویں، چھٹی اور ساتویں جماعتوں کی تعلیم پوری کرنے کے لئے دو بزرگوں کا تلمذ۔ ماریا کنستانتی نوونا یادگار کو روسی زبان، ادب، تاریخ اور جغرافیہ پڑھاتی تھیں اور قرا شارلی ریاضیات، طبیعیات، کیمیا اور خاکہ کشی

میں اس کے استاد تھے۔ میاں بیوی میں ایک دلچسپ اور پوشیدہ مقابلہ سا رہتا تھا، یہاں تک کہ دونوں میں یادگار پر تھوڑی بہت رقابت بھی چلتی تھی۔ فطرتاً لڑکی احساسات کی دنیا میں ماریا کنستانتی نووونا کے زیادہ قریب تھی۔ اس سے بڑے میاں کڑھتے تھے۔ لیکن جب یادگار نے فنون کے بجائے سائنس کی جانب اپنا رجحان ظاہر کرنا شروع کیا تو وہ بڑے ہی فاتح نظر آنے لگے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک وقت یادگار ان پڑھ بالغوں کے ایک گروپ کو ازبک زبان پڑھایا کرتی تھی۔ برسبیل تذکرہ شاگردوں میں اس کی ماں قمرا بھی شامل تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب وہ مزدوروں کی فیکلٹی کے آخری سال میں پڑھتی تھی...

ہم نے صدر کی سوانح عمری کے تین اور ورق الٹے، ان کی زندگی کی تین اور بہاریں گنائیں۔ اب ہم ان کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہوتے ہیں۔ مزدوروں کی فیکلٹی طالب علموں کو تاشقند کے ریلوے انجینئرنگ انسٹی ٹیوٹ کے لئے تیار کرتی تھی۔ لیکن بہت سی لڑکیاں یہاں سے ٹیچرس ٹریننگ اور میڈیکل کالج میں بھی جاتی تھیں۔ یادگار کا ان دونوں پیشوں کی طرف کوئی میلان نہیں تھا۔ وہ تو صرف انجینئر بننا چاہتی تھی۔ شروع میں وہ نقل و حمل استعمال کرنے کی فیکلٹی میں شامل ہوئی جہاں ریلوے لائن کے نگرانوں اور اسٹیشن ماسٹروں کی ٹریننگ ہوتی تھی۔ ریلوے تعمیر کرنے والے طلباء ان لوگوں پر ''لال ٹوپی'' کی پھبتی کسا کرتے تھے۔ لیکن لال ٹوپی کی پھبتی سے وہ پریشان نہیں ہوتی تھی۔ اسے تو بس یہ فکر تھی کہ وہ انجینئرنگ کا گہرائی سے مطالعہ کرے۔ دوسری فیکلٹی سے فارغ ہو کر آدمی سول انجینئر بن سکتا تھا، ڈیزائن ساز یا ریلوے لائن تعمیر کرنے والا۔ وہاں تعلیم حاصل کرنا بہت مشکل تھا اس لئے کہ مادوں کی مزاحمت، سکونیات عمارت، میکنکس، ارض پیمائی ___ یہ تمام پیچیدہ مضامین وہاں پڑھائے جاتے تھے۔ اور نقشہ نویسی بے حد زیادہ... یہ بات کسی اور کے دل میں خوف بٹھا سکتی تھی۔ لیکن ان سب چیزوں کا تعلق بہر حال علم ریاضیات اور حساب کتاب سے ہی تھا اور یہی دونوں مضامین یادگار کو دل سے پسند تھے۔ چنانچہ اس نے طے کر لیا کہ وہ سول انجینئر بنے گی۔ وہاں لڑکیاں کم تھیں۔ اور یادگار ان میں پہلی ازبک لڑکی تھی۔

پیشے کا انتخاب بہت موزوں رہا! 1930ء اور 1940ء کے درمیان کی بات ہے جب ہر طرف تعمیری کاموں کی دھوم دھام تھی۔ جدھر دیکھو کچھ نہ کچھ بن رہا تھا۔ خود انسٹی ٹیوٹ بھی ابھی

زیرِ تعمیر تھا__ پڑھائی کا نیا بلاک اور ہوسٹل بننا باقی تھے۔ اس کے پتھر چننے والے، پلاسٹر چڑھانے والے، رنگ ساز سب کے سب طلباء تھے۔ اس کی روحِ رواں یہی سول انجینئرنگ والی فیکلٹی تھی جس میں یادگار ابھی تعلیم پا رہی تھی۔ کورس کے تمام طالب علم ہوسٹل کی نیو کھودنے میں، بنیاد ڈالنے میں، دیواریں اٹھانے میں جٹے ہوئے تھے۔ کیا لطف کی بات ہے کہ آدمی ایسے کمرے میں رہے جس کی دیواریں خود اس کے ہاتھوں نے چنی ہوں۔

اس کے کمرے میں چار لڑکیاں رہتی تھیں__ یادگار، ولیدہ عین الدینووا، انیوتا کریونچوک اور نتاشا ژوراولیوا۔ ماریا کنستانتی نووناً نے جو کچھ پڑھایا تھا وہ رائیگاں نہیں گیا۔ یادگار اچھی خاصی روسی جانتی تھی۔ لیکن اس کی ساتھ والیاں روسی بول چال میں اس سے بہت تیز تھیں۔ وہ بہت سی باتیں نہیں سمجھ سکتی تھی۔ ولیدہ تاتاری باپ اور روسی ماں کی بیٹی جو ازبکستان میں پیدا ہوئی تھی اس کے لئے ترجمان کا کام کرتی تھی۔ جب کوئی بات یادگار کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ اکثر پوچھ لیا کرتی تھی: ''ولیدہ نیمادیدی!'' یعنی ولیدہ تم بتاؤ، انہوں نے کیا کہا۔ یہ تینوں لفظ وہ اتنی تیزی سے بولتی تھی کہ ''ولیدہ نیمادیدی'' ایک لفظ معلوم ہوتا تھا۔ اسی لئے سکھی سہیلیوں نے اس کا نام ہی ''ولیدہ نیمادیدی'' رکھ دیا تھا۔ اور یہ نام اتنا مشہور ہوا کہ پورے انسٹی ٹیوٹ میں پھیل گیا۔

ایک دن ٹیلی فون پر ادھر سے کسی کی ہنستی کھلکھلاتی آواز آئی: ''ولیدہ نیمادیدی، سلام۔'' یادگار فوراً پہچان گئی کہ یہ آواز کس کی ہے اور چلائی ''انیوتا!'' انیوتا کریونچوک اپنے اسٹیشن کے کسی سرکاری کام سے تاشقند کے ریلوے دفتر آئی ہوئی تھی۔ دونوں سہیلیوں نے شام پرانی یادوں میں ڈوب کر گزاری۔ یادگار نے میز کی نچلی دراز کھولی۔ پھر دونوں نے مل کر طالب علمی کے زمانے کے نوٹس، نقشے، مزاحمتی مادوں کا حساب کتاب، ٹریڈ یونین کے کاغذات، لیکچروں کے وقت لکھے ہوئے ذاتی نوٹ، کھیل کود کے سرٹیفکیٹ اور بیج وغیرہ غرض کہ یہ انگڑ کھنگڑ پھر سے آنکھوں کے سامنے سجایا۔ اس میں انہوں نے ایک چھوٹا سا نیلا بیج بھی دیکھا جس پر تین حروف کھدے ہوئے تھے: ب۔ف۔ک۔ انیوتا دیکھتے ہی پکاری ''میرے پاس بھی ایسا ہی ہے۔''

ب۔ف۔ک... یعنی بڑی فرغنہ کنال! یہ بیج ان سب لوگوں کو دیا جاتا تھا جو 45 دنوں کے ''حشر'' میں شریک ہوتے تھے۔ لفظ حشر کا مترادف روسی زبان میں نہیں ہے۔ ایک طرح اس کا مطلب یہ ہے کہ سب لوگ مل کر کسی محنت کے کام میں جٹ جائیں۔ پرانے زمانے میں جب کبھی

اس قسم کی مہم آن پڑتی تھی، جیسے نہر کھودنا ہے، سڑک بنانا ہے تو سب ازبک لوگ اس کے لئے نکل پڑتے تھے۔ لیکن وادی فرغنہ میں ابھی تک ایسا کوئی حشر نہیں ہوا تھا۔ دو لاکھ آدمیوں نے ایک ساتھ کدال اٹھائے اور پھر زمین میں گاڑ دیئے۔ ڈیڑھ مہینے کے اندر وادی میں 270 کلومیٹر تک نہر کا پاٹ بن گیا۔ اور اس پر دریا رواں ہو گیا تاکہ دشت و بیاباں کی پیاس بجھائی جائے... ان دو لاکھ لوگوں میں مزدور بھی تھے اور طالب علم بھی۔ ان میں تھے سطح پیما، فورمین، کام کے نگران۔ زمین کا وہ چپہ جہاں یادگار نے سطح پیمائی کا کام کیا تھا قوقند کے بالکل نزدیک تھا، یعنی اس کے آبائی وطن کے نزدیک۔ ایک بار یہاں ایک بوڑھا ازبک لباس پہنے، بھاری بھرکم، اونچے قد کا شخص آیا۔ سر پر فرغنہ کی سیاہ و سفید کارچوبی ٹوپی مڑھی ہوئی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک کام کرنے والوں پر نظر گاڑے ہوئے ایک طرف کھڑا دیکھتا رہا۔ یادگار نے جو نظر اٹھائی تو کیا دیکھتی ہے کہ بڑے میاں نے خود بھی کدال اٹھا لیا اور دوسروں کے ساتھ کام میں لگ گئے۔ انداز صاف بتا رہے تھے کہ اس کے ہاتھ کدال کے عادی ہیں۔ یہ تھے یولداش اخون بابائیف، ریپبلک کے صدر۔ یادگار کو ان کی زندگی جو کتابوں میں لکھی جا چکی تھی معلوم تھی۔ یہ شخص کبھی کھیت مزدور تھا، خانہ جنگی کا سورما، بسماچیوں کے لئے قہر۔ بھلا کبھی یادگار یہ خیال بھی کر سکتی تھی کہ ایک دن وہ خود ان کی جگہ لے گی اور 20 برس بعد ریپبلک کی صدر کی حیثیت سے تاشقند میں اخون بابائیف کے مجسمے کی نقاب کشائی کرے گی جنہیں لوگ محبت اور احترام سے ''اشرف الاشرف'' کہتے تھے۔

مگر ابھی صدارت کی کرسی دور تھی۔ ابھی تو وہ قطعہ کورغان کے مصنوعی تالاب کی تعمیر کے ایک شعبہ کی افسر اعلیٰ تھی۔ دوسری بار پھر وہ وقت آیا جب طالب علموں کو اپنا اپنا تعلیمی سلسلہ چھوڑ کر جائے تعمیر پر آنا پڑا۔ اور اس بار ڈیڑھ مہینے کے لئے نہیں بلکہ چھ مہینے کے لئے۔ کیا اس سے تعلیمی نتائج پر اثر نہیں پڑے گا؟ یقینی پڑے گا، لیکن بہتر معنوں میں۔ کلاس روم میں بیٹھ کر سکونیات عمارت پر لیکچر سننا ایک بات ہے اور تعمیری ٹھکانوں پر ان سکونیات سے جدوجہد کرنا دوسری بات۔

قطعہ کورغان روانہ ہونے سے پہلے ان طالب علموں کو کمیونسٹ پارٹی کے شہری کمیٹی کے دفتر بلایا گیا۔ وہاں کسی ذمے دار رفیق کو ان سے گفتگو کرنی تھی۔ یادگار اس سے ڈری ہوئی تھی۔ عین ممکن ہے کہ اس کی شخصیت دیکھ کر وہاں یہ خیال کیا جائے کہ ابھی وہ بچی ہے اور سر فہرست سے اس کا نام کاٹ دیا جائے۔ جب پارٹی کمیٹی کے ذمے دار کا مرید سفر پر روانہ ہونے والوں کو

ہدایات دے رہے تھے تو سارے وقت وہ کنکھیوں سے اس لڑکی کو دیکھتے رہے۔ انہوں نے انسٹی ٹیوٹ کی پارٹی کمیٹی کے سکریٹری سے کچھ کانا پھوسی کی۔ اور سکریٹری نے بھی سرگوشی ہی میں جواب دیا۔ لیکن یادگار کے کانوں میں بھنک پڑ گئی: ''ہاں، ہے تو چھوٹی سی ہاتھ بھر کی... مگر کام چلا لے گی۔'' ظاہر ہے کہ یہ جملہ خود اسی کے بارے میں کہا گیا تھا۔ حاضرین میں سب سے چھوٹی وہی تھی، ہاتھ بھر کی۔ پھر شہری کمیٹی کے رفیق نے اس کے ذاتی کاغذات اٹھائے، اس کی سوانح دیر تک پڑھتے رہے۔

چند برس بعد قسمت ان دونوں کو ایک دوسرے سے ملائے گی۔ وہ ملیں گے اور محبت کرنے لگیں گے __ یادگار اور سراج۔

یہاں سے ہم پھر واقعات کی رفتار کے ساتھ چلتے ہیں اور قطعہ کورغان کی طرف واپس آتے ہیں۔ یہاں تعمیر کا کام چل رہا تھا۔ لیکن ایک گرہ پڑ گئی __ تعمیر کے ایک شعبہ کی انچارج اور چیف انجینئر میں اختلاف کی صورت پیدا ہو گئی۔ بظاہر سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ چیف انجینئر بڑے مزے سے اپنی ڈگر پر چلا جا رہا تھا، یعنی وہ انچارج یادگار کو برابر نظر انداز کر رہا تھا __ اسے اس چھوٹی سی لڑکی سے کوئی کد نہیں تھی مگر وہ اسے انجینئر کیسے مان لے؟ وہ خود ہزاروں کلومیٹر کی سڑکیں اب تک بنوا چکا تھا۔ لیکن اس کل کی چھوکری کے پاس کیا ہے؟ چالیس چوٹیاں۔ ان لوگوں کو مصنوعی تالاب کے چاروں طرف ایک راستہ بنانا تھا۔ ریلوے لائن دو ڈھلانوں کے درمیان گذرتی تھی۔ ڈھلان کا ڈیزائن کس قسم کا ہونا چاہئے؟ انچارج نے تیز ڈھلان کا ڈیزائن تجویز کیا۔ زمین اس کے لئے موزوں تھی، وہ کافی سخت تھی۔ چیف انجینئر بے خیالی سے اس کی دلیلیں سنتا رہا اور پھر فوراً ہی اپنا نمونہ پیش کیا جو ہلکی ڈھلان والا تھا۔ اس کے لئے بلا سے اگر زمین زیادہ کھودنا پڑے، زیادہ محنت اور پیسہ صرف ہو مگر اس کی رائے میں، کام زیادہ قابل بھروسہ ہوگا۔ یادگار نے مٹی کے کئی نمونے آزمائے، کئی بار حساب کتاب جوڑا اور بہت سے لوگوں سے مشورہ لیا جن میں ماہرین ریلوے لائن، ارض پیما، عالم ارضیات سب ہی شامل تھے۔ آخر کار اس ٹکنیکی بحث میں وہ اس بزرگ لیکن ضدی انجینئر سے بازی جیت گئی۔ لیکن اس بات پر وہ یادگار سے ناراض نہیں ہوا بلکہ اس ہاتھ بھر کی چھوکری کا کردار اسے اور بھی اچھا معلوم ہونے لگا۔

ابھی تک اس نے انجینئرنگ کا ڈپلومہ حاصل نہیں کیا تھا لیکن اس کام میں اس کا تجربہ بڑھ

رہا تھا۔ قطعہ کورغان کے بعد انگرین کی باری آئی۔ یہاں شروع ہی سے پورا تعمیری علاقہ اس کی نگرانی میں تھا۔ چرچکس کی دلدل میں سے ایک بہت کٹھن راستہ پاٹنا تھا... یہ لیجئے ڈپلومہ بھی مل گیا اور کام بھی ــــ تاشقند ریلوے پر لائن کی مرمت کرنے والے انجینئر کا کام۔

اس کے فوراً ہی بعد ان کی زندگی میں تیز موڑ آیا۔ پہلے انہیں محلے کی نوجوان کمیونسٹ لیگ کی کانفرنس کے لئے چنا گیا۔ محلے نے شہری کانفرنس کے لئے منتخب کیا۔ اور شہر نے پورے علاقے کے لئے۔ پھر علاقے سے ریپبلک کی کانگرس کے لئے ڈیلی گیٹ مقرر ہوئیں۔ ریپبلک کی کانگرس نے انہیں مرکزی کمیٹی میں بھیج دیا۔ اور مرکزی کمیٹی کے اجلاس نے انہیں اسکولوں کا سکریٹری بنا دیا۔

جنگ چھڑے ابھی پہلی بہار تھی۔ یوکرین سے، وسط روس سے، بالٹک کے ساحلی علاقوں سے دھڑا دھڑ لڑکوں لڑکیوں کے جتھے تاشقند آنے لگے۔ شہر میں نوجوان کمیونسٹ لیگ کے ممبروں کے چندے سے یتیم خانہ کھولا گیا تھا اور اسے ازبک نوجوان کمیونسٹ لیگ کا نام دیا گیا تھا۔ جو کمیشن بچوں کو اپنے ذمے لے کر اس یتیم خانے میں بھیجتا تھا، یادگار اس کی صدر تھیں۔ آج بھی وہ اس کی نگراں کمیٹی کی چیئرمین ہیں... کچھ عرصہ ہوا جب ماسکو میں ازبک فنون کا دس روزہ جشن منایا گیا تھا تو یادگار نے ریپبلک کی صدر کی حیثیت سے نمایاں فن کاروں کو اعزازی تمغے تقسیم کئے۔ ان میں ایک نوجوان خاتون تمارا یونسووا بھی تھیں جنہیں لوک ناچ پیش کرنے میں خاص شہرت حاصل ہے۔ بھرے ہوئے حال میں حاضرین نے دیکھا کہ یادگار نصر الدینووا نے اس عوامی رقاصہ کو گلے لگالیا۔ لیکن کسی کے کانوں تک ان کے یہ الفاظ نہ پہنچے: "پیاری تمارا، تجھے مبارک ہو..." جب یہ تار ملا کہ علاقے کی پارٹی کمیٹی کے سابق سکریٹری یونسوف محاذ جنگ پر کام آئے تو اس وقت یتیم خانے میں تمام جگہیں 65 بچوں سے بھری ہوئی تھیں۔ تار ملتے ہی ان کی بیٹی تمارا کے لئے جگہ نکال لی گئی۔ اس کا 66 واں نمبر تھا۔

ایک روز یتیم خانے کی ڈائرکٹر انتونینا پاولووناخلیبشکینا نے فون کیا۔ یہ وہی خاتون تھیں جو کبھی نوجوان کمیونسٹ لیگ میں ساتھ کام کر چکی تھیں۔ وہ فون پر بولیں: "یادگار، یاد ہے تمہیں ویتالی لیونوف ــــ گلیبسکی؟" جنگ کے دنوں میں اس لڑکے کو مرکزی کمیٹی میں ایک کرنل گلیبسکی لے کر آئے تھے۔ لڑکے کا نام تھا لیونوف۔ کرنل نے اس لاوارث بچے کو ضلع لینن گراد کے ایک ایسے گاؤں میں پایا تھا جسے جرمنوں سے آزاد کرایا جا چکا تھا۔ اس کے باپ کو جو دیہی پنچایت کا

صدر تھا، نازیوں نے پھانسی پر چڑھا دیا تھا اور ماں لاپتہ تھی۔ کرنل نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا اور بہت سی لڑائیوں میں اپنے ساتھ لئے لئے پھرا۔ اب یہ کرنل گلیپسکی مزید ٹریننگ کے لئے تاشقند آئے ہوئے تھے اور ہوسٹل میں ٹھہرے تھے۔ ان کا کوئی کنبہ نہیں تھا۔ انہوں نے درخواست کی کہ گود لئے ہوئے اس لڑکے کو وقتی طور پر یتیم خانے میں جگہ دی جائے۔ لڑکے کو سپرد کر کے کرنل پھر محاذ جنگ پر چلے گئے اور وارسا کے نزدیک کام آئے... خلیپشکینا نے کہا: ''ویتالی نے خط لکھا ہے اور حسب معمول اس بار بھی خط منظوم ہے، اگر چہ وہ میجر ہو گیا ہے۔ لڑکپن سے ہی اس کی فطرت میں شاعری تھی۔''

یادگار کی نوجوان کمیونسٹ لیگ کی زندگی بڑی ہی شاندار تھی۔ وہ دن بھر مدرسوں میں، پائنیر دستوں میں، پیشہ ورانہ اسکولوں میں، بچوں کے ٹیکنیکل مرکزوں میں اور بچوں کے آرٹ گھروں میں گھومتی پھرتی تھیں۔ ایک بار انہیں نوجوان کمیونسٹ لیگ کے بیورو میں پہنچنے کی جلدی تھی، دیر ہو گئی تھی اور ان کے خیال میں ٹرام بالکل رینگ رہی تھی۔ گرمی کے دن تھے، ہوا بند تھی۔ انہوں نے کھڑکی کھولی اور اپنا سر باہر نکال لیا۔ اتنے میں برابر سے گزرتے ہوئے ایک لڑکے نے ان کی ٹوپی جھپٹ لی۔ وہ فوراً ہی چلتی ٹرام سے اس کے پیچھے کود گئیں۔ لڑکا جھپٹ کر چلا۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ جس شخص سے وہ بھڑ رہا ہے وہ 1500 کلومیٹر کی دوڑ میں ریپبلک کا انعام جیت چکی ہے۔ لڑکا بھی دوڑ میں بہت تیز تھا۔ شائد وہ بھی چمپئن رہ چکا تھا۔ پہلے تو دونوں سڑک پر تیز تیز چلے، پھر لڑکا گلی میں مڑا اور سبزیوں کے باغیچے کی طرف دوڑ لیا۔ لڑکی بھی تیزی سے آ رہی تھی۔ دونوں کے درمیان فاصلہ کم رہ گیا۔ اب ظاہر تھا کہ لڑکی اسے جا پکڑنے والی ہے۔ لونڈے نے ایک چال چلی۔ اس نے ٹوپی ایک طرف دور کو پھینکی مگر یادگار جو پیچھے لپکی چلی آ رہی تھیں انہوں نے ٹوپی کی جانب توجہ ہی نہیں کی۔ وہ تو ہر قیمت پر اس نالائق کو پکڑنے کی فکر میں تھیں۔ آخر کار جھپٹ کر انہوں نے اس کا گریبان تھام لیا اور ایک تھپڑ جما دیا۔ اب ان کا سارا غصہ کافور ہو چکا تھا۔ پھر دونوں ٹرام اسٹاپ کی طرف صلح و آشتی سے باتیں کرتے ہوئے چلنے لگے۔ یادگار نے اس سے معلوم کیا کہ وہ کس اسکول میں پڑھتا ہے۔ اور ٹرام اسٹاپ آتے آتے اتنی ساری باتیں اس کے بارے میں معلوم کر لیں جو شائد کسی تفتیش سے بھی نہ کھلتیں۔ ویسے عقل کی روشنی میں دیکھئے تو نوجوان کمیونسٹ لیگ کی مرکزی کمیٹی کی سکریٹری کو اس طرح سڑک پر لڑکوں کا تعاقب کرنا زیب

نہیں دیتا۔خود یادگار کو بھی اس کا احساس تھا کہ وہ بے تکی سی سکریٹری ہیں۔

بعد میں جب انہیں وزارت میں شامل کیا گیا تب بھی وہ پہلے کے وزیروں سے کچھ مختلف ہی نکلیں۔ پہلے کے وزیر دفتر آتے اور آرام سے اپنی کرسیوں پر بیٹھ جایا کرتے تھے۔مگر جب یادگار کو کمیونسٹ پارٹی کی علاقائی کمیٹی کے اول سکریٹری کے عہدے کے فوراً بعد تعمیری سامان کی صنعت کا وزیر مقرر کیا گیا تو وہ کہیں تیسرے مہینے اپنے دفتر میں آئیں۔دو مہینے انہوں نے سیمنٹ، اینٹ اور شیشے کے کارخانوں کے چکر لگا کر گزار دیئے...

ریپلک کی مجلس وزارت کی نائب وزیر اعظم کی حیثیت سے تعمیر کی نگران، ٹرانسپورٹ کے سارے شعبوں اور رسل و رسائل کی انچارج کے فرائض پورے کرنے میں یادگار نے اپنی زندگی کے سات سال گزار دیئے۔اگر ان برسوں کی تفصیل لکھی جائے تو ان تمام تعمیری اداروں کا ذکر کرنا ہوگا جو اس عرصے میں ریپلک میں انجام پائے__ بڑے طاقتور بجلی گھر، مثلاً کیراک قوم یا انگرین کے بجلی گھر، نئے کارخانے جیسے کہ چرچک میں دھاتوں کے تحت مرکبوں کا کارخانہ، سمرقند میں سیر فا سفیٹ کا کارخانہ، نئی سڑکیں، فضائی اڈے، گیس پائپ لائنیں، سوویت مشرق میں پہلا ایٹمی ری ایکٹر، تاشقند میں پہلا زبردست ٹیلی ویژن سنٹر اور عالیشان اسٹیڈیم "پختہ کور"۔انہیں کے زمانے میں رہائشی مکانوں کی تعمیر بڑے پیمانے پر ہوئی۔

ان سب مرحلوں سے گزر کر یادگار صادقووناً نصر الدینووا ازبک ریپلک کی کرسی صدارت پر بیٹھیں۔

وسط اکتوبر کے اس زمانے میں جب ریپلک اپنا کپاس چننے کا سالانہ منصوبہ پورا کر رہی تھی اور صرف ایک فیصلہ کن قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ سال میں تیس لاکھ ٹن کپاس کا ریکارڈ ٹوٹے، ایسے وقت کام کے ہجوم میں میں نے ریپلک کی صدر کو دیکھا ہے۔ایک نظر ہی میں محسوس کیا جا سکتا تھا کہ ساری ریپلک اور اس کی ساری آبادی اس زبردست کارنامے کو انجام دینے کے لئے کتنا زور لگائے ہوئے تھی۔ یادگار ان دنوں ایک ایک کھیت کا چکر لگاتی تھیں۔خوارزم کی قدیم ترین سرزمین کو بھی ان کے پیروں نے چھوا جو اس بار لوگوں کو ایسی بھرپور فصل دے رہی تھی جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔

میں نے ریپلک کی صدر کو اس کنبے کے بیچ میں بھی دیکھا جہاں مجھے زلفیہ کا انٹرویو لینے کا

موقع ملا تھا۔ امریکی اخباروں نے اس نو سالہ زلفیہ کو ''نجات یافتہ'' کا لقب دیا۔ امریکی نامہ نگاروں نے جبر دی کہ ماں چاہتی تھی بیٹی اسکول ٹیچر بنے لیکن اس کے برعکس بیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ بیلے رقاصہ بنے گی۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ زلفیہ بڑے پکے ارادے کی لڑکی نکلی، چھٹی کلاس کے طالب علم اپنے بڑے بھائی بختیار کے برخلاف وہ اپنے منصوبے پر قائم رہی۔ بختیار نے مختلف پیشوں میں جانے کے ارادے بار بار بدلے اور اپنے مستقبل کے لئے کوئی ٹھوس فیصلہ نہ کر پایا۔

میں نے ریپبلک کی صدر کو ایک پنچایتی فارم کے چیئرمین اسماعیل سرمانوف کے ساتھ بات چیت کرتے دیکھا۔ یہ صاحب فارم ''یانگی حیات'' (حیات نو) کے چیئرمین ہیں۔ وہ وسط فرغانہ سے آئے ہوئے تھے جہاں زمینیں کچھ عرصہ پہلے بے کاشت پڑی ہوئی تھیں اور جنہیں آج کل زیر کاشت لایا جا رہا تھا۔ نئی زمینوں کو توڑنے کے لئے عام طور سے حکومت رقم لگاتی ہے۔ لیکن مرکزی فرغنہ میں اس خرچ کا آدھا حصہ پنچایتی فارموں نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ دو لاکھ ہیکٹر زمین کاشت کے لئے تیار کرنی تھی۔ کئی پنچایتی فارموں کو ملا کر ایک کونسل بنائی گئی تھی، خاص ان ہی کاموں کی نگرانی کے لئے۔ اور اس کونسل کا چیئرمین ریپبلک کی صدر کو چنا گیا تھا... وہ اسماعیل سرمانوف کو اچھی طرح جانتی تھیں۔ کئی باران کے فارم ''یانگی حیات'' بھی جا چکی تھیں۔ یہ صاحب نئی زمینیں توڑنے میں پیش رو تھے۔ تین سال سے وہیں رہتے تھے، اور مزے میں رہتے تھے۔ اس دن جب ان سے میری ملاقات ہوئی وہ ایک نازک مسئلے پر بات کرنے کے لئے صدر کے پاس آئے تھے، ایک چھوٹی سی دشواری پیش تھی۔ پنچایتی فارم سے دو بہت ہی ہونہار لڑکوں کو میڈیکل کالج میں تعلیم دینے بھیجا گیا تھا تاکہ فارم کے پاس اپنے ڈاکٹر ہوں۔ جو نوجوان باہر سے آتے تھے وہ زیادہ دنوں نہیں ٹھہرتے تھے اس لئے کہ انہیں یہاں کی آب و ہوا پسند نہیں ہوتی تھی۔ ان میں سے چار جا چکے تھے۔ لیکن یہ دو لڑکے بھاگنے والے نہیں تھے، یہ تو اپنے لوگ تھے۔ تاہم ایک مشکل یہ آن پڑی کہ وہ داخلے کے امتحان میں ایک ایک مضمون میں فیل ہو گئے۔ اب کیا کیا جائے؟ وہ پھر سے امتحان دیں؟ اسی مسئلے کو حل کرنے کے لئے فارم کے چیئرمین ریپبلک کی صدر سے ملنے آئے تھے۔ بستی میں آبادی بڑھ رہی تھی، ڈاکٹروں کی ضرورت تھی۔ اس سال 71 بچے پیدا ہوئے تھے... یادگار نے پوچھا ''حیاتوئے کا کیا حال ہے؟'' فارم کے چیئرمین نے یہ سنا تو مسکرا دیئے۔ یہ ان کی بیٹی تھی۔ دس برس کی ازدواجی زندگی میں ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی

تھی۔ لیکن نئی زمینوں پر آتے ہی ایک بچی پیدا ہوئی اور فارم کے نام کی مناسبت سے اس کا نام حیا توے رکھ دیا گیا۔ لڑکی کا یہ نام کیا برا ہے!

میں نے صدر کو رپبلک کی پارلیمنٹ کے دوران اجلاس کی ڈائس پر بھی دیکھا۔ اجلاس کا ماحول جشن کا سا اور سنجیدہ تھا۔ یہاں ایک خاص مسئلہ درپیش تھا کہ پچاس ہزار ہیکٹر سے زیادہ زمین رپبلک ازبکستان کے علاقے سے نکال کر پڑوسی تاجکستان کو دی جائے۔ قوموں کے درمیان دوستی کی یہ کتنی حسین مثال تھی! اور اس مسئلہ پر رپبلک کی صدر کو تقریر کرنا تھی۔ وہ ڈائس پر سیاہ لباس میں ملبوس، سیدھی مانگ نکالے ہوئے ڈائس پر کھڑی ہوئیں۔ میں نے ان پر نظر ڈالی۔ پھر تصور میں ایسا دکھائی دیا کہ ایک دبلی پتلی لڑکی سامنے کھڑی ہوئی ہے، وہ لمبا ازبک لباس پہنے ہے اور اس کی رنگیلی ٹوپی کے نیچے چالیس باریک چوٹیاں جھانک رہی ہیں، چالیس ننھی ننھی گھنٹیاں...

از: اے۔ استارکوف

ایک سو ایجادوں کا مالک

(1)

شہر کی سڑکوں پر حسب معمول بھیڑ بھاڑ تھی۔ الکسیٔ مالینکن جب اپنے کارخانے آ رہے تھے تو اتفاقاً ان کی مٹھ بھیڑ بچپن کے ایک دوست سے ہوگئی۔

''ارے الکسیٔ! کہو کیا حال ہیں؟'' دوست نے اپنے اسکول کے پرانے ساتھی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا جو اب بھی اسی طرح دبلا پتلا اور چھوٹے سے قد کا تھا۔ ''کہاں رہتے ہو؟ کیا کام کر رہے ہو؟ ان برسوں میں جو گزری سب بتاؤ۔''

الکسیٔ نے مختصر جواب دیا:

''بلب کے کارخانے میں کام کرتا ہوں۔ خاصے تیس برس ہوگئے ہیں۔''

''اچھا، یہ تو بتاؤ پوزیشن کیا ہے؟''

''معمولی۔ مستری ہوں۔ مجھے اپنا کام پسند ہے، اچھا ہے اور دلچسپ بھی۔''

الکسیٔ مالینکن نے دیکھا کہ ان کے دوست نے جھینپ کر گردن جھکا لی گویا زبان سے کوئی بے تکا سوال نکل گیا ہو۔ پھر وہ بولا:

''ہاں، ٹھیک ہے بھائی۔ آخر مزدوروں کی بھی تو ضرورت ہے۔ کام زیادہ سخت تو نہیں ہے؟''

دوست کے اس جملے سے الکسیٔ کو کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ انہوں نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا:

''آسان بھی نہیں ہے۔ لیکن مجھے شکایت بھی نہیں ہے۔''

دوست تمام گفتگو کے دوران الکسیٔ کی باتوں پر دھیان دیئے بغیر اقرار میں سر ہلاتا رہا۔ پھر وہ رخصت ہونے کے لئے تیار ہوا اور مالینکن سے ہاتھ ملاتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں کہنے لگا:

''ہاں، زندگی بھی عجیب مذاق ہے۔ اچھا تو پھر ملاقات رہے گی۔''

الکسیٔ مالینکن نے اسے خدا حافظ کہا اور کارخانے پہنچنے تک سارے راستے سوچتے رہے۔ بچپن کے دوست سے اتفاقیہ ملاقات کے بعد آدمی کا دماغ ضرور کام کرنے لگتا ہے۔ وہ بیتے ہوئے دن یاد کرتا ہے ___ پہلے وہ کیسا تھا، اس زمانے میں وہ کن باتوں کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ پھر وہ ان کا حال کی حقیقتوں سے مقابلہ کرتا ہے، ان چیزوں سے جو اسے حاصل ہو چکی ہیں۔ اور

سوچتا ہے کہ کیا اس نے کوئی غلطی کی اور اگر دوسرا فیصلہ کیا ہوتا تو کیا اس کی حالت مختلف ہوتی؟
مالینکن اب اس سڑک پر تھے جو انہیں کارخانے لے جاتی تھی۔ اس کا انتخاب خود انہوں نے کیا تھا۔ دوست سے ملنے کے بعد اب اس سوال کا جواب دینا ضروری ہو گیا تھا__ کیا انہوں نے صحیح راستہ اختیار کیا؟

ادھیڑ عمر کا وہ شخص بظاہر خوشحال معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے کے پرانے مانوس خدوخال الکسئی کے ذہن میں اس طرح ابھر رہے تھے جیسے کسی دھندلے آئینے میں صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ اس شخص نے مجھے بدنصیب سمجھا۔ اس نے مجھ پر ترس کھایا... لیکن مالینکن اس پر غصے نہیں ہوئے۔ انہوں نے سوچا کہ بعض لوگ پوزیشن اور تنخواہ کو، خطاب اور ڈگری کو، اعزاز اور ڈپلومے کو ہی کامیابی تصور کرتے ہیں۔ مالینکن ان چیزوں کے خلاف نہیں تھے لیکن انہیں سب سے زیادہ اہم بھی نہیں سمجھتے تھے۔ اگر اس کے دوست کو معلوم ہوتا کہ اوورکوٹ کے نیچے ان کے سینے پر اشتراکی محنت کے ہیرو کا سنہری تمغہ لٹک رہا ہے تو یقینی وہ اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو جاتا۔ مالینکن کو اپنے تمغے پر فخر تھا لیکن صرف اسی کو وہ زندگی کا مقصد نہیں سمجھتے تھے۔ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس سوال پر وہ پہلے ہی کئی بار سوچ چکے تھے۔ اور اب دوست سے اچانک ملنے کے بعد وہ اس پر اور بھی زیادہ سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔

(2)

یہ سب کیسے شروع ہوا؟
الکسئی ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ ایک روز وہ غیر معمولی ماچس کی ڈبیہ اسکول لائے۔ اس میں سے موسیقی اور اناؤنسر کی آواز نکلتی تھی!
اپنے دوستوں کو انہوں نے بتایا کہ یہ "ٹرانسسٹر" ہے۔
طبیعیات کے ٹیچر دیر تک ڈبیہ کا معائنہ کرتے رہے__ کبھی اس کے اندر جھانکتے، کبھی اسے کان سے لگاتے۔ پھر انہوں نے دلچسپی سے پوچھا:
"خود بنایا ہے اسے؟"
الکسئی شرما گیا اور مثبت میں سر ہلا دیا۔

''ہونہار معلوم ہوتا ہے تو۔ ہاتھ بھی ہنر مند ہیں۔''

الکسئی جب بھی اس ڈبیہ کو دیکھتے خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ جب وہ یاد کرتے کہ حلقے بنانے میں، چھوٹے چھوٹے پرزے جوڑنے میں اور باریک تاروں کو جھالنے میں انہوں نے کتنی شامیں گزاریں تب کہیں جا کر یہ ''ٹرانسسٹر'' بنا تو وہ اور بھی زیادہ خوش ہوتے تھے۔

اس واقعہ کو ایک زمانہ گزر گیا۔ الکسئی مالینکن حرفتی اسکول ختم کرنے کے بعد اچھے ہنر مند مزدور بن گئے۔ انہیں اپنے کام سے دلچسپی تھی اور اسے اچھی طرح پورا کرتے تھے۔ کئی سال بیت گئے۔ اور وہ مستری ہی رہے۔ لیکن کام میں ان کی مہارت بڑھتی گئی اور آہستہ آہستہ ان کے تجربے اور تکنیکی ہنر میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ سب مستقبل میں کئی اہم باتوں میں ان کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔

... ابتدائی پانچ سالہ منصوبوں کا دور آیا اور ختم ہو گیا۔ پھر پارٹی نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ تکنیک اور انجینئرنگ پر عبور حاصل کریں اور اسے پوری طرح استعمال کریں۔ الکسئی مالینکن نے فوراً اس اپیل پر لبیک کہا۔ ایک روز وہ ورکشاپ کے انچارج کے پاس آئے۔ آنے سے پہلے انہوں نے آخری تفصیل تک تمام باتوں پر خوب غور کر لیا تھا۔ وہ انچارج سے مخاطب ہوئے:

''رومان الکساندرووچ، میں ان شیشوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' پھر وہ ان کے متعلق آسان زبان میں سمجھانے لگے۔ انچارج فوراً موضوع سمجھ گئے اور الکسئی کو اپنے کمرے کے اندر لا کر بولے:

''اپنی گفتگو جاری رکھو۔''

اس موضوع سے انچارج کی دلچسپی قابل فہم تھی۔ شیشوں کا مسئلہ ایک مدت سے ان کے لئے دردسر بنا ہوا تھا۔ خریدار کئی بار شیشوں کی شکایت کر چکے تھے۔ مزدوروں کی میٹنگوں میں ان پر کافی بحث کی جا چکی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ مولبڈینم کے کانٹے لگاتے وقت شیشے کی نازک نلیاں تڑخ جاتی تھیں۔ اسے حل کرنے کے لئے کئی تدبیریں اختیار کی گئیں لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور نقصان بدستور جاری رہا۔

انچارج کا چہرہ امید و بیم کا مرقع تھا۔ انہوں نے پھر اس نوجوان مزدور کو دیکھا اور اس کی ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا:

''مجھے سب تفصیل کے ساتھ بتاؤ۔''

الکسئی نے بتایا کہ موجودہ گرم کرنے کا طریقہ صحیح نہیں ہے۔ اگر اسے بدل دیا جائے تو دھات کے کانٹے شیشے میں اتنی ہی آسانی سے پیوست ہو سکتے ہیں جیسے مکھن میں چھری۔ اس طریقے سے شیشے میں شگاف نہیں پڑیں گے اور کارخانہ بھاری نقصان سے بچ جائے گا۔

یہ سب سن کر انچارج آخر میں بولے:

''اچھا، تو اس طریقے کو آزماؤ۔''

الکسئی اسی دن سے اس کام میں جٹ گئے۔ پہلے یہ بات ان کے ذہن میں نہیں آئی تھی کہ یہ کام بہت زیادہ مشکل ہوگا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ حقیقت واضح ہوتی گئی کہ ہر نئے خیال کی تکمیل کے راستے میں سینکڑوں انجانی اور غیر متوقع مشکلات اور پیچیدگیاں حائل ہوتی ہیں۔ اگر کم مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا تو یہ حیرت کی بات ہوتی۔ یہ زندگی کا ایک قانون ہے کہ خیال جتنا زیادہ جری ہوتا ہے اسے عملی جامہ پہنانے کا راستہ بھی اتنا ہی زیادہ خاردار ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس قانون کے مستثنیات بھی ہیں، لیکن بہت ہی کم۔ الکسئی نے اپنے کام پر کافی وقت اور محنت صرف کی۔ آخرکار وہ گرم کرنے کے آلوں کی صحیح تعداد اور ٹھیک طرز معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ دراصل انہوں نے پوری مشین ہی نئے سرے سے بنا ڈالی۔

جب وہ دوبارہ انچارج سے ملے تو انہوں نے گرمجوشی سے الکسئی سے ہاتھ ملایا اور کہا:

''ہونہار معلوم ہوتے ہو تم۔''

ایک بار الکسئی مالینکن کے ورکشاپ نے لینن گراد میں بلب کا کارخانہ دیکھنے کے لئے ایک گروپ نامزد کیا۔ کارخانے کا نام حسین روسی لڑکی کے نام پر ہے ــــ ''سویتلانہ''۔ انچارج نے الکسئی کی بھی سفارش کی۔ بعض لوگوں نے اس پر اعتراض کیا:

''ابھی اسے اتنا تجربہ نہیں ہے کہ وہ ایجادوں اور کارگزاری کے متعلق اچھے مشورے دے سکے۔''

اس پر رومان الکساندرووچ نے اعتماد سے جواب دیا: ''دے گا، آئندہ ضرور مشورے دے گا۔''

الکسئی اور ان کے ساتھی مزدور لینن گراد روانہ ہو گئے۔ یہ سفر انہیں اچھی طرح یاد ہے۔ اس کارخانے میں ماسکو کے مقابلے میں بہت سے مسئلے بالکل مختلف طریقے سے حل کئے گئے تھے۔

الکسئی نے لینن گراد اور ماسکو کے طریقوں کا مقابلہ کیا۔ وہ تکنیک کے پوشیدہ راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اس قطعی نتیجے پر پہنچے کہ کوئی بھی تکنیک مکمل نہیں جس کو بہتر بنانے کی گنجائش نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تحقیقات کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ جب الکسئی ماسکو لوٹے تو ان کے ذہن میں ایسے ہی خیالات موجزن تھے۔

(3)

1941ء میں جنگ شروع ہو گئی۔ بلب کے کارخانے کے بہت سے مزدور وطن کی مدافعت کرنے کے لئے محاذ پر چلے گئے۔ الکسئی بھی سوچتے رہتے تھے کہ ان کی جگہ محاذ جنگ ہے۔ کارخانے میں اگرچہ وہ روزانہ مقررہ کام سے ڈیڑھ گنا زیادہ کام کر رہے تھے لیکن اس سے ان کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔

ایک دن کارخانے میں جلسہ ہوا۔ جب جلسہ ختم ہو گیا تو مزدور ایک ایک کر کے اس میز کے پاس آئے جہاں صدر اور دوسرے عہدیدار بیٹھے ہوئے تھے اور ایک بڑے کاغذ پر دستخط کرنے لگے۔ الکسئی مالینکن بھی ان لوگوں میں تھے جنہوں نے حفاظت وطن کے لئے سب سے پہلے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کیں۔ اس روز وہ بڑے سکون سے گھر آئے، اس احساس کے ساتھ کہ انہوں نے اپنا فریضہ پورا کر لیا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد الکسئی اپنے دوسرے مزدور ساتھیوں کے ہمراہ لام بندی کے مرکز بلائے گئے۔

وہاں انہیں قطار میں کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا۔ یکا یک الکسئی نے سنا کہ ان کا نام پکارا جا رہا ہے۔ وہ سپاہی کی طرح ایک قدم آگے بڑھ گئے۔

افسر نے بہ آواز بلند کہا: ''مالینکن، ہمیں ابھی اطلاع ملی ہے کہ کارخانے کو تمہاری ضرورت ہے۔''

الکسئی یہ سوچ سوچ کر دل میں گھٹتے کہ وہ محفوظ عقب میں ہیں، اور کارخانے میں خاموش اکیلے گھومتے رہتے تھے۔ ان کے دوست سب کچھ سمجھتے تھے اور کبھی ایسی بات زبان سے نہیں نکالتے تھے جس سے وہ ناراض ہوں۔

1942ء میں سردیوں کی ایک صبح کو ماسکو کے ہوائی اڈے پر ایک ہوائی جہاز اترا۔ اس کے بازو گولیوں سے چھلنی ہو گئے تھے۔ وہ لینن گراد سے فاشستوں کا محاصرہ توڑ کر بہت ہی قیمتی سامان لایا تھا__ ریڈیو کے بلبوں کے لئے تار کی جالیاں بنانے والی دو چھوٹی مشینیں۔ سوویت صنعت کو ریڈیو کے لئے بلبوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس لئے مشینوں کو فوراً نصب کرنا اور انہیں چالو کرنا تھا۔ مشینیں بلب کے کارخانے کے حوالے کر دی گئیں۔ یہاں ان کے استعمال کے بارے میں ماہروں کی میٹنگ ہوئی۔ پتہ چلا کہ ان کی تکنیک کوئی بھی نہیں جانتا۔ مشینیں چلانے کے لئے ایک بہت ہی قابل ماہر کی ضرورت تھی۔ یہ اہم ذمے داری الکسئی مالینکن کے حصے میں آئی۔

''اچھا، ٹھیک ہے'' کہہ کر مالینکن نے یہ کام قبول کر لیا۔ پھر پوچھا: ''تکنیکی تفصیلات کہاں ہیں؟''

جواب یہ ملا: ''یہی تو مصیبت ہے۔ ہمارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ تو لینن گراد میں رہ گئیں۔ تمہیں خود ہی کسی نہ کسی طرح کام چلانا ہوگا۔''

الکسئی کو ایک ایسے شعبے کا سربراہ بنا دیا گیا جس کا وجود ہی نہیں تھا۔ ابتدا میں تمام کام ہاتھ سے کیا جاتا تھا۔ مزدور لڑکیاں ایک لمبی میز پر ٹنگسٹن سے ریڈیو بلب کے لئے تار تیار کیا کرتی تھیں۔ جب بھی الکسئی ان کے پاس سے گزرتے وہ دل میں کہتے: ''فی الحال صبر سے کام لو۔ ہم اس سے بہتر طریقہ معلوم کریں گے۔'' روز کام کے بعد الکسئی اس مسئلے پر دماغ لڑاتے۔ آخر کار وہ دن آ گیا جب ریڈیو بلب کے لئے تار کی جالی مشینوں سے بنائی جانے لگی۔ یہ دن تمام کارخانے میں ایک تقریب کی طرح منایا گیا۔

سب لوگوں نے الکسئی کو مبارکباد دی: ''شاباش! تم نے بڑا اہم کام انجام دیا ہے۔''

یہ سن کر الکسئی نے محسوس کیا کہ ان کے سینے پر سے ایک بڑا بوجھ اٹھ گیا۔ انہوں نے باعزت طریقے سے ایک اہم کام پورا کیا تھا۔ وہ عقب میں دشمن کے خلاف لڑ رہے تھے اور کامیابی حاصل کر رہے تھے۔

(4)

تار کی جالیاں بنانے والی ورکشاپ دھوپ سے روشن تھی۔ ہر طرف مشینوں کا یکساں شور

سنائی دے رہا تھا۔ یہاں غیر آہنی دھات کے تقریباً نظر نہ آنے والے ریشوں سے تار کی جالیاں تیار کی جا رہی تھیں جو ریڈیو بلب کے لئے بے حد ضروری ہیں۔

ایک ایسا شخص جو اس قسم کے کام سے ناواقف ہے اس کے لئے یہ منظر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ ورکشاپ بھی دوسری ورکشاپوں کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ یہاں مشینیں بھی دوسری مشینوں جیسی ہیں اور جہاں تک کام کا تعلق ہے تو وہ بھی ملتا جلتا نظر آتا ہے۔ لیکن اگر آپ میں تجسس کی عادت ہے، اگر آپ جدید صنعت اور ٹکنیکی ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اگر آپ کو تحقیقات اور ایجادوں کی داستانیں سننے کا شوق ہے تو ایک بار ماسکو کے بلب کارخانے کی جالیاں بنانے والی ورکشاپ ضرور دیکھئے۔ یہاں آپ کو بیش بہا معلومات حاصل ہوں گی۔ یہ ورکشاپ بڑی حد تک الکسیٔ مالینکن کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

آیئے، ذرا اس ورکشاپ کی داستان کے چند ورق الٹیں۔ یہاں ہمیں جستجو اور تحقیقات کے متعلق الکسیٔ مالینکن کی ابتدائی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل ہوگی۔ دراصل اپنی زندگی بھر وہ ایسی ہی باتوں کے گرویدہ رہے ہیں۔

ایک روز ورکشاپ کے انچارج نے کہا: ''اب اس طرح کام بالکل نہیں چلے گا۔ ہمیں پھر ریڈیو کے بلبوں کے خلاف شکائتیں ملی ہیں۔ تار کی جالیوں میں گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔ انہیں درست کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔''

ورکشاپ والوں نے غور و خوض کرنے کے بعد کہا: ''ہم نے گڑبڑ معلوم کرلی ___ یہ مشینوں کا نقشہ تیار کرنے والوں کی غلطی ہے۔''

پھر نقشہ تیار کرنے والے سر جوڑ کر بیٹھے اور کافی دیکھ بھال کے بعد اس فیصلہ کن نتیجے پر پہنچے: ''تار کی جالی مشین میں تیار ہوتے وقت اینٹھ جاتی ہے۔ اس کے ذمے دار ٹکنالوجی کے ماہر ہیں۔'' مالینکن نقشہ تیار کرنے والوں اور ٹکنالوجی کے ماہروں کے درمیان صلح و آشتی کراتے رہے۔

دراصل مسئلہ بہت ہی پیچیدہ تھا۔ کارخانے میں وقت اتنا کافی نہیں تھا کہ الکسیٔ وہاں یہ مسئلہ حل کرسکتے۔ چنانچہ انہوں نے گھر پر ایک چھوٹی سی ورکشاپ بنالی جو نہایت ہی صحیح آلے سے لیس تھی۔ اسی ورکشاپ میں وہ نازک تجربے کرتے رہے۔ اس میں نقشہ تیار کرنے والے، ٹکنیک کے ماہر اور مزدور ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

آخر کار ان کی جانفشانی کا پھل مل گیا۔ انہوں نے جالی کا نقشہ بدل دیا تھا اور اس کے بنانے کا نیا تکنیکی طریقہ اختیار کیا تھا۔ ان کے تخمینے کے مطابق اب جو تار کی جالیاں تیار کی گئیں وہ ٹھیک اور بالکل بیضوی شکل کی تھیں۔ چنانچہ ریڈیو کے بلب بھی اپنا کام ٹھیک کرتے تھے۔ جب دوسرے کارخانوں کے ماہروں نے مالینکن کی اس ایجاد کی خبر سنی تو وہ جوق در جوق بڑے اشتیاق سے ان کے کارخانے آئے۔ الکسی نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ انہیں اپنے تجربوں سے روشناس کیا۔

چندروز کے بعد مالینکن کو بڑے تکلفات سے ایجاد کا پیٹنٹ سرٹیفکیٹ عطا کیا گیا۔ تخلیقی کام جاری رہا۔

(5)

مزدور لڑکیاں سفید چوغوں میں ملبوس جھکی ہوئی ریڈیو بلب کے انتہائی باریک حصوں کو جوڑنے میں مصروف تھیں۔ اپنے ہاتھوں میں خاص سوئیاں لئے ہوئے وہ ہر جالی پر پچاس باریک تاروں کو صحیح جگہ پر بٹھا رہی تھیں۔ ان کی ایک ذرا سی بھی غلطی سے ریڈیو بلب ناقص بن سکتا تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ بلب کے اندر جالیاں ایک دوسرے کے اندر پیوست کی جاتی ہیں۔ اگر ایک لائن پر غلطی ہو تو دوسری لائن پر کام کرنے والیاں اندرونی جالی کے لچھے کے سامنے بیرونی جالی کا لچھا ٹھیک نہیں جما سکتیں۔ اور یہ بھی یاد رکھئے کہ ان کے درمیان فاصلہ محض ملی میٹر کا دسواں حصہ ہوتا ہے!

اس سے آپ کے ذہن میں ایک تصویر ابھر آنا چاہئے۔ درجنوں قطاروں میں لڑکیاں سفید چوغے پہنے ہوئے جالی کے باریک تار ٹھیک کر رہی ہیں جنہیں آنکھ مشکل سے دیکھ سکتی ہے۔ اس سے آدمی تھک جاتا ہے اور کبھی غلطی بھی کر سکتا ہے۔ اگلی لائن پر مزدور لچھوں کو جوڑنے کا کام کر رہی ہیں۔ ناقص جالیوں پر ان کی نظر نہیں پڑتی۔ نتیجہ؟ ناقص بلب۔ ظاہر ہے کہ خریدار ناراض ہوتے ہیں اور کارخانے سے مطالبہ کرتے ہیں: "یہ جھمیلا کب ختم ہوگا؟"

اس مسئلے پر مالینکن نے بارہا غور کیا۔ انہوں نے بہت سے حل سوچے لیکن مسئلہ اپنی جگہ باقی رہا۔ مشکل یہ تھی کہ جو تار لڑکیاں استعمال کرتی تھیں وہ اتنے باریک تھے کہ ہاتھ سے انہیں بالکل صحت کے ساتھ جمانا تقریباً ناممکن تھا۔

اکثر جب ہم موجدوں کا ذکر کرتے ہیں تو لفظ ''اتفاق'' بھی زبان پر آ جاتا ہے۔ دراصل ''غیر متوقع'' حل کے پس منظر میں موجد کی سالہا سال کی تحقیق اور صبر آزما مشق ہوتی ہے۔ الکسیٰ مالینکن کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

ایک دن جب وہ آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھا کر رہے تھے تو انہیں مسئلے کا حل مل گیا۔ بظاہر اسے اتفاق کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو یہ ان کے سینکڑوں تجربوں اور سینکڑوں ہی آزمائشوں اور غلطیوں کا نتیجہ تھا۔ بہر حال، الکسیٰ نے صحیح حل پا لیا۔

جب الکسیٰ مالینکن بالوں میں کنگھا کر رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ کنگھا بڑی آسانی سے ان کے بالوں سے گزرتا ہے اور ایک ایک بال کو اپنی جگہ مناسب طریقے سے جما دیتا ہے۔ آخر اسی اصول کو کیوں نہ استعمال کیا جائے؟ دھات کے باریک تار کنگھی سے جمائے جا سکتے ہیں۔

خیال ایک بات ہے اور عمل دوسری چیز۔ الکسیٰ نے بے شمار نقشے بنائے، نمونے تیار کئے، بار بار انہیں آزمایا اور ناامید ہو کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ عرصے تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس موقع پر محکمے کے سربراہ میخائیل کاؤف مان کام آئے۔ ان کے مشورے کے مطابق پھر لمبا چوڑا حساب لگایا گیا۔ اعداد کی لمبی لمبی سطروں سے کاغذ بھر گئے۔ ''کنگھی'' زیادہ پیچیدہ ہوتی گئی حالانکہ تیار شدہ حالت میں اسے ہتھیلی پر رکھا جا سکتا تھا۔

''لیجئے، تیار ہے'' دھات کی کنگھی کو خوشی سے ہوا میں اچھالتے ہوئے الکسیٰ نے انچارج سے کہا۔

میخائیل کاؤف مان کھڑے ہو کر اسے اس طرح تکنے لگے جیسے کہ مسحور ہو گئے ہوں۔ ''کنگھی'' پر ہفتوں مشقت کی گئی تھی، دکھ درد برداشت کیا گیا تھا اور خوشیاں بھی منائی گئی تھیں۔ دیکھنے میں وہ دھات کا ایک نازک سا ٹکڑا تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ کام کرنے میں کیا ''کنگھی'' کامیاب رہے گی؟

''کیا خیال ہے، دھوکہ تو نہیں دے گی؟''

''ٹھیک ہی چلے گی۔''

چھوٹے سے قد کے دبلے پتلے مالینکن ڈھیلا ڈھالا چوغہ پہنے ہوئے ایک سب سے زیادہ تجربے کار مزدور عورت رئیسہ کے پاس آئے اور کہا:

”ذرا ادھر آنا۔“

انہوں نے رئیسہ کے ہاتھ سے سوئی لے کر الگ رکھ دی۔ پھر نیا آلہ مشین میں لگا دیا۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ مزدور لڑکیوں کی نظریں ان پر جمی ہوئی ہیں۔

”ٹھیک ہے۔ اب اسے چلاؤ۔“

رئیسہ نے پیر سے پیڈل دبایا اور مشین چل پڑی۔ ”کنگھی“ جالی کو آہستہ آہستہ چھونے لگی۔ رئیسہ اپنی سوئی پھینکتے ہوئے بولیں:

”اب اس نگوڑی کی مجھے کیا ضرورت ہے۔“

لیکن الکسی نے ٹوکا:

”تھوڑا انتظار اور کر لو۔ اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے۔“ انہوں نے تار کی جالی اٹھائی اور ایک خاص خوردبین کے نیچے اسے رکھ کر دیکھا کہ ”کنگھی“ نے اپنا کام ٹھیک کیا ہے یا نہیں۔ جالی بالکل بے عیب تھی۔

(6)

ریڈیو بلب کے اندر تار کی جالی اتنی باریک ہوتی ہے کہ مشکل سے دیکھی جا سکتی ہے۔ اسے بہتر بنانے پر کتنا وقت اور کتنی محنت کھپانا پڑی۔ جالی کا ڈیزائن اب بہتر تھا اور ٹکنالوجیکل عمل بھی مناسب تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مسئلہ اب حل ہو چکا ہے۔ لیکن مشین کا نقشہ تیار کرنے والے بلیئوف سے مختصری بات چیت کرنے کے بعد پتہ چلا کہ پھر بدنصیب جالیوں کا ستارہ گردش میں ہے۔ انہوں نے کہا:

”بہتر ہے کہ اس ٹکنیکی عمل میں ایک اور اضافہ کیا جائے۔ جالیوں کے کھردرے سروں کی وجہ سے سب کام کی مشین بندی نہیں ہو رہی ہے۔“

بظاہر یہ فقرہ زیادہ گمبھیر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لیکن الکسی مالینکن کو اس مشکل لیکن دلچسپ کام پر پورے پانچ برس صرف کرنا پڑے۔

اسی دن وہ ورکشاپ گئے اور دیر تک دیکھتے رہے کہ جالیاں کس طرح کاٹی جا رہی ہیں۔ انہیں چاقو کاٹ رہے تھے۔ مالینکن نے بڑی احتیاط سے ایک جالی اٹھائی اور اسے جانچا۔ جالی

کے سرے واقعی کھردرے تھے۔ جب ابرق کے پتر ان کے اوپر رکھے جاتے تو کھردری سطح کے باعث وہ چیخ جاتے یا ان کے پرت اتر جاتے تھے۔ یہ نقص لڑکیاں ہاتھ سے کام کرتے ہوئے دور کر سکتی تھیں لیکن مشینوں کے لئے یہ ناممکن تھا۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ مسئلہ حل کرنے میں پورے پانچ برس لگ گئے۔ مالینکن کی حالت اس اندھے کی سی تھی جو چیزوں کو ہوا میں ٹٹولتا ہے۔ اس وقت اس موضوع کے متعلق معلومات بھی برائے نام تھیں۔ بہر حال انہیں اپنی اس صلاحیت پر اعتماد تھا کہ وہ ہمیشہ مسئلے کا حل تلاش کر لیتے ہیں۔ وہ ثابت قدم رہے۔ ان کا مقولہ تھا کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔

مالینکن کو ایک خیال آیا___ جالیاں مکینکل طریقے کے بجائے بجلی سے کیوں نہ کاٹی جائیں؟ یہ ایک جری اور دلکش خیال تھا۔ اب ضرورت یہ تھی کہ اسے عمل میں لایا جائے۔ آلہ تیار کیا جائے، اسے چلا کر اس کی آزمائش کی جائے۔ لیکن یہ مشکلات کی ابتدا تھی۔ شروع میں جو حساب کتاب لگایا گیا وہ صحیح نہیں تھا۔ پھر نقشے میں غلطیاں نکل آئیں۔ اور آخر میں مشین نے بغاوت کر دی۔

ایسے موقعوں پر جب ہر چیز الٹی نکلتی ہے تو الکسئی مالینکن کے اوصاف اور بھی ابھر آتے ہیں۔ اگر چہ آس پاس تذبذب اور ہچکچاہٹ کا ماحول تھا لیکن وہ ہمیشہ کی طرح اٹل اور مستقل مزاج رہے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ مستقل مزاجی اور صبر کے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

آخر کار وہ دن آ گیا جس کا انتظار تھا۔ انجینئروں، فٹروں اور مزدور لڑکیوں سے گھرے ہوئے الکسئی مالینکن اپنی مشین کے سامنے بیٹھے اور اسے چلانے لگے۔ ہر طرف سے ان کی جانب مشتاق ہاتھ بڑھے۔ سب کو نئی کٹی ہوئی جالیاں مل گئیں۔ ورکشاپ میں تحسین کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اب جالی کے سروں کا ٹیڑھا پن دور ہو گیا تھا۔ اور وہ سگار کی نوک کی طرح بالکل ہموار تھے۔

یہ نئی مشین ایک شفٹ میں 25-20 ہزار جالیاں تیار کرتی تھی۔ شروع میں جب دوسری مشینیں نہیں تھیں تو لڑکیاں بلب کے مختلف حصے ہاتھ سے ہی جوڑا کرتی تھیں۔ اب انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی، ان کا کام آسان ہو گیا تھا۔ ابرق کو جالی کے سروں پر رکھنا اور جالی کو حاجز میں استواری سے کھڑا کرنا___ یہ کام چند سیکنڈ میں پورا ہو جاتا تھا۔

اس کے بعد ورکشاپ میں خودکار مشینیں نصب کر دی گئیں۔ انہیں دیکھ کر بلیعوف نے کہا: ''شاباش''۔ یہ وہی نقشے تیار کرنے والے تھے جنھوں نے مالینکن کو جالیوں کے سرے ٹھیک کرنے

کا مشورہ دیا تھا۔ مالینکن کے لئے یہ تعریف بڑی اہم تھی۔ بلیعوف تجربے کار ڈیزائن ساز تھے اور سائنس کے ڈاکٹر۔ ایسے شخص کی زبان سے تعریف کے لفظ واقعی معنی رکھتے تھے۔

(7)

ایک روز کارخانے کی کارکردگی اور ایجادوں کے شعبے کے نگراں نے الکسئی مالینکن کو بات چیت کے لئے بلایا۔ گفتگو کا موضوع غیر معمولی تھا۔ نگراں نے یہ نہیں پوچھا کہ کام کے متعلق ان کے تازہ ترین خیالات کیا ہیں۔ وہ پرانی باتوں، پرانے خیالات اور مشینوں کو بہتر اصولوں پر چلانے کے لئے ان کے پرانے مشوروں کے بارے میں سوالات کرتے رہے جن پر مدت سے عمل ہو رہا تھا۔ بعض وقت شعبے کے نگراں سامنے میز پر رکھے ہوئے کاغذ پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے نظر ڈالتے اور خود ہی مالینکن کے کام پر تبصرہ کرنے لگتے تھے۔ کبھی وہ الکسئی سے سوال کرتے اور کاغذ پر کچھ لکھنے لگتے۔ آخر میں حساب لگا کر انہوں نے بتایا کہ مالینکن کارخانے میں اپنے کام کے دوران میں ٹکنیکی عمل کو بہتر بنانے کے لئے سو مشورے پیش کر چکے ہیں۔

مالینکن نگران کی باتیں دلچسپی سے سنتے رہے۔ خاص کر سو کی پوری تعداد سن کر انہیں خوشی ہوئی۔ لیکن ابھی تک وہ گفتگو کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے۔ بات چیت ماضی کے متعلق کیوں ہے، حال اور مستقبل کے بارے میں کیوں نہیں ہے؟ آخر کار نگراں نے راز افشا کر ہی دیا:

''ہم سے تمہارے متعلق اور تمہارے کام کے بارے میں معلومات جمع کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ کام کے برسوں میں تم نے کارخانے کو جو دین دی ہے ہم اس کا خاکہ تیار کر رہے ہیں۔''

چند دن بعد کارخانے میں اعلان ہوا کہ الکسئی مالینکن کو اشتراکی محنت کے ہیرو کا اعزاز عطا کیا گیا ہے۔

سارے کارخانے سے لوگ، جانے اور انجانے، سب ہی ان کے پاس آئے اور گرمجوشی سے مبارکباد دی۔

مالینکن اعزاز سے خوش ضرور تھے لیکن ساتھ ہی ان کے دل میں ایک چبھن سی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ آخر وہ کس قسم کے ہیرو ہیں؟ زندگی میں انہوں نے ایسے کون سے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں کہ انہیں ہیرو کہا جائے؟

پھر یہ چھوٹے سے قد کا دبلا پتلا آدمی ڈھیلا ڈھالا چوغہ پہنے ہوئے لوگوں کی محبت سے متاثر ہو کر مسکرا دیا جو اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ مجمع میں ایک فرد بھی ایسا نہیں تھا جسے الکسئی کو یہ بلند اعزاز ملنے پر حیرت ہوئی ہو۔ ہر شخص جانتا تھا کہ انہوں نے برسوں تک کارخانے کی جو خدمت کی ہے یہ اس کا جائز انعام ہے۔ الکسئی مالینکن نے اپنی روح کی گہرائیوں میں ایک روشن شعلہ محسوس کیا۔ اور جب انہوں نے اپنی زندگی پر نظر دوڑائی تو وہ با مقصد معلوم ہوئی۔

الکسئی کے ساتھ کام کرنے والوں نے اپنے اعتماد اور محبت کا ایک اور اظہار کیا۔ ان کی جانب سے وہ سوویت یونین کی پارلیمنٹ کے امیدوار نامزد کیے گئے۔

(8)

کئی سال تک الکسئی مالینکن سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن اخباروں سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ وہ اپنی ورکشاپ کا کام بہتر بنانے کے لئے اسی پرانے جوش و خروش، محنت اور سرگرمی سے نئے نئے مشورے دے رہے ہیں۔ پھر اخباروں نے ان کے بارے میں لکھنا بند کر دیا۔ پتہ چلا کہ وہ سخت بیمار ہیں۔

جب وہ اچھے ہو گئے تو میں ان سے ملا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اتنی طویل اور سخت بیماری نے کہیں ان کی اختراعی صلاحیتوں پر برا اثر نہ ڈالا ہو اور توانائی سلب نہ کر لی ہو۔ لیکن مالینکن پہلے کی طرح تیز قدموں سے کمرے میں داخل ہوئے۔ اگر کچھ فرق نظر آتا تھا تو بس یہی کہ ان کی پیشانی پر اور آنکھوں کے کونوں میں لکیریں بڑھ گئی تھیں۔ اور گھنگریالے بالوں میں کہیں کہیں سفید دھاریاں دکھائی دیتی تھیں۔ باقی وہ بالکل پہلے کی طرح تھے ــــ سوویت صنعت کی ترقی اور اسے بہتر بنانے کی لگن میں ڈوبے ہوئے۔

لمبے وقفے کے بعد جب الکسئی مالینکن کارخانے آئے اور اندر ورکشاپوں پر نظر ڈالی تو انہیں بڑی تبدیلیاں محسوس ہوئیں۔ پچھلے چند برسوں میں کارخانہ بہت بڑھ گیا تھا اور اسے پہچاننا مشکل تھا۔ کارخانہ پہلے صرف بجلی کے قمقمے اور ریڈیو بلب تیار کرتا تھا۔ اور اب وہ نیون (Neon) کے لیمپ بنا رہا تھا۔ جب وہ نوٹس بورڈ پڑھ رہے تھے تو فقط ''ریڈیو الیکٹرونکس'' نے ان کی توجہ مبذول کی۔ واقعی یہ نئی چیز ہے! یہ ایک بالکل نئی سائنس ہے اور نئے سائنسی مسئلوں کی پوری دنیا کو محیط

کیئے ہوئے ہے۔ اس کا تعلق راڈر سے، ریڈیو اسپیکٹروسکوپ سے، ریڈیو موسمیات سے اور کمپیوٹروں تک سے ہے۔

اس پیچیدہ اور پُر جوش نئی دنیا میں فنر انجینئر، غیر محدود معلومات کے مالک مالینکن اپنا مقام تلاش کرنے لگے۔ اب پھر وہ جستجو اور تحقیق کے نئے میدان میں قدم رکھ رہے تھے۔

''اب ہم سائنس کے بہت قریب آ گئے ہیں'' ایک مرتبہ مالینکن نے کہا۔ سائنس کے قریب کیسے آئے، اس کی اپنی دلچسپ داستان ہے۔

جب مالینکن اپنی ورکشاپ آئے تو وہاں انہیں ایک بات سے بڑی کوفت ہوئی۔ کارخانے کی تعمیر نو کے بعد ان کی ورکشاپ ایک بڑی ہوادار عمارت میں منتقل ہو گئی تھی۔ یہاں کام کرنے کے حالات پہلے کے مقابلے میں بہتر تھے۔ لیکن ایک چیز کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ یہ تھی مالینکن کے ذہن کی تخلیق ___ تجرباتی تحقیقاتی ورکشاپ۔ چنانچہ انہوں نے آتے ہی مشورہ دیا کہ ایک تجرباتی تحقیقاتی گروپ بنایا جائے۔ ڈائرکٹر نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور پوچھا:

''گروپ کی رہنمائی کون کرے گا؟''

مالینکن نے جواب دیا: ''ظاہر ہے، ولیغین وارلاموف!''

میں وارلاموف کے متعلق سن چکا تھا۔ ماسکو کے باؤمان نامی اعلیٰ ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ سے فارغ ہو کر وہ مالینکن کے کارخانے میں کام کرنے لگے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے دوست تھے۔ انہوں نے مل جل کر تار کی جالیاں بہتر بنانے کی ٹکنیک دریافت کی تھی۔ اب وارلاموف انجینئر تھے اور ڈاکٹر کی ڈگری کے لئے مقالہ تیار کر رہے تھے۔ میں سوچنے لگا: ''لوگ کتنی تیزی سے ترقی کرتے ہیں۔''

گروپ میں وارلاموف اور مالینکن کے علاوہ دو مزدور لڑکیاں گالیتسکایا اور دیونووا اور چند دوسرے لوگ شامل تھے۔ جلد ہی اس گروپ کے کام کے نتائج برآمد ہونے لگے۔

ایک دن الکسی مالینکن نے مسکراتے ہوئے کہا: ''ہم نے ایک اہم کام انجام دے دیا ہے۔''

پھر وہ اس کی وضاحت کرنے لگے۔ خلاصہ یہ تھا: انہوں نے سرامک کی ایک خاص جالی بنانے کا نیا طریقہ دریافت کیا ہے۔ اس نئے طریقے کی انقلابی اہمیت کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ پہلے جالیوں کی جتنی تعداد ایک مہینے میں تیار ہوتی تھی اب وہ ایک شفٹ میں تیار ہونے لگے گی!

شاباش، الکسئ مالینکن! جس چیز میں بھی وہ ہاتھ ڈالتے ہیں اس میں انہیں کامیابی ہوتی ہے۔ پریوں کی کہانی کی طرح خاتمہ اچھا ہی ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاتھ میں جادو کی کوئی چھڑی ہے جسے ہلا کر وہ اپنی خواہش پوری کرتے ہیں۔ غالباً الکسئ نے میرے یہ خیالات بھانپ لئے اور کہنے لگے:

"یہ مت سمجھئے کہ میں ہر چیز میں آسانی سے کامیاب ہو جاتا ہوں۔ دوسروں کی طرح مجھے بھی نشیب و فراز سے سابقہ پڑتا ہے۔ کبھی کامیابی ہوتی ہے تو کبھی ناکامی۔ ایک واقعہ سنئے۔"

واقعہ یہ تھا: چند برس ہوئے الکسئ مالینکن نے فیصلہ کیا تھا کہ گول جالی بنانے کا عمل آسان کیا جائے۔ ان کی رائے میں ورکشاپ میں جو طریقہ استعمال کیا جا رہا تھا وہ بے حد پیچیدہ تھا اور اس پر ضرورت سے زیادہ پیسہ بھی خرچ ہوتا تھا۔

مالینکن کو ایک ترکیب سوجھی — گول جالیاں مشین سے بنائی جائیں۔ انہوں نے عہد کیا کہ وہ ایسی مشین بنا کر ہی دم لیں گے۔

مشکل یہ تھی کہ خیال بہت ہی انقلابی تھا۔ سب لوگ جانتے تھے کہ گول جالیاں بنانے کا صرف ایک طریقہ ہے جسے مالینکن کا کارخانہ اور سوویت یونین اور دوسرے ملکوں کی تمام فیکٹریاں استعمال کر رہی ہیں۔ لیکن اچانک ایک فٹر میدان میں کودتا ہے — جو واقعی باصلاحیت اور قابل احترام آدمی ہے — اور خم ٹھوک کر کہتا ہے کہ وہ طریقہ جو برسوں سے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا رہا ہے بے کار ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ اس سے یہی کہیں گے:

"بھائی، اس مرتبہ تو تم چادر سے باہر پاؤں پھیلا رہے ہو!"

اگر کسی انسان پر اعتماد نہیں کیا جائے تو اس کا کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے — نہ صرف اخلاقی لحاظ سے بلکہ عملاً ٹھوس معاملوں میں بھی۔ الکسئ مالینکن کو بہت سی ضروری دھاتیں دستیاب نہیں تھیں اس لئے خراد اور گھسائی کا کام بہت مشکل تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے تقریباً آدھی مشین مکمل کر لی، لیکن سخت بیماری نے انہیں آن گھیرا۔ وہ عرصے تک زیر علاج رہے۔ صحت یاب ہو کر جب کارخانے آئے تو دیکھا کہ ان کی سخت مشقت کا نتیجہ کباڑ خانے میں پڑا ہوا ہے اور مکڑیوں نے اس پر جالا بن رکھا ہے۔ ظاہر ہے انہیں صدمہ ہوا۔ انہوں نے قسم کھائی:

"میں اسے ختم کر کے ہی چھوڑوں گا۔ میرے ذہن میں نئے نئے خیالات ہیں۔ انہیں میں

مصرف میں لاؤں گا۔"

مجھے اس پر حیرت نہیں ہوئی۔ مالینکن تقریباً ایک برس تک کام پر نہیں آئے تھے۔ اس عرصے میں وہ برابر اپنی نئی مشین کو بہتر بنانے کے نئے طریقے سوچتے رہے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اچھی مشین بنانے میں کامیاب ہوں گے۔ میں الکسی مالینکن سے خوب واقف ہوں۔

(9)

جب وہ آہستہ آہستہ کام کرنے کا چوغہ پہن رہے تھے تو انہیں اپنے بچپن کے دوست سے اتفاقیہ ملاقات اور دوست کا ان کی "غیر مشہور و معروف" زندگی پر ترس کھانا یاد آیا۔ انہوں نے ذہن میں اپنی زندگی کا جائزہ لیا۔ ان کی زندگی میں چند ہی اہم واقعات ہوئے تھے لیکن مجموعی طور پر وہ کارآمد نظر آئی۔ انہیں خوشیاں بھی میسر ہوئیں اور غم بھی ملے لیکن سب سے اہم چیز یہ تھی کہ وہ جوش و خروش کے ساتھ، تخلیقی طور پر اور اپنی خوشی سے کام کرنے کا مطلب سمجھتے ہیں۔

الکسی مالینکن اپنے ماضی کے اور چراغ جلاتے رہتے لیکن ٹیلی فون کی گھنٹی نے ان کے خیالات کا تسلسل توڑ ڈالا۔ یہ چیف انجینئر کا فون تھا جو انہیں کسی کانفرنس کے لئے بلا رہے تھے۔ پھر انہیں کارخانوں کے موجدوں کی کونسل کے اجلاس میں حصہ لینا تھا۔ اس کے بعد پیداوار بہتر کرنے کے سوالوں پر نوجوان مزدوروں سے ملاقات کرنا تھی۔

الکسی مالینکن اپنے روزمرہ کے فرائض اور جھمیلوں میں اتنے محو ہو گئے کہ سڑک پر اتفاقیہ مٹھ بھیڑ اور اس کے پیدا کردہ خیالات ان کے ذہن سے بالکل غائب ہو گئے۔ ایسی باتوں کے لئے ان کے پاس کہاں وقت ہے۔

از: ولیری گوربوتوف

ساتویں آسمان میں

ان کی نظریاتی تربیتی نوٹ بک میں یہ تفصیلات لکھی تھیں:

''ن۔ا۔ پروخانووا۔ سال پیدائش 1939ء۔ اعلیٰ تعلیم غیر مکمل۔ نوجوان کمیونسٹ لیگ کی ممبر۔ فضائی معلم۔''

پھر درج تھا: ''کتنے قسم کے ہوائی جہازوں کی پرواز کی؟'' ان کی مجموعی تعداد 11 تھی۔

اور اب بارہویں جہاز کی باری تھی۔ ایک مدت سے نتاشا پروخانووا اس کا خواب دیکھ رہی تھی۔

مطالعے کے بعد پرواز، پھر مطالعے کے بعد ایک اور پرواز__ دنیا کی کوئی بھی طاقت انہیں اس حلقے سے باہر نہیں نکال سکتی تھی جسے خود انہوں نے کافی سوچنے سمجھنے کے بعد منتخب کیا تھا۔ دوسرے تمام فاصلے ان کے لئے بے معنی تھے، ان کے ذہن میں صرف ایک ہی فاصلہ تھا__ بلندی!

اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ جب بھی نتاشا کوئی کام انجام دینے کا فیصلہ کرتی ہیں، چاہے کیسی ہی مشکلات کیوں نہ ہوں، وہ اس میں تن من سے جٹ جاتی ہیں۔

فضائی اسکول روایتی طور پر مردوں کی دنیا ہوتا ہے۔ چنانچہ شروع میں اس کا مضحکہ اڑایا گیا کہ ''نرم ونازک خواتین'' اس دنیا میں داخل ہو رہی ہیں۔

لیکن نتاشا پہلے بھی اسی طرح کے حالات سے دوچار ہو چکی تھیں۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ دیہات کے اسکول میں ساتویں کلاس میں پڑھا کرتی تھیں۔ وہاں دریا کے کنارے کوئی بائیس فٹ اونچی ایک دیوار سی تھی۔ لڑکے اس پر چڑھ کر پانی میں کودا کرتے تھے اور جب نتاشا ان کا ساتھ نہیں دیتی تھیں تو بے رحمی سے ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ ایک روز کوئی چلا اٹھا: ''بزدل! بس کیا تھا، وہ خاموشی سے دیوار پر چڑھیں اور وہاں سے دریا میں دھڑام سے کود پڑیں۔ اس پر ماں نے ڈانٹ ڈپٹ کی لیکن اس وقت سے ہی وہ ''مردانہ'' چیزوں میں حصہ لینے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔

آخر کار انہوں نے اسکول کا آخری کلاس بھی پاس کر لیا۔ اب کل کے بچے بالغ ہو چکے تھے۔ اور اس اچانک تبدیلی کا ثبوت جلد ہی مل گیا۔ ''اخاہ! فضائی کلب میں شامل ہو رہے ہو؟ پرواز کرنا سیکھو گے؟ اور میں؟''

پہلی منزل

اپنی زندگی میں نتاشا کو جو سب سے پہلا ''اڑن کھٹولا'' ملا وہ ایک بے آواز بے ہنگم سا لکڑی کا گلائیڈر (A-2) تھا۔

شروع میں انہیں ہوائی جہازوں کی بناوٹ، فضائی نظریہ کی تعلیم اور زمین پر ٹریننگ دی گئی۔ پھر انہیں گلائیڈر سے روشناس کیا گیا۔ ہزاروں ماہر طیارہ بازوں کی فضائی زندگی ایسے ہی اڑن کھٹولے سے شروع ہوتی ہے۔ وہ اس نازک چیز کو دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گئیں۔ اور جب یہ گلائیڈر انہیں خوش اسلوبی سے زمین سے بلندی پر لے گیا اور وہ بادلوں کے اوپر ایک آزاد پرندے کی طرح اڑنے لگیں تو یہ لمحے ان کے ذہن پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو گئے۔ یہ تھی پرواز کے فن سے ان کی پہلی جان پہچان اور رفتار سے ان کا پہلا شوق۔

گلائیڈر کی رفتار 120 کلومیٹر فی گھنٹہ تھی، ایکسپریس بس سے تھوڑی ہی زیادہ۔ لیکن اس میں کتنا لطف تھا! ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آسمان کی غیر محدود بلندیوں میں خود آدمی سبک پروازی سے اڑ رہا ہے۔ ان کے ذہن میں نئی حاصل کی ہوئی آزادی کا حسن بس گیا۔

بعد میں نتاشا نے اپنی زندگی میں سرکاری رپورٹوں میں کئی بار ایسے جملے سنے: ''بحیثیت طیارہ باز نام درج کیا گیا'' ''تنہا ہوائی جہاز چلانے کی اجازت دی گئی'' ''علاقائی مقابلوں میں حصے لے سکتی ہو''۔ ضابطوں کے یہ مختصر اور سرکاری جملے ان کے کانوں میں موسیقی کی طرح گونجتے تھے۔ اور طیارہ بازوں کا یہ مقولہ بھی: ''اہم ترین بات رفتار ہے۔''

حسن اتفاق کہیے کہ نتاشا نے جہاز پر اسی دن پہلی تنہا پرواز کی جس دن انہوں نے اسکول کا آخری امتحان دیا تھا۔

دوسری منزل

وہ فضائیہ اور بحریہ کی امدادی انجمن کی مرکزی کمیٹی کے نائب صدر کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔ مٹھیاں بھنچی ہوئی، منہ ستا ہوا اور سر کے بال اس طرح پھولے ہوئے جیسے لڑنے کے موڈ میں ہوں۔ پھر بولیں:

''میرا باپ سچا مجاہد تھا۔ اس نے اپنے ملک کے لئے جان دیدی۔ اور آپ مجھے قبول کرنے سے انکار کررہے ہیں... ایسا کوئی قانون نہیں ہے کہ بغیر کسی معقول وجہ کے مجھے چلتا کیا جائے!''

نائب صدر نے دلچسپی سے پوچھا: ''واقعی، تو تمہارا باپ بھی طیارہ باز تھا؟''

انہیں اپنا باپ یاد بھی نہیں تھا۔ لیکن یقینی وہ طیارہ باز نہیں تھا۔ ماں کی طرح وہ مشکل سے لکھ پڑھ سکتا تھا... اس نے تعمیری مزدور کے کام سے ابتدا کی، پھر وہ فوج میں سپاہی بھرتی ہو گیا اور محاذ جنگ سے واپس نہیں لوٹا۔ کاش کہ وہ طیارہ باز ہوتا...

آنسوؤں کو مشکل سے روکتے ہوئے نتاشا نے آہستہ لہجے میں جواب دیا: ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرا نام رجسٹر کر لیجئے۔ اس وقت تک یہاں سے نہیں ہٹوں گی۔''

''تم تو بچوں جیسی باتیں کررہی ہو۔ مردوں کی طرح سمجھنے کی کوشش کرو۔''

عورتوں کے آنسوؤں کی بھی عجیب تاثیر ہوتی ہے۔ فوراً رجسٹر میں درج کرلیا گیا: ''ن۔ا۔ پروخانووا، تمبوف فضائیہ کلب کی طالب علم، فضائی کے مرکزی اسکول میں اپنی ٹریننگ جاری رکھیں گی۔'' دو سال کے اندر رجسٹر میں یہ تحریر تھا: ''فضائی معلم کی ڈگری حاصل کر لی۔''

نتاشا نئے قسم کے ہوائی جہاز چلانے لگیں اور ان کی رفتار بڑھتی گئی۔ وہ اپنے ہی فضائیہ کلب میں کام کرنے لگیں۔ ان کے شاگردوں کا پہلا گروپ انہیں گھیرے ہوئے تھا۔ سات نوجوان لڑکے جس طرح حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اس کا مطلب سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ انہیں امید تھی کہ ان کا معلم پُرسکون خرانٹ طیارہ باز مرد ہوگا۔ اور ملا کون؟ ایک خوبصورت نوجوان عورت جس کے بال بڑے اسٹائل سے سنورے ہوئے تھے، چہرے کا رنگ سنولایا ہوا تھا اور جس کی بھویں ذرا تنی ہوئی تھیں! نتاشا نے اپنا حوصلہ بڑھانے کے لئے سوچا کہ وہ معلم ہیں اور فوراً کام شروع کر دیا۔

ابتدا میں کام آسان نہیں تھا۔ خود جہاز کی پرواز کرنا ایک بات ہے اور دوسروں کو سکھانا بالکل مختلف مسئلہ ہے۔ لیکن ان کی محنت بارآور ثابت ہوئی۔ بعد میں کلب میں یہ اعلان شائع ہوا: ''ہم ن۔ا۔ پروخانووا کا خلوص دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے سات طالب علموں کو اتنی اچھی ٹریننگ دی۔'' شاید یہ اس تعریف کا اثر تھا کہ انہوں نے ٹیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا۔

خاص بات رفتار کو بڑھاتے رہنا ہے۔خود زندگی بھی ایک مسلسل حرکت ہے،شعوری طور پر رفتار بڑھانے کا دوسرا نام ہے۔بس رفتار کم ہوئی اور آپ بلندیوں سے نیچے گرنے لگے۔

نتاشا نے پہلی بار 1962ء میں بلند پروازی کے مقابلے میں حصہ لیا۔تیس شرکت کرنے والوں میں وہ اکیلی عورت تھیں۔اسے ستم ظریفی کہیے کہ وہ اس مقابلے میں ''صف نازک'' کی واحد نمائندہ تھیں اور انہوں نے پہلا انعام پایا!

1963ء میں سوویت یونین کی چوٹی کی طیارہ باز خواتین کا مقابلہ ہوا۔نتاشا پروخانووا بھی اس میں شریک ہوئیں اور اپنے پیشے کا بلند اعزاز حاصل کیا ___ اسپورٹ کی ماسٹر۔زندگی میں سب سے اہم بات پرواز کو بڑھاتے رہنا ہے۔

تیسری منزل

جب نتاشا نے جیٹ ہوائی جہازوں کی پرواز شروع کی تو وہ نو سو گھنٹوں سے زیادہ پسٹن طیارے چلا چکی تھیں۔اب انہیں میگ (MIG) ہوائی جہاز چلانا تھے۔اس کا مطلب تھا ایک ہزار کلومیٹر سے زیادہ فی گھنٹے کی رفتار اور خطرے کے وقت طیارہ باز کو نکالنے والی سیٹ! اور یہ سب ان کے لئے حسب معمول بن گیا۔

1964ء میں ایک قومی فضائی مقابلہ ہوا۔اسی میں نتاشا کو کانسے کا میڈل ملا۔سوویت فضاییے کی تاریخ میں پہلی بار طیارہ باز عورتوں نے آواز کی رفتار سے بھی زیادہ تیز پرواز کی۔

ابھی تک جیٹ جہاز چلانے میں عورتوں کے تمام عالمی ریکارڈ ایک امریکی طیارہ باز جیکلین کوکران نے قائم کیے تھے۔لیکن بلاشبہ ان کے تمام ریکارڈوں میں اس ریکارڈ کو توڑنا سب سے مشکل تھا جو انہوں نے 1961ء میں بلند پروازی میں قائم کیا تھا۔یہ ریکارڈ 17091 میٹر کی بلندی تھی۔نتاشا کی منزل یہی ریکارڈ توڑنا تھا۔

نتاشا اپنے مشہور حریف کے بارے میں تھوڑا بہت جانتی تھیں۔انہیں معلوم تھا کہ امریکی نے کتنے ریکارڈ قائم کر رکھے ہیں،وہ کروڑ پتی ہیں اور ان کا اپنا ذاتی ہوائی جہاز بھی ہے۔نتاشا کا کوئی ذاتی ہوائی جہاز نہیں تھا لیکن وہ کئی جہاز استعمال کر سکتی تھیں۔

اس امریکی طیارہ باز سے ملنا دلچسپ ہوگا۔نتاشا کو انگریزی آتی ہے اس لئے مترجم کی

ضرورت نہیں ہوگی۔ جیکلین ظاہر ہے نوجوان نہیں تھیں، ان کی عمر پچاس برس سے بھی اوپر تھی لیکن یقینی وہ بہت ہی ہوشیار انسان معلوم ہوتی ہیں۔ اسی لئے تو اتنی کامیابیاں حاصل کرسکیں۔ یہ معلوم کرنا دلچسپ ہوگا وہ کیا پسند کرتی ہیں اور کیا پسند نہیں کرتیں۔ پھول انہیں کیا مرغوب ہیں؟ بیلے؟ شاعری؟ وہ کس قسم کے کپڑے پہنتی ہیں؟ اس معاملے میں غالباً دونوں کا ذوق ایک سا ہوگا__ سادہ کپڑے۔

کوکران نے کیوں ہوائی جہاز چلانا شروع کیا؟ خود نتاشا کے لئے دلچسپی کے کئی سامان تھے۔ لیکن وہ کافی نہ تھے۔ انہوں نے مصوری شروع کی، اکارڈین بجانا سیکھا، اسکی انگ کی ماہر ہو گئیں، رقص کو بھی آزمایا۔ یہ سب چیزیں دلچسپ ضرور تھیں لیکن کسی سے بھی ان کی تسکین نہیں ہوتی تھی... ہر انسان کسی خاص کام کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ اور جو اسے تلاش نہیں کرتا اس کا انجام بھی اچھا نہیں ہوتا۔ نتاشا کے لئے یہ تھا فضائیہ اور پرواز۔ یہی ان کی زندگی کو بھرپور بنا سکتا تھا۔ اس کے بغیر زندگی بے معنی تھی۔ جہاں تک آزمائشی طیارہ باز ہونے کا تعلق ہے تو یہ بعد کا معاملہ تھا۔ ان کے لئے ضروری تھا کہ ٹیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ ختم کر کے ماسکو کے فضائی انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہو جائیں۔ پھر انہیں کوئی نہیں روک سکے گا! ان سے کہا گیا: ''ہمارے یہاں آزمائشی طیارہ باز عورتیں کبھی نہیں تھیں اور نہ مستقبل میں انہیں رکھنے کا ہمارا ارادہ ہے۔'' لیکن وہ آزما کر تو دیکھیں۔ عورتیں یقینی آزمائشی طیارہ باز ہو سکتی ہیں اور ہوں گی۔

لوگوں اور ان کے کردار کے متعلق نتاشا کے اپنے مخصوص خیالات ہیں۔

''میں بکی آدمی نہیں بلکہ باعمل انسان پسند کرتی ہوں۔ بکی آدمی ہمیشہ اپنے متعلق سوچتا ہے، مثلاً اپنی مقبولیت کے متعلق۔ ہر ایک کو کوشش کرنا چاہئے کہ وہ اپنے آپ سے اور دوسروں سے باقاعدگی کا مطالبہ کرے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنے کام کی جانب ذمے داری کا احساس ہو۔''

غالباً یہی وجہ تھی کہ نتاشا کو اپنے نئے استاد، آزمائشی طیارہ باز، نکولائی نوژدن نہ صرف تجربے کار اتالیق بلکہ باعمل انسان بھی نظر آئے۔ ان کی فضائی زندگی 24 سال سے بھی اوپر تھی، وہ 45 سے زیادہ قسم کے مختلف جہاز چلا چکے تھے، جنگ میں انہوں نے حصہ لیا تھا، سخت طوفانی حالات میں انہوں نے ہوائی جہاز آزمائے تھے۔ اس لئے طویل ہدایتوں، لمبی چوڑی تشریحوں اور غیر محدود

تجزیے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ آسانی سے فوراً ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔ اسی لئے اگرچہ کام مشکل تھا لیکن اطمینان سے پورا کیا جانے لگا۔ پھر اور زیادہ پیچیدہ ٹریننگ شروع ہوئی۔ طیارہ باز کی سیٹ کو باہر کرنا، بیرو چیمبر میں بلندی کے دباؤ کی مشق اور حد سے زیادہ بوجھ کی ٹریننگ، استاد کے ساتھ دوہرے کنٹرول سے آزمائشی پروازیں وغیرہ۔ لیکن دوسروں کے مقابلے میں نتاشا کو ٹریننگ پر کم مدت صرف کرنی پڑی۔ اسے سب سے پہلے تنہا جیٹ ہوائی جہاز چلانے کی اجازت مل گئی۔

نتاشا کے استاد نے جلد ہی تاڑ لیا تھا کہ ان کی شاگرد غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک طیارہ باز ہے۔ خود نتاشا "اپنے کام کی جانب ذمے داری کے احساس" پر عمل پیرا تھیں۔

جیٹ طیارہ باز کے لئے فوری ردعمل انتہائی ضروری ہے۔ اسے فضا میں 42 قسم کی مختلف ناگہانی ضرورتیں پیش آسکتی ہیں۔ اور ہر ضرورت خاص قسم کے فوری ردعمل کا تقاضہ کرتی ہے۔ اس لئے طیارہ باز کو یہ 42 ردعمل از بر یاد رکھنا چاہئے اور خودکار مشین کی طرح انہیں انجام دینا چاہئے۔

جیٹ طیارہ باز میں اپنے کام پر توجہ مرکوز کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہونا چاہئے۔ اگر رفتار 2 ایم (2M) سے آگے ہے تو اس کا مطلب ہے آواز کی رفتار سے بھی دوگنی سے زیادہ۔ طیارہ باز مجبور ہے کہ بڑے رفتار پیما آلے پر اپنی نظر تیزی سے ادھر ادھر دوڑاتا رہے۔ صرف ایک انجن کو کنٹرول کرنے کے لئے پانچ چیزیں استعمال کرنا پڑتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہوائی جہاز پر زمین سے احکام پورے کرنے اور طیارے کی پوزیشن برقرار رکھنے کا مسئلہ الگ ہے۔ طیارہ باز کی نظر ہر جگہ ہونا چاہئے اور اس کی مدد کے لئے کوئی موجود نہیں۔

ہر حالت میں پُرسکون رہے اور برداشت کرنے کی زبردست صلاحیت کی ضرورت ہے... حالات سخت ہوتے ہیں۔ بڑی بلندی کا سوٹ طیارہ باز کو جکڑے رکھتا ہے، بیرونی دباؤ بہت کم ہو جاتا ہے اور تیز رفتاری کی وجہ سے بڑا بوجھ محسوس کیا جاتا ہے۔ پیشانی پر وہ پسینے کے قطرے محسوس کرتی ہیں اور انہیں ہاتھ سے پونچھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن حفاظتی فضائی خود کا شیشہ حائل ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ سوچتی ہیں: "اگر دوسرے لوگ کر سکتے ہیں تو میں بھی کر سکتی ہوں۔"

نتاشا پرخانووا کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دوسرے فضائی معلموں نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "بہترین طیارہ باز کو جن تمام خوبیوں کی ضرورت ہے وہ سب ان میں سموئی ہوئی ہیں۔"

اور وہ خود ان خوبیوں کو ازراہِ تکلف ''پیشے کی ضرورتیں'' کہتی ہیں۔

وہ جہاز کا توازن رکھنے کے واسطے تمام ناگہانی ضرورتوں پر قابو پا سکتی ہیں۔ جہاز کے حد سے زیادہ رفتار پکڑنے کی وجہ سے انجنوں کا کنٹرول سے باہر جانے کا خطرہ، گردش کرنے والی دھریوں کے اکھڑ جانے سے دباؤ کا حد سے نیچے گر جانے کا حادثہ، جس کا مطلب موت ہے، وغیرہ__ ایسی ناگہانی ضرورتوں کی تعداد 42 ہے۔ یہ طیارہ بازوں کے لئے محض حادثے نہیں بلکہ ان کے پیشے کے جوکھم ہیں۔

نتاشا کی ٹریننگ جاری رہی۔ اسی زمانے میں ماسکو کے ہوائی اڈے سے ہزاروں کلومیٹر دور سوویت ''ملکہ خلا'' مشہور خلا باز والینتینا نکولائیوا__ تریشکووا اور جیکلین کوکران کے درمیان دلچسپ گفتگو ہوئی۔ امریکی طیارہ باز نے کہا کہ انہیں یہ اطلاع ملی ہے کہ ایک سوویت خاتون ان کا ریکارڈ توڑنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ قابل ستائش کوشش ہے۔ لیکن وہ جیٹ ہوائی جہازوں کی حدود سے اچھی طرح واقف ہیں، اس لئے انہیں شبہ ہے کہ کوئی مزید بلندی پر اڑ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے لئے دو سو تین سو میٹر اور زیادہ بلند پرواز کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہے... اس وقت مسز کوکران اپنے مدمقابل کا نام نہیں جانتی تھیں۔

نتاشا کو معلوم تھا کہ ریکارڈ توڑنے کے لئے انہیں کوکران سے پانچ سو میٹر سے زیادہ بلند پرواز کرنا کافی ہے۔ لیکن وہ اور معلم نوژدن دونوں کو خدشہ تھا کہ فضائیہ کی عالمی فیڈریشن اس بلندی کو رجسٹر تو کر لے گی لیکن اس کے فوراً بعد کوکران یہ ریکارڈ بھی توڑ ڈالیں گی۔ چنانچہ ویسے ہی ان کے استاد نے پوچھا:

''اچھا، تو فیصلہ کر لیں، ہم کس ریکارڈ کی تیاری کر رہے ہیں؟''

نتاشا نے سنجیدگی سے جواب دیا: ''ایسے ریکارڈ کی جسے کوئی نہیں توڑ سکتا۔''

اس یادگار دن سے پہلے نتاشا کی آخری ٹریننگ پرواز تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ تیار ہیں۔ دوسرے دن وہ کسی کی امداد کے بغیر خود پرواز کریں گی۔ شام کو ''آزمائشی پرواز'' کی گئی__ زمین پر حساب کتاب لگا کر برق رفتار پرواز کی تمام منزلوں کو آزما لیا گیا۔

ایک مرتبہ پھر نوژدن نتاشا کے پاس آئے اور پوچھا: ''کوئی سوال باقی ہے؟''

''شکریہ، سب ٹھیک ہے۔''

رات ختم ہو رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آخری بار طبی معائنہ کیا گیا۔ فضائی چھتری تیار تھی۔ جب انہوں نے بلند پرواز کا سوٹ پہنا تو وہ پرانے زمانے کا مسلح سورما معلوم ہوتی تھیں۔

عام پرواز کا کارڈ۔ اپنی زندگی میں اسے وہ سینکڑوں ہی مرتبہ بھر چکی تھیں ___ پرواز کی مدت، موسم کا حال، راستہ۔

لیکن آج جو کارڈ وہ بھر رہی تھیں ایسا ابھی تک دنیا میں کسی طیارہ باز عورت نے نہیں بھرا تھا!

''روانہ ہونے کی اجازت ہے؟''

''روانہ ہونے کی اجازت دی جاتی ہے۔''

''جہاز کو دوڑانے کی اجازت ہے؟''

''اجازت دی جاتی ہے۔''

''اڑنے کی اجازت ہے؟''

''اجازت دی جاتی ہے۔''

اڑان سے فاصلہ کتنا ہے؟''

''فاصلہ 131۔''

کنٹرول ٹاور سے ہدایتیں دی جا رہی تھیں: ''ٹھیک طرح جاؤ۔'' اپنے راستے پر، اپنے راستے پر۔'' ''منصوبے کے مطابق، منصوبے کے مطابق۔''

زمین پر راڈر سے مستقل رابطہ تھا۔ پھر ہدایت دی گئی:

''اپنا جہاز موڑو۔''

اب وہ ''آزمائشی علاقے'' میں تھیں اور حساس راڈران کے ہوائی جہاز کی رفتار پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ انہیں اس کا یقین کرنا تھا کہ جہاز کی آخری جست آلات کی حدود کے اندر ہو ورنہ ریکارڈ تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

بلندی اور رفتار بالکل منصوبے کے مطابق تھی۔ معیار کے لحاظ سے ابھی ان میں مزید بلند پرواز کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ تمام آلات ''صفر'' دکھا رہے تھے۔ وہ وقت آن پہنچا تھا۔ اب یا کبھی نہیں۔

آسمان کی بلندیوں میں دھات کا چمکتا ہوا نقطہ اپنی دم پر ذرا ٹھہرا اور پھر اوپر اٹھنے لگا۔

اس لمحے جہاز کے آلات نتاشا کے جسم کا حصہ بن چکے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ ان کا بالا صوتی جیٹ جہاز نہیں ہے جو ایک بڑی چاندی کی سوئی کی طرح آسمان کی نیلگوں گہرائیوں کو چیر رہا ہے بلکہ وہ خود ساتویں آسمان میں داخل ہو رہی ہیں۔

17500 میٹر، 18000 ''مسز کوکران، آداب عرض ہے!'' 20000 میٹر! ''اور اوپر، اور اوپر میں اڑ سکتی ہوں، میں جانتی ہوں اڑ سکتی ہوں... '' 21، 22، 23 ہزار! آلات صفر دکھا رہے تھے۔ ''تو اور اوپر!'' 24 ہزار میٹر! جامنی رنگ کا آسمان انہیں چاروں طرف سے لپیٹے ہوئے تھا۔ بہت کم لوگوں کو ایسا حسین نظارہ دیکھنا نصیب ہوا ہوگا۔ یہ آسمان نہیں تھا۔ یہ تو آسمان کے بھی اوپر کوئی اور چیز تھی۔

''فریضہ پورا کر لیا گیا، زمین پر اترنے کی اجازت دیجیے۔''

''اجازت دی جاتی ہے، زمین پر اترو۔''

نتاشا پروخانووا نے اپنے ''ظفریاب سفر'' پر ٹھیک ستائیس منٹ صرف کیے۔

دو گھنٹے کے بعد نتیجے کا اعلان ہوا: چوبیس ہزار تین سو چھتیس میٹر کی بلندی۔ ایک نیا عالمی ریکارڈ قائم ہو گیا!

پرواز کے کارڈ پر آخری اندراج یہ تھا: ''فریضہ قابل اطمینان طور پر پورا کر لیا گیا!''

اب نتاشا نئے ریکارڈ کے خواب دیکھ رہی ہیں۔

آخر ریکارڈ توڑنے کے لئے ہی تو قائم کیے جاتے ہیں۔

از: وتالی گانیوشکن

انسان اور منطق

''ریاضی دانوں کا روسی مکتب ہمیشہ اپنے ایسے عالموں کی وجہ سے ممتاز رہا ہے جو سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور انہیں بڑی ذہانت اور شستگی سے حال کرتے ہیں۔''

نار برٹ وینر

نیویارک کے عالیشان ہلٹن ہوٹل کے بیرونی ہال میں یوری ژوراولیوف خاموشی سے بیٹھے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے۔ ان میں یہ کمال کا وصف ہے کہ وہ اپنے آپ کو ماحول سے فوراً اور یکسر علیحدہ کر کے اپنے خیالات جمع کرنے لگتے ہیں۔

پانچ منٹ کے بعد وقفہ ختم ہونے والا تھا اور وہ دنیا کے بہترین ریاضی دانوں کو پہلی بار مخاطب کرنے والے تھے۔ ان لوگوں کو پہلے وہ محض ان کی تصانیف کے ذریعے جانتے تھے... اور اب انہیں بذات خود نیویارک میں عالمی سائبرنیٹکس کانگرس میں دیکھ رہے تھے۔

ان کے لیکچر کا موضوع مختصر اور واضح تھا: ''ریاضیاتی نظاموں کی منطق۔''

یورا لیکچر ہال میں داخل ہوئے۔ وہ اپنے اندر ایک عجیب انجانی سی الجھن محسوس کر رہے تھے۔ انہیں ایک طرف اس پر فخر تھا کہ وہ اس عالمی فورم میں سوویت سائنس اور سائبیریا کے عالموں کی نمائندگی کر رہے ہیں اور لیکچر کے بیس صفحوں کے ایک ایک لفظ کے لئے ذمے دار ہیں جو وہ انگریزی میں پڑھنے والے تھے۔ دوسری طرف انہیں امریکیوں پر غصہ آ رہا تھا جنہوں نے سوویت ریاضی دانوں کو نیویارک میں ایسی جگہ ٹھہرایا تھا جہاں سے صرف ہتھیاروں کی ایک دوکان نظر آتی تھی...

اگر یورا ژوراولیوف کی صلاحیتوں کو ریاضی کے ایک آسان فارمولے ا=ب+ج+د کی شکل میں بیان کیا جائے تو اس کی تفصیلات یہ ہوں گی: صلاحیت (ا) = علم کی گہرائی (ب) + سخت محنت (ج) + شاعرانہ وجدان (د)۔

ب
علم — ان کا ابتدائی نقطہ ہے،
فکر — بنیادی ضرورت ہے،
اور صداقت — روزمرہ کی روٹی

یورا کا خیال ہے کہ وہ محض اتفاق سے ریاضی داں بن گئے۔ جب وہ اسکول میں پڑھتے تھے تو ادیب یا تاریخ داں بننے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ لیکن ان کی مہربان ریاضی کی ٹیچر نے انہیں اس پر راضی کر لیا کہ وہ ماسکو یونیورسٹی کے شعبہ ریاضیات کو اپنے کاغذات بھیج دیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کلاڈ شانون اور نار برٹ وینر جیسے امریکی ریاضی دانوں نے تقریباً انجانی اور نئی سائنس سائبیرنیٹکس کے متعلق اپنے نظریوں سے سائنس کی دنیا میں غلغلہ مچا رکھا تھا۔

یونیورسٹی میں پہلے ہی دن سے یورا اپنے پروفیسر الکسئی لاپونوف کی پرستش کرنے لگے تھے۔ جب یہ سیاہ ڈاڑھی والے، نیک سیرت انسان، توپ خانے کے سابق افسر بورڈ پر چاک سے بڑے فراٹے سے فارمولے لکھنا شروع کرتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ سے کوئی حیرت انگیز ڈوئیل لڑ رہے ہیں۔ کسی کے لئے بھی ان کی ناقابل تردید منطق، تیز بصیرت اور فیصلے کی گہرائی سے مرعوب نہ ہونا ناممکن تھا۔

طلبا اکثر لاپونوف کے گھر پر تبادلہ خیالات کرنے جایا کرتے تھے۔ ان کے مطالعے کے کمرے میں سیاہ تختہ لٹکا رہتا تھا جو ریاضی کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ اسی پر سوالات حل کئے جاتے تھے۔ وقفوں کے درمیان باتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ پروفیسر فرانسیسی زبان میں لطیفے بیان کرتے، ہیگل کا جرمن میں حوالہ دیتے اور ششدر طالب علموں کو بائرن کی شاعری اصلی زبان میں سناتے تھے۔ اس کے علاوہ تازہ ترین ادب سے بھی وہ روشناس رہتے تھے۔ ہر گفتگو ان کے اس پسندیدہ جملے پر ختم ہوتی تھی: جی ہاں، یہ سب ٹھیک ہے۔ آیئے اب ریاضی کی بات کریں۔"

لاپونوف بڑی مہارت سے آدمی کی صلاحیت کو بروئے کار لاتے تھے، اسے کتابیں سنجیدگی سے پڑھنے پر آمادہ کرتے تھے اور پیچیدہ سوال حل کرنے میں اس کے تحمل اور قوت ارادی کو جانچتے تھے۔

یہ پروفیسر لاپونوف ہی تھے جنہوں نے یورا کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کمپیوٹر کے پروگرام کے متعلق بعض سوالات کا مطالعہ کریں۔ یورا نے اپنے پہلے کورس کے دوران ہی جو کام کیا، اس سے ظاہر ہونے لگا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی صلاحیت کے مالک ہیں اور ہر سوال کے بارے میں ان کی پہنچ انوکھی ہوتی ہے۔ وہ ایک برقیاتی کمپیوٹر پر منطق کے پیچیدہ سوالات کے حل کے لئے بنیادی

اصول معلوم کر رہے تھے۔

یہ تحقیقات کافی لمبی چوڑی نکلی۔ ایک کے بعد دوسری بہار آئی۔ لیکن انہیں اصل جواب نہیں ملا۔ ایک بات ان کے لئے جو کھم بنی ہوئی تھی: پروگرام کو آسان بنانا ناممکن تھا۔ لیکن کیا وہ مسئلے کا حل آسان کر سکتے ہیں؟

ان کے معلم سیرگئی یابلونسکی، سائبرنیٹکس شعبے کے نگراں نے مشورہ دیا: ''تعداد کا نظریہ استعمال کرو۔''

اس مسئلے پر وہ بھی پہلے اکثر غور کر چکے تھے۔ تقریباً پچاس برس پیشتر یہ مسئلہ سامنے آیا تھا اور اسے ''کم سے کم کرنا'' کہا جاتا تھا۔ بظاہر وہ نسبتاً آسان معلوم ہوتا تھا۔ جس منصوبے کے تحت کمپیوٹر بنایا جاتا ہے وہ اشاروں والا فارمولا ہے۔ فارمولا جتنا آسان اور مختصر ہو گا مشین بھی اتنی ہی سستی اور چھوٹی ہو گی۔

یہ موضوع جس کی کھوج نہیں کے برابر تھی اب ژوراولیوف کی سائنسی تحقیقات کا میدان بن گیا۔

ابھی تک برقیائی کمپیوٹروں کے لئے جو فارمولے موجود تھے وہ بھاری بھرکم تھے۔ فی سیکنڈ ایک ارب عمل کرنے کی رفتار سے حساب کتاب کرنے کے لئے ایسی مشین کی ضرورت تھی جس کے اندر ایک مکعب سینٹی میٹر کی جگہ میں دس ارب عناصر بھینچ کر رکھ دیئے جائیں۔ ذرا ایک لمحے کے لئے ان الفاظ پر غور فرمایئے ــــ دس ارب عناصر! ابھی تک اتنی غیر معمولی پیوستگی صرف ایک اعصابی خلیے میں پائی جاتی تھی۔ یہ تھا عصبانیہ (neuron)۔ لیکن دیکھیں کل...

نوجوان کمیونسٹ لیگ کی مرکزی کمیٹی نے ژوراولیوف کو ایک سرٹیفکیٹ دیا ہے۔ اس میں ایک جملہ ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سائنس کی ترقی میں ان کا کتنا زبردست رول ہے: ''وہ ان پہلے سائنس دانوں میں ہیں جنہوں نے ثابت کیا کہ چھوٹے منطقی فارمولے بنانے کے لئے کوئی سادہ عالمگیر بنیادی اصول نہیں ہے۔'' انہوں نے کینڈیڈیٹ (ڈی۔ ایس۔ سی) کی ڈگری کے لئے اسی موضوع پر مقالہ لکھا۔ اسی کے بعد انہوں نے نووا سیبرسک کے ایک نئے سائنسی مرکز میں کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مرکز میں زندگی کی نبض تیز تھی۔ یہاں انہوں نے اپنے آپ کو تحقیقات کے لئے وقف کر دیا۔ اس کے باوجود وہ نوجوان کمیونسٹ لیگ کے کام کے لئے بھی وقت

نکال لیا کرتے تھے۔ یہ یورا ہی تھے جنہوں نے اکادمی کے مرکز میں پہلی کانفرنس اور سمپوزیم کے لئے تیاری کا کام کیا۔ جب نوجوان کمیونسٹ لیگ کی مرکزی کمیٹی نے حکومت کو یہ عرضداشت بھیجی کہ کمپیوٹروں کی ٹکنیک کی ترقی میں نوجوان کمیونسٹ لیگ کے ممبروں نے کس قسم کی شرکت کی ہے تو اس میں بھی انہوں نے حصہ لیا۔ اس کے علاوہ وہ سائبیر نیٹکس کے مسائل پر نوجوان طالب علموں کو لیکچر بھی دیا کرتے تھے۔

نووا سیبر سک میں یورا ژوراولیوف جو قدم بھی آگے بڑھاتے تھے اسے الکسئی لاپونوف کی چوکس نگاہیں برابر دیکھتی رہتی تھیں۔

سائبیر نیٹکس کی سائنس عالم سے بہت زیادہ مطالبہ کرتی ہے۔ پہلے تو سائنس داں کو بحرالعلوم ہونا چاہیئے۔ ساتھ ہی اس میں یہ صلاحیت ہونا چاہیئے کہ دنیا کے تمام مظہروں میں وہ مشترکہ خصوصیات دیکھ سکے۔ اسے نئے خیالات کی تلاش میں جری ہونا چاہیئے، اور شاعرانہ وجدان کا مالک بھی۔

ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ شاگرد اور اس کا قابل تعظیم معلم پڑوسی ہوں۔ طالب علمی کے زمانے کی طرح یورا اب بھی اکثر "بڑے میاں" کے ہاں آیا کرتے تھے۔ نوجوان سائنس داں محبت کے جذبے سے لاپونوف کو اسی نام سے پکارا کرتے تھے۔ عام طور پر چائے پینے کے بعد دونوں میں مساوی حیثیت سے خوب بحثیں ہوتی تھیں (یورا اس وقت سائنس کے ڈاکٹر ہو چکے تھے)

...اب اس ہال میں یورا گھبراہٹ محسوس کر رہے تھے۔ کبھی سائنس کا ڈاکٹر بھی طالب علموں کی طرح ایسا محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن جب وہ اکادمیشن سیرگئی سوبولیف اور وکٹر گلشکوف کے پُرسکون اور مسکراتے ہوئے چہرے دیکھتے تو ان میں اعتماد پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کہتے:

"یورا! سکون سے کام لو۔ سب کچھ ٹھیک ہوگا"...

نووا سیبر سک کے اکادمی مرکز کو دیکھنے کے بعد ایک فرانسیسی صحافی پیئر روندیئر نے لکھا تھا:

"ہماری پریشان حال دنیا میں جہاں موسیقی کے کنسرٹوں میں ریوالور چلنے کی آواز سننا بھی لازمی ہے، اس تیرہ مربع کلومیٹر قطع کو دیکھ کر جہاں صرف پُرامن سائنسی تحقیقات کی جاتی ہیں دل میں ایسے ہی امید افزا جذبات پیدا ہوتے ہیں جیسے کہ بیماری کے بعد خاموشی اور سکون سے۔ ایسی کوششیں دنیا کے لئے نئے پُرامن دور کا پیش خیمہ ہیں۔"

کام چراغ زندگی کوتیل
ج فراہم کرتا ہے، اور فکر اسے روشن کرتی ہے

یورا ژوراولیوف کی تحقیقات کا جوہر کیا ہے؟ اپنی کینڈیڈیٹ کی ڈگری کے واسطے انہوں نے جو مقالہ پیش کیا تھا اس میں یورا نے ثابت کیا تھا کہ برقیائی کمپیوٹروں کے لئے کسی یکساں بنیادی اصولوں کے واحد نظام کا ہونا ممکن نہیں ہے اور پیچیدہ نظاموں کے لئے تفریقی مساوات کا طریقہ غیر مناسب ہے۔

انہوں نے لکھا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ حساب لگانے کی رفتار انتہائی تیز کی جائے۔ قدرت کے راز معلوم کرنے کے لئے انسان کو بہت سی باتیں جاننا چاہئے، مثلاً دماغ میں اعصابی خلیوں کی تعداد، کائنات میں ٹھوس ذروں کی تعداد، سورج سے جو توانائی خارج ہوتی ہے اس کی مقدار وغیرہ۔ ان کے حساب کے لئے اربوں اور کھربوں کے اعداد چاہئے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

—انسان کے دماغ میں عصابیوں (neurons) کی تعداد—10^{10}۔

— سورج ہر سیکنڈ زمین پر جتنی توانائی خارج کرتا ہے— 4×10^{3} حرارت کی اکائیاں (calroies)۔

—ایٹم کے مرکزی حصے کی جسامت—10^{-12} سنٹی میٹر۔

—سیارچوں کا کل وزن—2×10^{13} ٹن۔

اگر روزمرہ کی زندگی سے آسان مثالیں پیش کی جائیں تو اور زیادہ صحیح اندازہ ہوسکتا ہے کہ کمپیوٹر کتنی بیش بہا مدد دے سکتے ہیں۔

خلائی شعاؤں کا مطالعہ کرنے کے سلسلے میں جو پیچیدہ ریاضی کے سوالات پیدا ہوتے ہیں انہیں حل کرنے کے لئے ایک آدمی کو دو ہزار برس چاہئے۔ اور کمپیوٹر مشین انہیں ایک ہفتے میں حل کرسکتی ہے۔

ھیلیم کے ایٹم کے برقی میدان کو ناپنے کے لئے (روایتی طریقوں سے) کم از کم چار ہزار سال درکار ہوں گے۔ مشین کے لئے یہ ایک مہینے کی بات ہے۔

اگر کمپیوٹر حساب کتاب لگانے کا کام اور تیزی سے کرنے لگیں تو؟ پہلے اصولوں کا نظام مقرر کیا جائے اور پھر اس کی بنیاد پر کمپیوٹر مشین تیار کی جائے۔

یورا نے کون سا طریقہ اختیار کیا؟

کسی بھی سائنسی خیال کو عام فہم زبان میں پیش کرنا مشکل کام ہے۔ یہاں ہم یورا سے مدد لینا چاہیں گے۔ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے بڑے دلچسپ انداز میں سمجھا سکتے ہیں۔

''مشین بنانے سے پہلے انسان کو فیصلہ کرنا چاہئے کہ اسے وہ کس مقصد کے لئے استعمال کرے گا ___ زمین جوتنے کے لئے، خلا میں پرواز کرنے کے واسطے یا صرف دوسرے شخص سے بات چیت کرنے میں؟ یہ پہلا نقطہ ہے۔ پھر اسے جاننا چاہئے کہ مشین کن چیزوں سے بنائی جائے گی ___ کن حصوں سے، کن وحدتوں سے۔ یہ ہے دوسرا نقطہ۔ آخر میں ان حصوں کی خصوصیات معلوم کرنا چاہئے۔ منفی خصوصیات کو پیچیدگیاں کہا جائے۔ یہ ہوا نقطہ نمبر تین۔ یہ تینوں باتیں مسئلہ حل کرنے کی بنیادی شرطیں ہیں۔ یہ معلوم کیا جائے کہ مشین کس طرح بنائی جائے کہ وہ زمین جوت سکے، اڑ سکے یا بات کر سکے اور پیچیدگیاں کم سے کم کرنے کی کوشش کریں؟ جواب آسان ہے۔ ممکن ہے مختلف شکلوں کو جانچیں ___ پہلی شکل کو، دوسری شکل کو، تیسری شکل کو... اصولاً ممکن مختلف شکلوں کی تعداد محدود ہوتی ہے۔ لیکن کن معنوں میں؟ اگر ہم کہکشاں کے تمام سالموں، باریک ترین ذرات کو جمع کریں تو ان کے مرکبات کی مختلف شکلوں کے مقابلے میں خود ان کی تعداد بہت ہی کم ہوگی!''

یورا کے سامنے ایک مشکل مسئلہ تھا۔

اس ازلی سوال ''کیا کرنا چاہئے؟'' کے جواب میں سائنس دانوں نے کہا: سادہ کرنے کا عالمگیر طریقہ تلاش کرو۔

اس سلسلے میں کئی اعلیٰ دماغ رکھنے والوں نے اپنے اپنے خیالات پیش کئے۔ لیکن ان کے مشترکہ حملے سے بھی فتح حاصل نہیں ہوئی۔ یورا ژوراولیوف جلد ہی اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ مسئلے کا عالمگیر حل اور طریقہ ممکن نہیں ہے۔ اس کی چابی کو شکل کی مخصوص نوعیت میں حاصل کرنا چاہئے۔ اگر آپ سے ٹیلی فون ایکسچینج کا نقشہ بنانے کو کہا جائے تو یہ ایک بات ہوئی۔ لیکن جب آپ کو بتایا جائے کہ ایکسچینج ایک ہزار لوگوں کے لئے ہے تو یہ بالکل مختلف کام ہو جاتا ہے۔ مخصوص نوعیت کی

ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ مجرد ریاضی (جو الگ الگ حصوں پر مبنی ہوتا ہے) کے ذریعے تفصیلات کا مطالعہ شروع کر دیا گیا...

نوجوان سائنس داں اس مسئلے پر اپنے استاد اور رفیق یابلونسکی اور لوپانوف کے ساتھ کام کرتے رہے۔

اور پھر اخباروں میں لینن انعام دینے والی کمیٹی کا ایک اعلان شائع ہوا۔ اس میں یابلونسکی، لوپانوف اور یورا ژوراولیوف کو سائبر نیٹکس میں کامیابی حاصل کرنے پر مشترکہ انعام دیا گیا تھا۔

ہر سچے سائنس داں کو ہمیشہ اپنے اندر دو متضاد قسم کی خوبیاں سمونا چاہئے: گذشتہ سائنسی کامیابیوں کا علم اور ان کا سنجیدہ مطالعہ اور ساتھ ہی ان میں تازہ نئی چیزوں کو شامل کرنا ___ اگر ضرورت ہو تو جری انداز سے۔ یہ سب باتیں ژوراولیوف کے کردار کی خصوصیات ہیں۔

یہ سمجھانا کہ ریاضی کی تخلیقات کیسے ہوتی ہیں آسان بات نہیں ہے۔ اس دنیا میں نہ خطرناک تجربات کرنے پڑتے ہیں اور نہ مہم پسند سفر۔ یورا اور ان کے ساتھی صبح سے اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بڑا بارآور ثابت ہوتا ہے۔ پھر دوپہر میں وہ سکشن میں ساتھ بیٹھتے ہیں، اپنے خیالات کو اکٹھا کرتے ہیں اور ان پر تبادلہ خیال کرتے ہیں۔

جب لوگ یورا اور ان کے ساتھیوں کا ذکر کرتے ہیں تو یہ خیال آتا ہے: ان کے گروپ کا ہر ممبر ایک چنگاری ہے اور وہ سب مل کر شعلہ بناتے ہیں۔ ان میں یورا کے ہم عمر ریاضیاتی طبیعیات کے کینڈیڈیٹ یورا واسی لیف ہیں جو ہر جگہ موجود رہتے ہیں۔ ایک اور بڑے اچھے منتظم وتالی کوروبکوف ہیں جنھوں نے ''ڈیڈیکنڈ'' کا مشہور مسئلہ حل کیا ہے۔ تیسرے رفائیل کریچیوسکی ہیں، وہ اپنے کام میں نئے پن اور ہوشیاری کے لئے مشہور ہیں اور جو تھیٹر کے رسیا بھی ہیں۔

اگر آپ یورا سے پوچھیں کہ وہ اپنے ریاضی کے کام کے اوقات کے علاوہ کب خوش ہوتے ہیں تو آپ کو یہی جواب ملے گا:

''جب میں اپنے ساتھیوں کی نئی دریافتوں پر ان کی خوشی میں شریک ہوتا ہوں۔''

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ 'پاگل پن کے' خیالات سے ایک اہم سائنسی دریافت کی داغ بیل پڑتی ہے۔ سائنس داں ان خیالات پر جھپٹتا ہے، اپنے ذہن کی بھٹی میں انہیں پگھلاتا ہے اور پھر انہیں کسی منطقی نظام میں ڈھالنے کی پوری طرح کوشش کرتا ہے۔

... کانگرس کے صدر نے ان کا نام پکارا۔ وہیں ہال میں یورا کے امریکی ہم منصب بھی بیٹھے ہوئے تھے جو ان کے لیکچر کو خوب غور سے سنیں گے اور ایک ایک لفظ کو تولیں گے۔

''ہمت سے کام لو، ہمت سے کام لو...'' یوری ژورا ولیوف نے اپنے آپ سے کہا۔ ہال میں بالکل خاموشی تھی۔ ان کی ٹھہری ہوئی آواز اور معتدل اشاروں سے خود اعتمادی اور جوش کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا...

صحیح معنوں میں ایک سائنس داں جتنی زیادہ دریافت کرتا ہے
اتنا ہی وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے ابھی بہت کچھ کرنا ہے

سائنس کی دنیا میں جوش کیا چیز ہے؟

یہ ایک سعی پیہم ہے، جب آدمی دل و جان سے سائنس کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیتا ہے... سچی تخلیق کے لئے وقت کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ ایک بے باک خیال کی چمک سے دوسرے خیالات کی کرنیں پھوٹتی ہیں اور نووا سیبر سک کے قریب سائنسی شہر اکادیم گورودوک میں حیرت انگیز دریافتیں جنم لینے لگتی ہیں۔

شام کے وقت اگر آپ یورا کے گھر جائیں تو ان کی بیٹی نتاشا سے یقینی آپ کی ملاقات ہوگی۔ ابھی وہ بچی ہی ہے لیکن غضب کا کھوجی دماغ پایا ہے۔ اس کے ہر سوال میں سائنس کا رجحان ملتا ہے:

''ابا، آتش فشاں پہاڑ کیسے کام کرتا ہے؟ پتی کیسے بڑھتی ہے؟ آسمان نیلا کیوں ہوتا ہے؟ موٹر کیسے چلتی ہے؟''

نتاشا ابھی پہلی جماعت میں پڑھتی ہے لیکن آسان مساوات اور سوال حل کر کے خوب خوش ہوتی ہے۔ وہ متوازی اور غیر متوازی خطوط کو پہچانتی ہے اور مثلث اور مربع میں فرق سمجھ سکتی ہے۔ والدین کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ نتاشا کو سائنس سے غیر معمولی رغبت ہے۔

ماشاءاللہ پورا خاندان ہی ریاضی کا شوقین ہے۔ یورا کی بیوی لودا ریاضی میں کینڈیڈیٹ کی ڈگری حاصل کر رہی ہیں۔ اور یورا کبھی کبھی مشیر کی حیثیت سے ان کی مدد کرتے ہیں، کبھی نقاد کی طرح۔

یوری ژورا ولیوف کے کام کا دن تین حصوں پر منقسم ہوتا ہے ــــ انسٹی ٹیوٹ، یونیورسٹی اور

طبیعیات وریاضی کا اسکول۔

نوواسیبر سک کی یونیورسٹی سے طالب علموں کے پہلے گروپ کو فارغ ہوئے چند ہی برس گزرے ہیں۔ وہ آج کل جدید سائنس کے مسئلے حل کرنے میں مصروف ہیں۔ ان میں یورا کے کئی شاگرد بھی ہیں۔ ولودیا یواسکنیف اپنے شعبے میں تمام آزمائشوں پر پورے اترے اور اب وہ کامیابی سے کینڈیڈیٹ کے مقالے پر کام کررہے ہیں۔ ایسی دسیوں ہی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

یونیورسٹی سے یورا براہ راست طبیعیات وریاضی کے اسکول پڑھانے کے لئے آتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب اسکول کے طالب علم شمالی امریکہ کے قدیم باشندوں ___ موھکان، اریوکواس اور کومانچ ریڈ انڈین قبیلوں کی کہانیوں سے بے حد متاثر ہوتے تھے اور مہم پسندی کے جوش میں گھروں سے بھاگ جایا کرتے تھے اور آج وہ اسی مہم پسندی کی اسپرٹ میں طبیعیات و ریاضی کے اسکول آتے ہیں۔ ساشا دبیلوف کی مثال لیجئے۔ جب وہ چھٹی کلاس میں پڑھتا تھا تب ہی سے وہ دوسروں کے مقابلے میں پیچیدہ سوالات حل کرنے کی بہتر صلاحیت ظاہر کرنے لگا تھا۔ پھر اس کا یونیورسٹی میں داخلہ ہوگیا۔

جب امتحان کے دن ہوتے ہیں تو یورا خاص طور پر اپنے شاگردوں سے بات چیت کرنے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ شاگرد بڑی عزت سے انہیں یوری ایوانووچ کہتے ہیں۔ ان کے چالاک سوالات، حاضر دماغی، طبع رسائی اور اپنے مضمون سے دلچسپی کے سبب شاگرد ان کا احترام کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے ممتحن کے مدمقابل آنا آسان نہیں!

یورا جب انسٹی ٹیوٹ میں پڑھا کرتے تھے تو انہیں آئن اسٹائن پر بڑا رشک آتا تھا جنہوں نے صرف چھبیس برس کی عمر میں اپنا نظریہ اضافیت قائم کیا۔ وہ گالوئس پر بھی رشک کرتے تھے، جنہوں نے بیس برس کی عمر میں تیرہ لافانی صفحات لکھے تھے۔

اور اب پندرہ پندرہ سال کے طالب علم جو سائنس داں بننے کی راہ اختیار کررہے ہیں وہ یوری ژوراولیوف پر رشک کرتے ہیں۔ وہ صرف تیس برس کے تھے جب ان کی 40 تصنیفات شائع ہوچکی تھیں اور وہ انسٹی ٹیوٹ کے اہم ترین شعبے، ریاضی کے شعبے کے سربراہ تھے!

ان کے گھر میں دو تحفے رکھے ہیں جو قیمتی بھی ہیں اور علامتی بھی۔ ان میں سے ایک چار بعد والی کائناتی فضا کا نقرئی ماڈل ہے۔ جب یورا نے کینڈیڈیٹ کی ڈگری حاصل کی تھی تو ان کے دوستوں نے یہ انہیں تحفے کے طور پر دیا تھا۔ یہ ماڈل اس نوجوان سائنس داں کے خاص موضوع کا

حسین مرقع ہے۔قریب ہی نوجوان کمیونسٹ لیگ کے دس خلائی بیجوں میں سے ایک بیج ہے جسے خلانورد ولیری بیکوفسکی نے انہیں پیش کیا تھا۔

یورا کے استاد اکادمیشن سوبولیف نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ وقت آئے گا جب اخباروں میں علیحدہ اسپورٹ کے صفحے کی طرح سائنس کا صفحہ بھی شائع کیا جائے گا۔سائبیریا اور سوویت مشرق بعید کے اخبار اسکول کے طالب علموں کے لئے ریاضی کے سوالات پر پورے کے پورے صفحے چھاپنے لگے ہیں۔اس سے آنے والے زمانے کی جھلک ملتی ہے۔

اکثر یوری ژوراولیوف طبیعیات اور ریاضی کے مقابلوں کے ڈائرکٹر مقرر کئے جاتے ہیں۔ یہاں کام بہت زیادہ ہوتا ہے۔انہیں تحقیقاتی سوالات سوچنا پڑتے ہیں اور فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ کس نوجوان سائنس داں کو کس شہر میں بھیجا جائے۔ہونہار نوجوانوں کی تلاش ملک کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

نوجوان سائنس دانوں کی کانفرنس ہو یا نوجوان کمیونسٹ لیگ کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس (جس کے وہ ممبر ہیں) یورا ہمیشہ ثابت قدم، چوکس اور ناقابل بیان طور پر پُرسکون رہتے ہیں۔

ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کا خیال ہے کہ ریاضی اور شاعری کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں۔ اس کے متعلق یورا کی اپنی رائے ہے ___ وہ سمجھتے ہیں کہ ادراک اور احساسات اسی طرح ایک دوسرے کے تابع اور ایک دوسرے کے لئے ضروری ہیں جیسے زمین کے لئے سورج۔ایک دوسرے کے بغیر وہ بے معنی ہیں۔

...چالیس منٹ پورے ہو چکے تھے۔ان کا لیکچر ختم ہو گیا تھا۔یورا اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔پھر ان کے نقاد، لحیم شحیم سفید بالوں والے مشہور امریکی پروفیسر میک کلسکی آئے۔انہوں نے بھرے ہوئے ہال پر آہستہ آہستہ نظر دوڑائی، اور کہا:

''شاندار! اس لیکچر میں میں صرف ایک اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔میری رائے میں علم ریاضی کی اس شاخ کو، جس پر ابھی مسٹر ژوراولیوف نے روشنی ڈالی ہے، ترقی کرنے کا ہر ممکن موقع ملنا چاہیے۔''

یورا نے جھینپتے ہوئے اپنی آنکھیں مخصوص انداز میں بھینچ لیں۔یہ ہمیشہ وہ اس وقت کیا کرتے ہیں جب ان کی ضرورت سے زیادہ تعریف کی جاتی ہے...

از: ولادیمیر ملیوتینکو

ہوائی جہازوں کے سوویت موجد

آندرئی توپولیف

"چند برسوں ہی میں جیٹ طیارے ریلوں کا مقابلہ کرنے لگیں گے" یہ پیش گوئی چھٹی دھائی کے شروع میں سوویت جہازوں کے ایک مشہور ڈیزائن ساز نے کی تھی۔

اگر یہ بات آندرئی نکولائیوچ توپولیف کے منہ سے نہ نکلی ہوتی تو بہت سے لوگ سنجیدگی سے ان الفاظ کی صداقت پر شبہ کرتے۔ لیکن یہ الفاظ خود توپولیف کی زبان سے نکلے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ معاملے کا تعلق مستقبل بعید سے نہیں بلکہ مستقبل قریب سے تھا۔ چنانچہ جب اکتوبر انقلاب کی چالیسویں سالگرہ کی آمد آمد تھی تو سوویت یونین کے ہوائی اڈوں پر ایک نیا ہوائی جہاز نمودار ہوا ــ یہ تھا "تو ــ 114" دنیا کا سب سے بڑا مسافر ہوائی جہاز۔ سفید بازوؤں والے اس دیوپیکر کے مختلف نمونے تھے جو 120 سے لے کر 220 تک مسافر لے جاسکتے تھے، یعنی عام ریل گاڑی میں جتنے مسافر بیٹھتے ہیں ان کے نصف سے زیادہ!

سوویت اقتدار کے پہلے ہی دنوں میں ولادیمیر ایلیچ لینن اس بات کا خواب دیکھا کرتے تھے کہ دنیا کا پہلا اشتراکی ملک طیارے بازی میں ایک زبردست طاقت بنے۔ کمیونسٹ پارٹی اور سوویت عوام نے اس خواب کو حقیقت بنادیا ہے۔

سوویت طیارہ سازی کی تاریخ کے کئی باب آندرئی توپولیف کے نام سے علیحدہ نہیں کیے جاسکتے۔

فضائیہ کی دنیا میں قدم رکھے ہوئے توپولیف کو ساٹھ برس سے بھی زیادہ ہوچکے ہیں۔ وہ تویر شہر کے ایک وکیل کے گھر میں پیدا ہوئے اور اعلیٰ ٹکنیکل اسکول میں پڑھنے کے لئے ماسکو آئے۔ یہاں جلد ہی نوجوان طالب علم نے علم سے اپنا انتہائی شوق اور ٹکنیک کی جانب رجحان ظاہر کیا۔ "روسی فضائیہ کے بانی" نکولائی ژوکوفسکی کی نظر ان پر پڑی۔ آندرئی توپولیف فضائی کلب کے سرگرم ممبر ہوگئے جسے ژوکوفسکی نے قائم کیا تھا۔

ان بیتے ہوئے دنوں کو یاد کرکے آندرئی توپولیف لکھتے ہیں: "ہم نے ہوائی ظلے بنانے سے ابتدا کی۔ ژوکوفسکی نے خاکوں کی تیاری اور ڈیزائن کا کام میرے سپرد کیا۔ فضائی کلب کے ممبروں کی امداد سے اور خود ژوکوفسکی کے زیر نگرانی میں نے یہ کام پورا کرلیا۔ پھر ہوائی

حرکیات (Aerodynamics) کی تجربے گاہ قائم کی گئی اور اس کی بنیاد پر مرکزی انسٹی ٹیوٹ کی داغ بیل پڑی۔''

اعلیٰ ٹکنیکل اسکول سے مستقبل کے طیارہ ساز نے کامرانی کا سفر شروع کیا۔ لیکن یہ آسان نہیں تھا۔ ہوائی جہاز کے زمین سے اوپر اٹھنے اور ہوا میں اڑنے کے سلسلے میں جتنا کام کرنے اور غیر محدود حساب کتاب لگانے کی ضرورت تھی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

اس ابتدائی زمانے میں ہی نکولائی ژوکوفسکی ہوائی جہاز بنانے کے لئے ایک تجرباتی فیکٹری اور ڈیزائن کا مرکز قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ تو نہ ہو سکا لیکن تخمینے اور تحقیقات کا بیورو بن گیا جہاں سائنسی کھوج کی جانے لگی۔ یہیں نوجوان توپولیف کی غیر معمولی صلاحیت منظر عام پر آئی۔ اس سلسلے میں ژوکوفسکی دلچسپ روشنی ڈالتے ہیں: ''تخمینے اور تحقیقات کا بیورو دو برس تک کام کرتا رہا۔ ہمارے کارکنوں کی ٹیم میں چھ لوگوں نے نئے ہوائی جہاز کے ماڈل تیار کئے اور وہ میکینکل انجینئر ہو گئے۔ ان میں ہمارے ایک نوجوان انجینئر توپولیف کا ہوائی کشتی کا ماڈل قابل ذکر ہے۔ اس کی پانی سے اوپر اٹھنے اور پانی پر اترنے کی ٹکنیک روسی انجینئروں کے لئے بالکل نئی ہے۔ توپولیف کی تحقیقات کی بدولت، جس کی بنیاد انگریزوں کے تجربے ہیں، یہ طریقہ عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ اگر اس تحقیقات کو شائع کر دیا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ روسی فضائیے کا نام خوب روشن ہوگا۔''

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ توپولیف نہ صرف گلائیڈر کے ڈیزائن ساز تھے بلکہ انہیں اڑایا بھی کرتے تھے۔

یہ 1909ء کا واقعہ ہے۔ ایک دن لفورتوفسکی پارک میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ وہاں بہت سے طالب علم جمع تھے۔ وہ بڑی گرما گرمی سے بحث کر رہے تھے کہ گلائیڈر زمین سے اوپر اٹھنے میں کامیاب ہوگا یا نہیں، کتنی دیر تک وہ ہوا میں اڑ سکے گا اور اس پرواز کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ فضائیہ کے ابتدائی دن تھے اس لئے لوگوں کا جوش و خروش بے محل نہیں تھا۔ توجہ کا مرکز آندرئی توپولیف بنے ہوئے تھے۔ اس دن ان کی پہلی پرواز تھی۔ انہوں نے گلائیڈر کو زمین سے دس پندرہ میٹر کی بلندی پر اڑا لیا۔ اپنی جگہ یہ خود ایک بڑی کامیابی تھی۔ لیکن جب وہ دوسری مرتبہ اڑنے لگے تو گلائیڈر ٹوٹ گیا۔

نوجوان متجسس انجینئر اپنے لائق استاد کے لئے تحسین اور عزت کے بے پناہ جذبات رکھتے

تھے۔ان کی نگرانی میں انہوں نے گیارہ برس تک کام کیا۔ آندرئی توپولیف لکھتے ہیں: ''ژوکوفسکی کی رہبری میں پڑھنا اور کام کرنا میرے لئے ایک عظیم اور بے نظیر تجربہ تھا۔اس نے میرے مستقبل کے انتخاب میں فیصلہ کن اثر ڈالا۔''

عظیم اکتوبر انقلاب کے فوراً بعد ژوکوفسکی نے لینن کو تجویز کی تھی کہ فضائیہ کا تحقیقاتی انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے۔ چنانچہ سوویت حکومت نے ماسکو میں ایسے سائنسی تحقیقات کا مرکز کھولنے کا فیصلہ کیا۔اس کا نام ہوائی اور آبی حرکیات (Aero0-hydrodynamics) کا مرکزی انسٹی ٹیوٹ تھا۔

توپولیف کو وہ دن یاد ہے: ''میں کبھی نہیں بھولوں گا کہ ژوکوفسکی نے اور میں نے یہ خبر سن کر کیسے جشن منایا۔ہم اسکول کے بچوں کی طرح خوش خوش اعلیٰ معاشی کونسل کی عمارت سے باہر آئے۔ آخر کار حکومت نے ہمارا کام سرکاری طور پر تسلیم کرلیا تھا۔ہم محسوس کررہے تھے کہ اب ہم مستقبل کے متعلق اعتماد کے ساتھ منصوبہ بنا سکیں گے۔ایسے ہی خیالات ہمارے دماغوں میں موجزن تھے اور ہم بھوکے ماسکو کی خاموش سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس واقعے کے اعزاز میں کوئی خاص بات ہونا چاہئے۔ پھر یکایک مجھے یاد آیا کہ پروفیسر میٹھا دہی بے حد پسند کرتے ہیں۔ ہماری قسمت اچھی نکلی ___ کوزنیتسکی سڑک پر ایک چھوٹا سا خستہ حال کیفے تھا۔وہاں ہمیں دہی اور شہد مل گیا، لیکن آسمان سے باتیں کرنے والی قیمت پر! پروفیسر کے سامنے ان کی مرغوب چیز تھی اور وہ بڑے جوش وخروش سے نئے انسٹی ٹیوٹ کے عملی مسائل پر بحث کرنے لگے۔''

بہت جلد مرکزی انسٹی ٹیوٹ فضائی نظریے کا مرکز اور تحقیقات کی اہم جگہ بن گیا۔اس کے سربراہ پروفیسر نکولائی ژوکوفسکی تھے اور ان کے مشہور مددگاروں میں نوجوان توپولیف کا نام بھی شامل تھا۔ 1920ء کے آخر میں توپولیف نے طیارہ بازی، آبی فضائیے، تعمیری تحقیقات اور نمونے سازی کا شعبہ منظم کیا۔اب پھر وہ اپنے دلچسپ کام، یعنی ہوائی جہازوں کے ڈیزائن بنانے میں مشغول ہوگئے۔شروع میں حالات بہت مشکل تھے۔انہیں ٹھنڈے کمروں میں مہینوں کام کرنا پڑتا تھا۔اس سلسلے میں توپولیف لکھتے ہیں: ''ہمارے پاس ٹھیک سے نہ کام کرنے کی جگہ تھی اور نہ سامان۔اس کی کسر ہماری غیر محدود توانائی اور جوش وخروش سے نکل جاتی تھی۔ابتدا ہی سے ہم نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ہم اپنے آپ کو صرف نظریات تک محدود نہیں رکھیں گے۔ہمارے کام کا

مقصد جلد از جلد اپنے ملک کو عملی نتائج سے فائدہ پہنچانا تھا۔''

ان کی غیر محدود توانائی اور جوش و خروش سے یکے بعد دیگرے مشکلات دور ہوتی گئیں۔ اسی زمانے میں توپولیف کی تخلیقات شروع ہوئیں ــــ ''آن ت ــــ 1'' برقی ہوائی جہاز اور ''آن ت ــــ 1'' آبی ہوائی جہاز۔ چند ہی برس کے بعد ''آن ت'' مسافر ہوائی جہاز تیار ہونے لگے۔

آن ت ان کے نام کے ابتدائی حرف ہیں ــــ آندرئی نکولائیوچ توپولیف۔ بہت جلد یہ حروف سوویت یونین اور اس کے باہر بھی مشہور ہو گئے۔

اگر ہم آندرئی توپولیف کے ان ابتدائی دنوں کا ذکر کرنا چاہیں جب وہ ہوائی جہازوں کے ڈیزائن بنا رہے تھے تو بار بار ہمارے سامنے ایک لفظ آئے گا۔ یہ ہے ''پہلا''۔

''پہلا قدم''، ''پہلی پرواز''، ''پہلا تجرباتی کارخانہ''، ''پہلا دھات کا ہوائی جہاز''، ''پہلا جنگی طیارہ'' وغیرہ وغیرہ۔

آیئے، ذرا سوویت یونین کی فضائی تاریخ کے اولین صفحوں کو الٹیں۔

... ''آن ت ــــ 1'' سوویت یونین کا پہلا اسپورٹ ہوائی جہاز۔

... ''آن ت ــــ 3'' دھات کا بنا ہوا اصولی طور پر بالکل نئے قسم کا ہوائی جہاز جس کا انجن سوویت یونین میں تیار کیا گیا تھا۔

... ''آن ت ــــ 4'' جو ''ت ب ــــ 1'' بھی کہا جاتا تھا۔ یہ پہلا سوویت بھاری بمبار ہوائی جہاز تھا۔ 1929ء میں اس نے ''سوویت دیس'' کے نام سے ماسکو سے نیویارک پرواز کی۔ یہ سائبیریا، بحیرہ اخوتسک اور آلیوتین جزیروں سے گزرا تھا۔ اس جہاز نے 22 ہزار کلومیٹر کا فاصلہ 142 گھنٹوں میں طے کیا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد تین انجنوں والا مسافر ہوائی جہاز ''آن ت ــــ 9'' استعمال کیا جانے لگا۔ دراصل یہ ''آن ت ــــ 4'' کی ترقی یافتہ شکل تھی۔ اب سوویت یونین نے باہر کے بنے ہوئے جہاز درآمد کرنا بند کر دیئے۔ یہ ہوائی جہاز دوسرے ملکوں میں بھی مشہور ہو گیا۔ سوویت طیارہ بازوں نے ''آن ت ــــ 9'' پر جو ''سوویتوں کے بازو'' کے نام سے مشہور تھا یورپ کے کئی دارالخلافتوں تک پرواز کی۔

امریکی رسالے ''ایوی ایشن'' (Aviation) نے لکھا: ''روسی ہوائی جہاز ''سوویت دیس'' کے افسر اور عملہ واقعی بہادر اور تجربے کار طیارہ باز ہیں۔ قومی فضائی صنعت کی اصل پیداوار کی حیثیت سے ہم دلچسپی کے ساتھ ان کے ہوائی جہاز کا مطالعہ کریں گے۔''

امریکیوں نے اس ہوائی جہاز کو دیکھ کر خوشی اور دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کا ڈیزائن خرید لیا۔

عالمی میدان میں نوخیز سوویت طیارہ ساز صنعت کی پہلی کامیابیاں ''آ ن ت __ 4'' اور ''آ ن ت __ 9'' سے شروع ہوئیں۔ توپولیف اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر اس نئی سوویت صنعت کو اپنے راستے پر ترقی کرنا ہے تو اسے یورپ کی نقل نہیں کرنا چاہئے۔ اپنے کام کے ابتدائی زمانے ہی میں انہوں نے یہ فریضہ پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انہوں نے اس پر زور دیا کہ بڑے اور نئے ہوائی (Aerodynamic) نلکے تیار کیے جائیں اور طیاروں کے ڈیزائن بنانے والوں اور دھات کے ماہروں کے درمیان عملی تعاون ہو تا کہ دھات کے ہوائی جہاز کے لئے دھاتوں کے ہلکے سے ہلکے مرکب دریافت ہو سکیں۔ اس سے ہم توپولیف کی زبردست دور اندیشی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

توپولیف نے تقریباً ہر سال ایک نئے ہوائی جہاز کا ڈیزائن بنایا۔ ''آ ن ت __ 20'' (''میکسم گورکی'') اور ''آ ن ت __ 25'' (''طویل فاصلے کا ریکارڈ'') سے نئے قسم کے بڑے ہوائی جہازوں کا دور شروع ہوا۔ یہ ''آ ن ت __ 25'' ہی تھا جس میں مشہور سوویت طیارہ بازوں چکالوف، بائیڈوکوف، بیلیاکوف نے اور پھر بعد میں گروموف، یوماشیف اور دانیلن نے قطب شمالی پار کر کے براہ راست امریکہ تک پروازیں کی تھیں۔

اس کارنامے کی تحسین کا غلغلہ مشکل ہی سے کم ہونے پایا تھا کہ توپولیف کا بنایا ہوا ایک اور نیا ہوائی جہاز منظر عام پر آیا۔ یہ تھا چار انجن والا ''آ ن ت __ 42''۔ یہ پہاڑ کا پہاڑ ہوائی جہاز امریکہ کے ''اڑن قلعوں'' سے بہت پہلے بنایا گیا تھا اور اس کی رفتار اس زمانے کے لڑاکو جہازوں سے بھی زیادہ تیز تھی!

اگر ہم اس صدی کی تیسری دہائی کی سوویت طیارہ ساز صنعت کی پیدائش اور قیام کا دور کہیں تو چوتھی دہائی سوویت طیارہ بازوں کی شاندار کامیابیوں، عالمی ریکارڈوں اور جری پروازوں کا زمانہ تھی۔

پھر 1941ء آیا اور اس کے ساتھ ہی جنگ۔ جنگ کے طویل اور مشکل برسوں میں نازیوں کا قلع قمع کرنے میں سوویت فضائیے نے جو رول ادا کیا اسے سب جانتے ہیں۔ توپولیف کے جہاز اس سخت آزمائش پر بھی پورے اترے۔ خاص کر ان کا بنایا ہوا دو انجن والا ''تو_2'' (توپولیف نام کے پہلے دو حرف) بمبار ہوائی جہاز طویل فاصلہ طے کر کے دشمن کے علاقے کے بالکل اندر داخل ہو کر بمباری کر سکتا تھا۔

جنگ ختم ہوگئی۔ زندگی نئے نئے تقاضے کرنے لگی۔ اب جہاز کے ڈیزائن بنانے والوں کا فریضہ یہ تھا کہ ہوائی جہاز کی رفتار بڑھائیں۔ پانچ سال میں سوویت ڈیزائن سازوں کی ایک ٹیم نے جس کے رہبر آندرئی توپولیف تھے پسٹن انجن کے طویل پرواز کرنے والے کئی قسم کے بھاری ہوائی جہاز تیار کیے۔ یہ بڑی کامیابی تھی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات صاف تھی کہ پسٹن انجن کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور جلد ہی جیٹ انجن اس کی جگہ لینے والا ہے۔ اس کے باوجود کہ جیٹ انجن بنانے کا کام بے حد پیچیدہ تھا اور کئی ٹکنیکی اور تنظیمی مشکلات درپیش تھیں آندرئی توپولیف یہ اہم کام حیرت انگیز کم وقت میں پورا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چھٹی دہائی میں ان کے زیر رہنمائی سوویت طیارہ ساز صنعت جیٹ ہوائی جہاز بنانے میں اتنی ہی پیش پیش تھی جتنی کہ پچیس برس پہلے عام طیاروں کی تعمیر میں۔

جب مسافر بردار جیٹ ہوائی جہاز ''تو_104'' فضائی اڈوں پر نمودار ہوا تو بہت جلد وہ ساری دنیا میں مشہور ہو گیا۔ طیارہ بازوں نے اس کی ٹکنیکی خوبیوں کو سراہا اور مسافروں نے آرام و آسائش کی تعریف کی۔ اس جہاز کی انتہائی رفتار فی گھنٹہ 950 سے 1000 کلومیٹر تھی۔ وہ عام طور پر 800 کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے اڑتا تھا اور کہیں ٹھہرے بغیر 3000 کلومیٹر تک کا فاصلہ طے کر سکتا تھا۔

جب ''تو_104'' لندن کے ہوائی اڈے پر اترا تو اس کے متعلق ایک انگریزی اخبار نے لکھا: ''حضرات! حسین اور متناسب شکل کا مسافر جیٹ ہوائی جہاز ''تو_104'' آج کل انگلستان آیا ہوا ہے۔ روس نے تو مغرب کو مبہوت کر ڈالا... یہ پچاس نشستوں والا جہاز اتنا جدید ہے کہ امریکہ یا انگلستان کو ایسا جہاز بنانے کے لئے کم از کم تین سال درکار ہوں گے۔ شہری اور فوجی ماہر جو اسے دیکھنے کے لئے آئے تھے پہلے تو حیرت کے مارے سکتے میں کھڑے رہے، پھر

جب سنبھلے تو اس کی تعریف میں سیٹی بجانے لگے۔ جیٹ کے تیر جیسے ڈیزائن اور پیچھے گرے ہوئے بازوؤں کی وجہ سے اس کی رفتار ہمارے برطانوی ''کومیٹ'' کے مقابلے میں 100-70 میل فی گھنٹہ زیادہ ہے۔ اس کے اندر جگہ کشادہ ہے، اس میں ''کومیٹ کی بہ نسبت 14 زیادہ مسافر بیٹھ سکتے ہیں اور وہ مغربی طیاروں کے مقابلے میں زیادہ آرام دہ ہے۔ اس پر لطف یہ کہ ہمارے ''کومیٹ'' میں چار انجن ہیں اور اس میں صرف دو۔''

تمام دنیا نے ''تو__104'' سے جتنی دلچسپی لی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ آندرئی توپولیف نے اس کا جو انوکھا ڈھانچہ بنایا تھا اسے خاص طور پر پسند کیا گیا۔ کئی بیرونی کمپنیوں نے اس عجیب وغریب ہوائی جہاز کے بارے میں تکنیکی معلومات حاصل کیں۔

''تو__104'' نے اٹھارہ دن میں گیارہ عالمی ریکارڈ قائم کیے اور ان سب کو بین الاقوامی فضائی فیڈریشن نے تسلیم کیا۔ کئی آزمائشی طیارہ بازوں اور انجینئروں نے جن میں آلاشیف، کووالیف، سوخوملن، گروزدوف، بیندیروف اور ملخاسیان شامل تھے ریکارڈ قائم کرتے وقت اور اس کے بعد جہاز کی پرواز کو بہت سراہا۔

پھر توپولیف اور ان کی ٹیم کس کام میں مصروف ہوئی؟ ان کے لئے دنیا پر فتح حاصل کرنے والا یہ ہوائی جہاز اب محض ماضی کی بات بن گیا۔ ان کے سامنے نیا کام تھا۔ وہ ایسے جہازوں کے ڈیزائن بنانے میں مصروف ہو گئے جن کی رفتار اور زیادہ تیز ہو، وہ مزید بوجھ اٹھا سکیں اور طویل تر فاصلے طے کریں۔

جلد ہی دنیا میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ سوویت یونین نے سب سے بڑا ٹربوپروپ ہوائی جہاز تیار کر لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے ابتدائی حروف ''تو'' تھے اور اس کا نام ''تو__114'' تھا۔ یہ وہی ہوائی جہاز ہے جس سے ہم نے اپنی داستان شروع کی اور جسے توپولیف اور ان کے شرکاء کار نے عظیم اکتوبر انقلاب کی چالیسویں سالگرہ کے اعزاز میں بنایا تھا۔ اس کے متعلق خود توپولیف سے سنئے:

'''تو__114' کا ڈیزائن بناتے وقت ہم نے خاص توجہ اس پر دی کہ جہاز کی بوجھ اٹھانے کی صلاحیت بڑھے، وہ فاصلہ زیادہ طے کرے اور کفایت شعار ہو۔ اس کے علاوہ ڈیزائن بنانے والوں نے اس بات کا بھی لحاظ رکھا کہ مسافروں کو زیادہ سے زیادہ آرام ملے۔''

''تو__114'' ٹربو پروپ ہوائی جہاز ہے۔ دنیا میں ابھی تک ایسا کوئی جہاز نہیں بنایا گیا تھا جو اس کے ٹربو پروپ انجنوں کی طاقت کا مقابلہ کر سکتا۔ اشترا کی محنت کے ہیرو کوزنیتسوف کی رہنمائی میں انجینئروں کے بیورو نے اس کے شہہ زور انجن تیار کئے۔ جہاز میں بلا رکے بین براعظمی پروازوں مثلاً ماسکو سے رنگون یا ماسکو سے نیویارک تک کی پروازوں کے وقت زیادہ سے زیادہ 120 مسافر اور مختصر سفر میں جیسے ماسکو سے بحیرۂ اسود تک 220 لوگ بیٹھ سکتے ہیں۔ طویل پرواز اور مختصر پرواز کرنے والے جہازوں کی ساخت میں فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے قسم کے جہازوں میں مسافروں کی کیبن کی شکل مختلف ہے۔

1959ء کی گرمیوں میں نیویارک میں سوویت نمائش کھلی۔ ان ہی دنوں ''تو__114'' نے رکے بغیر پہلی بیرونی طویل پرواز کی۔

آندرئی توپولیف نے فیصلہ کیا کہ وہ خود اس طویل بین براعظمی سفر کے پیچیدہ جہاز رانی کے حالات میں اپنی نئی ''تخلیق'' کی پرواز کی خوبیاں آزمائیں گے۔

یہ دیو پیکر ہوائی جہاز بڑے جاہ و جلال سے ٹھیک بلندی پر اٹھا اور اس نے شمالی مغرب کا راستہ اختیار کیا۔ چند گھنٹوں کے بعد وہ بحر اوقیانوس کے بے کراں سمندر کے اوپر اڑ رہا تھا۔ اور سامنے امریکہ کا مشرقی ساحل تھا۔

پرواز بہت کامیاب رہی۔ ماسکو سے نیویارک کے ہوائی اڈے تک پہنچنے میں ''تو__114'' نے گیارہ گھنٹے اور چھ منٹ صرف کئے۔

نیویارک کے ہوائی اڈے پر یہ ہوائی جہاز سوویت سائنس اور انجینئرنگ کی کامیابیوں کا ناقابل تردید ثبوت تھا اور سوویت عوام کا پنکھ والا قاصد۔

امریکہ میں قیام کے دوران مقامی نامہ نگار، فوٹو گرافر، صحافی، فضائیہ کے ماہر اور مختلف فرموں کے نمائندے آندرئی توپولیف اور ان کے ہوائی جہاز کو گھیرے رہتے تھے۔ ان سے اکثر یہ سوال کیا جاتا تھا:

''آنے والے ''تو'' کا کون سا نمبر ہوگا؟''

توپولیف مذاق سے جواب دیتے:

''نمبر اتنی اہمیت نہیں رکھتا۔''

اب جو "تو" نمودار ہوا وہ "تو__124" تھا۔ یہ درمیانہ فاصلوں کی پرواز کرنے والا، عام استعمال کا مسافری جیٹ ہوائی جہاز ہے۔ یہ نسبتاً چھوٹے ہوائی اڈوں پر اتر سکتا ہے جن کے رن وے بڑے نہیں ہوتے۔ سوویت یونین کا شہری فضائیے ایروفلوٹ اسے استعمال کر رہا ہے اور یہ مسافروں میں بہت مقبول ہے۔

حال ہی میں ایک اور نیا "تو" ہوائی جہاز بنایا گیا ہے۔ یہ "تو__134" ہے جس کی کامیابی سے آزمائشی پروازیں ہو چکی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس قسم کے جہاز ابھی بڑی تعداد میں تیار نہیں کئے گئے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے 1965ء میں پیرس میں عالمی فضائی مظاہروں اور خلائی تحقیقات کی نمائش دیکھی ہے وہ "تو__134" کی کارکردگی سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔

پیرس کے ہوائی اڈے "لے بورژے" پر آندرئی توپولیف نے اپنے نئے مسافر بردار جیٹ ہوائی جہاز "تو__144" کا مظاہرہ کر کے دنیا کو دنگ کر دیا۔ اس کی رفتار آواز کی رفتار سے تقریباً دوگنی ہے__ یعنی ڈھائی ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ۔ یہ 20 کلومیٹر کی بلندی پر اڑتا ہے اور رکے بغیر ساڑھے چھ ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کر سکتا ہے۔ اس میں دو کیبن ہیں جن میں 120 مسافر بیٹھ سکتے ہیں۔ جہاز چلانے کے لئے تین آدمیوں کا عملہ کافی ہوتا ہے۔

توپولیف نے جب سے ہوائی جہازوں کے ڈیزائن بنانا شروع کئے ہمیشہ وہ نئی سے نئی چیز کی تلاش میں رہے ہیں۔ کھوج کے اسی جذبے نے انہیں ہر وقت بے قرار رکھا، اسی نے انہیں مجبور کیا کہ وہ خواب دیکھیں، پیش گوئی کریں اور ایسی چیزوں کا تصور کریں جو عام انسان ہنوز نہیں کر سکتا۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ چشم بصیرت کو ایسی چیزیں دکھائی دیتی ہیں جن سے کوئی انقلابی اور نئی دریافت حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن جرأت، قوت ارادی اور بے پناہ خود اعتمادی کے بغیر دلیر خیالات کو حقیقت بنانا ناممکن ہے۔ خوش قسمتی سے آندرئی توپولیف میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔ اپنے مشہور استاد سے انہوں نے قدرت کے رازوں کی گہرائی تک پہنچنا، صبر کے ساتھ ان کی چھان بین کرنا، انہیں سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا سیکھا ہے۔ توپولیف اپنے بلند اور آزاد سائنسی خیال کے لئے اور اسے عملی جامہ پہنانے کی غرض سے پیچیدہ تکنیکی مسئلے حل کرنے کی پیہم کوششوں کے لئے مشہور ہیں۔ اپنے ساتھ کام کرنے والوں میں بھی وہ اس خوبی کی بڑی قدر کرتے ہیں۔

ان کے قریبی مددگاروں نے اس فہرست میں ایک اور خوبی شامل کی ہے۔ جب دوسرے

لوگ کئی مشکل سوال حل کرنے میں بالکل ناکام ہو جاتے ہیں اور انہیں حل تقریباً ناممکن نظر آتا ہے تو توپولیف اس کی ''تشخیص'' کر کے اپنی حیرت انگیز قابلیت کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک مثال لیجئے۔

یہ کئی برسوں کی بات ہے۔ توپولیف کے ایک جہاز کی انتہائی رفتار معلوم کرنے کے لئے آزمائشی پروازیں کی جا رہی تھیں۔ آزمائشی طیارہ باز نے شکایت کی کہ جہاز کی دم پھڑ پھڑاتی ہے۔ سائنس دانوں اور انجینئروں نے دم کا ایک ایک حصہ چھان ڈالا لیکن وہ یہ نقص دور نہیں کر سکے۔ آندرئی توپولیف نے کافی غور کرنے کے بعد مشورہ دیا کہ ہوا کے بہاؤ کو ضبط میں لانے کے لئے جہاز کی دم پر دھات کے دو پترے چسپاں کر دیئے جائیں۔ جہاز کی پھر آزمائش کی گئی۔ پھڑ پھڑاہٹ بالکل غائب ہو چکی تھی۔

توپولیف کے اس قسم کے مشورے محض قیاس آرائی نہیں بلکہ یہ نتیجہ ہیں ان کے گہرے علم کا، ان کے سیر حاصل تخیل کا، برسوں کے تجربات اور وجدان کا۔

''فضائیہ خلائی پروازوں کا گہوارہ ہے'' آندرئی توپولیف لکھتے ہیں۔ ''خلا میں پروازیں دراصل ان پروازوں ہی کا تسلسل اور ارتقا ہیں جنہیں فضا سے بھاری مشینیں یعنی ہوائی جہاز انجام دیتی ہیں۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان خلا پر فتح حاصل کرے گا اور ہمارے نظام شمسی کے دوسرے سیاروں میں آباد ہو گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے طیارہ بازی کی ترقی رک جائے گی اور وہ مزید کامیابیاں حاصل نہیں کرے گی۔ سوویت یونین میں طیاروں کے ڈیزائن ساز ایسے نئے ہوائی جہاز بنانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں جو پہلے سے زیادہ دور، زیادہ بلندی پر اور زیادہ رفتار سے پرواز کریں گے۔ مجھے اپنے ہم وطنوں سے پیار ہے اور میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں پر یقین رکھتا ہوں۔ ہماری پارٹی اور حکومت عالمی امن کے لئے کوشاں ہے، یہ میری ذاتی سرگرمیوں اور عقائد کی آواز بازگشت ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ میری تمام صلاحیتیں اور علم اپنے مادر وطن کی مزید خوشحالی کے لئے وقف ہوں اور میں اس کی نمایاں کامیابیوں پر سرشار ہوتا ہوں۔''

سوویت فضائیہ کے اس کار آزمودہ شخص کے سینے پر آٹھ آرڈر آف لینن آویزاں ہیں۔ 80 سال کے اس بزرگ انسان نے دو مرتبہ اشترا کی محنت کے ہیرو کا خطاب حاصل کیا ہے۔ سوویت یونین کی سائنس اکادمی کے اس ممبر کو پانچ بار ریاستی انعام دیئے گئے ہیں۔ انہیں لینن انعام ملا ہے اور وہ اعلیٰ سوویت کے رکن ہیں۔

بین الاقوامی فضائی فیڈریشن کی 52 ویں جنرل کانفرنس نے آندرئی توپولیف کو بہترین ڈیزائن کے مسافر بردار ہوائی جہاز ''تو_104'' اور 200 نشستوں والے بین براعظمی ٹربو جیٹ جہاز ''تو_114'' بنانے پر سونے کا تمغہ دیا۔ اس موقعے پر اپنی تقریر میں انہوں نے کہا:

''طیارہ سازی کی دنیا میں ترقی لوگوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس لئے میں اس اعزاز کو ہماری پوری ڈیزائن ساز ٹیم کے کام کی قدر شناسی سمجھتا ہوں جس میں ماہر اور عام مزدور سب ہی شامل ہیں۔''

ایک فرد جو 140 سے زیادہ قسم کے ہوائی جہاز بنانے میں حصہ لے چکا ہو جب اپنے بارے میں اتنی انکساری سے کام لے تو اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آندرئی توپولیف جس ٹیم کے ساتھ کام کرتے ہیں ان کے دل میں اس کی بڑی قدر ہے اور ٹیم کے لوگ بھی انہیں عزت اور تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور یہ ستائش محض ان کے علم، تجربے اور صلاحیت کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ لوگوں سے ان کی مفاہمت اور پاس ولحاظ کے سبب سے بھی ہے۔ مشکل لمحوں میں بھی وہ کوئی نہ کوئی دلچسپ فقرہ کس دیتے ہیں جس سے لوگوں کے دل خوش ہو جاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ طیارہ باز کو ''اچھی حالت'' میں ہونے کے لئے انہوں نے پرواز ملتوی کر دی۔ آندرئی توپولیف بے انتہا مصروف انسان ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ورکشاپوں میں گھومنے کے لئے اور مزدوروں سے گپ شپ کرنے کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ اگر کوئی نوجوان انجینئر نئی تجویز کرتا ہے تو اس پر وہ توجہ دیتے ہیں اور بحث کرنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں بحث کے ذریعے سے ہی صداقت کا پتہ چلتا ہے۔

کیا وہ اپنے ووٹروں کو یاد رکھتے ہیں جنہوں نے انہیں اعلیٰ سوویت کا ممبر چنا ہے؟ ان پر بھی وہ اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔ ان کا جو بھی مسئلہ آندرئی توپولیف اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں ووٹروں کو اطمینان ہوتا ہے کہ وہ جلد ہی حل ہو جائے گا۔

جن لوگوں کا ان سے اکثر واسطہ پڑتا ہے وہ کہتے ہیں: ''پہلی نظر میں آندرئی توپولیف کچھ خشک معلوم ہو سکتے ہیں اور کبھی کرخت بھی۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ انہیں ہر بات کی فکر رہتی ہے__ مزدوروں کے رہائشی مکانوں کی تیز تعمیر، نوجوان انجینئروں کی تخلیقی ترقی اور زندگی میں ان کی کامیابیاں۔

توپولیف سوویت بلغاریائی دوستی کی انجمن کے سرگرم صدر ہیں۔ اپنے انتھک کام کے صلے میں انہیں بلغاریہ کا سب سے اعلیٰ اعزاز، گیورگی دمتروف کا تمغہ ملا ہے۔ بلغاریہ اور اس کے لوگوں سے انہیں بڑی محبت ہے۔ اس کی ابتدا لڑکپن سے ہوئی تھی جب ان کے دادا، جو روس اور ترکی کی جنگ میں لڑ چکے تھے، بلغاریہ کے عوام کی بہادری کے قصے اور ان کی روسی لوگوں کے ساتھ دوستی کے واقعات سنایا کرتے تھے۔ کئی برسوں کے بعد سوویت وفد کے سربراہ کی حیثیت سے توپولیف بلغاریہ گئے اور خود اپنی آنکھوں سے اس ملک کو دیکھا جس کی آزادی کے لئے ان کے دادا لڑے تھے۔

توپولیف شوقیہ فوٹوگرافر بھی ہیں۔ جب بھی وہ ملک سے باہر جاتے ہیں تو ہر دلچسپ چیز کو فلماتے ہیں۔ وہ بلغاریہ میں تھے تو انہوں نے ایک چھوٹی فلم بنائی اور بعد میں اسے اپنے دوستوں کو دکھایا۔ فلم اتنی پسند کی گئی کہ توپولیف نے اسے سوویت بلغاریائی دوستی کی انجمن کو بطور تحفہ دے دی۔

... جب ان کے کام کا دن ختم ہوتا ہے تو اکثر وہ اپنے بیٹے الکسئی کے ہمراہ گھر واپس آتے ہیں۔ الکسئی تکنیکی سائنس کے ڈاکٹر ہیں اور اپنے والد کے ہی ڈیزائن بیورو میں کام کرتے ہیں۔ جب وہ فلیٹ میں داخل ہوتے ہیں تو پوتے لپک کر چلاتے ہیں: ''دادا جان آ گئے! دادا جان آ گئے!'' ان لمحوں سے ان کی گھریلو زندگی شروع ہوتی ہے۔ آندرئی توپولیف بچوں سے بے انتہا پیار کرتے ہیں۔ اور بچے بھی یہ محسوس کرتے ہیں۔ ان کی شوقیہ بنائی ہوئی فلموں میں ہیرو ان کے پوتے ہوتے ہیں۔ وہ خاندان کے ساتھ ایسی فلمیں بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتے ہیں۔

ہر شوقیہ فوٹوگرافر کا اپنا پسندیدہ موضوع ہوتا ہے۔ آندرئی توپولیف کا یہ موضوع ماسکو ہے۔ وہ ماسکو کے پرانی باسی ہیں، انہیں اس شہر سے محبت ہے۔ یہاں جو بھی نئی نئی تبدیلیاں ہوئی ہیں انہیں دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوتے ہیں۔

(آندرئی توپولیف کا 1972ء میں انتقال ہو گیا۔)

سیرگئی ایلیوشن

ابھی کچھ دن ہوئے مجھے ایک دستاویزی فلم دیکھنے کا موقع ملا جو جنگ کے زمانے میں بنائی گئی تھی۔ کئی کیمرہ مینوں نے اس میں ان دنوں کے مصائب دکھائے ہیں جن سے محاذ پر سپاہی اور عقب میں لوگ دوچار تھے۔ اس جھنجھوڑ دینے والی فلم کا نام ہے ''جنگ کا ایک دن''۔ یہ جنگ کے ایک عام دن__13 جون 1942ء کے واقعات کو پیش کرتی ہے۔

یہ صبر آزماں سال تھا۔ دشمن سوویت یونین کے اندر داخل ہو گیا تھا، سپاہی محاذ پر سخت اور خونریز لڑائیاں لڑ رہے تھے اور عقب میں سوویت لوگ بہادری سے جانفشاں کام کر رہے تھے تاکہ اپنے وطن کی عزت اور آزادی بچائی جائے۔

فلم میں ایک طیارہ ساز فیکٹری کا منظر دکھایا گیا ہے۔

ورکشاپیں۔ ہر جگہ ہوائی جہاز جوڑے جا رہے ہیں۔ پھر منظر بدلتا ہے۔ اب ہمیں فیکٹری کی بڑی روش سے ہوائی جہاز اٹھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہوائی جہاز کے ڈیزائن بنانے والے سیرگئی ایلیوشن اور آزمائشی طیارہ باز ولادیمیر کوکینا کی کی نظریں جہاز کی پروازوں پر جمی ہوئی ہیں۔ ہوائی جہاز ورکشاپوں میں تیار ہونے کے بعد براہ راست محاذ کا رخ کرتے ہیں۔ وہاں ان کا بے چینی سے انتظار کیا جاتا ہے۔ یہ نیچے اڑنے والے ''ایل__2'' نامی حملہ آور ہوائی جہاز ہیں۔ سوویت فوجی انہیں ''اڑنے والے ٹینک'' اور نازی ''سیاہ موت'' کہا کرتے تھے۔

''ایل__2'' توپوں، مشین گنوں اور بموں سے مسلح ہوتا تھا۔ سوویت طیارہ باز اس کی مدد سے فاشستوں کے ٹینکوں، خودکار توپوں، توپ خانوں، چھوٹے زمیں دوز قلعوں، تو پچیوں، لاریوں اور ریلوں کو تباہ کرتے تھے اور دشمن کے لڑاکو ہوائی جہازوں سے ٹکریں لیتے تھے۔ یہ جہاز جس پر حفاظتی خول ہوتا تھا سوویت جہازوں میں سب سے زیادہ خطرناک اور ساتھ ہی معتبر سمجھا جاتا تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ اپنا فریضہ پورا کرنے کے بعد گولیوں سے چھدا ہوا وہ ذرا لڑکھڑاتا اپنے اڈے پر واپس لوٹتا۔

سوویت فوج کی پسپائی کے مشکل لمحوں میں حملہ آور سوویت ہوائی جہازوں نے لڑائی کے محاذ پر نمودار ہو کر فیصلہ کن رول ادا کیا۔ ''ایل__2'' نے اپنی پہلی جنگی پروازوں ہی کے دوران

اتحادی فوجوں کا دل موہ لیا تھا اوران کے فوجی ماہر اس پر رشک کیا کرتے تھے۔ یہ حیرت کی بات نہیں تھی اس لئے کہ اس وقت تک کسی اور ملک کے پاس ایسا نیچا اڑنے والا حملہ آور ہوائی جہاز نہیں تھا جو اس نئے سوویت جہاز کا مقابلہ کر سکتا۔

جنگ سے کئی برس پہلے ایلیوشن نے طویل فاصلوں پر اڑنے والے بمبار ''ایل __4'' کی تیاری شروع کر دی تھی۔ جب وہ میدان جنگ کے اوپر نظر آیا تو کافی مشہور ہوا۔ سوویت طیارہ باز اس کے ذریعے دشمن کے اندرونی علاقوں میں گھس کر فاشستوں کے فوجی ٹھکانوں کو تباہ و برباد کرتے تھے، جرمن بحری جہازوں کو ڈبوتے تھے اور جاسوسی پروازیں کیا کرتے تھے۔ تمام محاذوں پر جو ہوائی جہاز استعمال کیے جاتے تھے ان میں ''ایل __2'' اور ''ایل __4'' کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی تھی۔ صرف جنگ کے زمانے میں تقریباً چالیس ہزار ''ایل __2'' تیار کئے گئے تھے۔

سیرگئی ایلیوشن نے ہوائی جہازوں کے ڈیزائن بنانے کا کام تیسری دہائی میں شروع کر دیا تھا۔ انہیں ایک حد تک آندرئی توپولیف کا ہمعصر سمجھنا چاہئے۔

ایلیوشن دولوگدا شہر کے قریب ہی ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں وہ چرواہے کا کام کرتے تھے۔ 11 برس کی عمر میں وہ شہر آ گئے۔ سیرگئی کو خود یہ یاد نہیں ہے کہ انہوں نے پیٹ بھرنے کے لئے کیا کیا کام کئے۔ انہوں نے زمین کی کھدائی کی، نئی ریلوے لائن کی جائے تعمیر پر حاضری نویس رہے اور آخر میں زار کی فوج میں سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہو گئے! یہاں کی قسمت کا ستارا چمکا اور وہ سینٹ پیٹر سبرگ (اس وقت لیننن گراد) کے ہوائی اڈے پر پہرہ دینے لگے۔ اسی جگہ ایلیوشن نے اس زمانے کے مشہور طیارہ باز اوتو چکن اور لیبید یف کو دیکھا، یہیں انہوں نے پہلی بار زبردست بازوؤں والی مشینوں کا مسحور کن شور سنا جو انہیں پُر اسرار اور جوش و خروش کی طلسمی دنیا میں لے آئیں۔

اس وقت روس میں پہلا ''فضائی ہفتہ'' سینٹ پیٹر سبرگ میں منایا جا رہا تھا۔ شہر طیارہ بازوں اور فضائیہ کے شائقین سے بھرا ہوا تھا۔ سیرگئی ایلیوشن پروازوں کو بڑے اشتیاق سے دیکھا کرتے تھے۔ انہیں دیکھ کر ان کے خیالات بھی دور دراز پرواز کرنے لگتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان ہی دنوں انہوں نے طیارہ باز بننے کا فیصلہ کیا ہو، یا اس سے بھی زیادہ جرات آمیز کام کا __ خود جہاز بنانے کا۔

پھر انقلاب کے طوفانی دن آئے۔لوگ ہتھیار ہاتھوں میں لے کر عظیم اکتوبر انقلاب کے اصولوں کی مدافعت کرنے لگے۔ ایلیوشن اس ٹرین کے نگراں تھے جو مختلف محاذوں پر ہوائی جہازوں کی مرمت کے لئے گھومتی پھرتی تھی۔

آخر کار وقت آیا جب وہ پڑھائی کے بارے میں سوچ سکتے تھے۔انہوں نے ژوکوفسکی نامی فوجی فضائی انجینئرنگ اکادمی میں تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔اس کے لئے داخلے کا امتحان پاس کرنا تھا۔وہ دن رات کتابیں پڑھنے اور نقشے بنانے میں مصروف ہو گئے۔ان کا خواب پورا ہو گیا۔ اب وہ اکادمی کے طالب علم تھے۔

ایلیوشن خوب سمجھتے تھے کہ ہوائی جہازوں کا اچھا ڈیزائن ساز بننے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ اس کے لئے وسیع، گہرے اور ہمہ پہلو علم کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اسے حاصل کرنے کے لئے انسان جتنی ممکن کوشش کرسکتا ہے انہوں نے کی۔ان کی کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ وہ اکادمی سے کامیابی کے ساتھ فارغ ہوئے۔ پھر سیرگئی ایلیوشن سوویت یونین کے فوجی فضائیہ میں کام کرنے لگے۔ یہاں انہیں فضائیہ کی تکنیکی سائنسی کمیٹی کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ جب ملک پر فاشست حملے کا خطرہ منڈلا رہا تھا تو ایلیوشن نے ایسے بمبار اور حملہ آور ہوائی جہاز تیار کئے جنہوں نے بعد میں جنگ کا رخ بدل دیا اور جن کی ضربوں نے جرمن حملہ آوروں کے دل دہلا دیئے۔

جنگ جاری تھی۔لیکن سیرگئی ایلیوشن امن کے دنوں کے لئے جہاز تیار کرنے میں مشغول تھے۔امن کا سب کو انتظار تھا اور اس پر انہیں یقین تھا۔"ہمیشہ آگے دیکھو"__ اس مقولے کو خاص طور پر ہوائی جہازوں کے ڈیزائن ساز اچھی طرح سمجھتے ہیں اس لئے کہ جدید صنعتوں میں طیارہ سازی کی صنعت انتہائی تیز رفتاری سے ترقی کر رہی ہے۔

حکومت نے سیرگئی ایلیوشن اور جہاز کے ڈیزائن سازوں کے ان کے گروپ کو ایک نئے مسافر بردار ہوائی جہاز بنانے کا کام سپرد کیا۔اس میں وہ جوش و خروش سے جٹ گئے۔

جنگ ختم ہو گئی۔ایک نیا دو انجن والا جہاز "ایل__12" ہوائی اڈوں پر نظر آیا جس کے انجن کا ڈیزائن شویتسوف نے بنایا تھا۔سوویت یونین میں وہ اندرونی پروازوں کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔اس زمانے کے لحاظ سے اس ہوائی جہاز کی رفتار کافی تیز تھی__ 325 کلومیٹر فی گھنٹہ۔اور وہ دو ہزار کلومیٹر تک کا فاصلہ طے کرسکتا تھا۔اس میں جدید قسم کے ہوائی جہاز رانی کے

آ لے نصب تھے (خراب موسم کے لئے اور دھند میں جہاز اتارنے کے لئے خاص خاص آ لے)۔ وہ سوویت شہری فضائیے کا ایک عرصے تک خاص جہاز سمجھا جاتا تھا۔ اس کی جگہ پھر ''ایل __ 14'' نے لے لی جو زیادہ جدید تھا اور نئے آلوں سے لیس۔ اس میں مسافروں کے لئے آرام کی زیادہ سہولتیں بھی تھیں۔

ہوائی جہاز بنانے والوں کی کوئی بھی داستان دراصل ایک خیالی منصوبہ پورا ہونے، پیچیدہ خاکوں پر بے خواب راتیں گزارنے اور ہزاروں ہی انجینئروں، مستریوں اور مزدوروں کی مستقل مزاجی سے کام کرنے کی داستان ہوتی ہے۔ ہر نئے ہوائی جہاز میں ڈیزائن بنانے والے کی زندگی کا ایک حصہ مل سکتا ہے۔

جنگ کے بعد جن لوگوں نے فضائی پریڈوں کو دیکھا ہے وہ سب متفق ہیں کہ سوویت فضائیے نے کافی ترقی کی ہے۔ اب اس میں آواز سے زیادہ تیز رفتار لڑاکو جہاز، راکٹ بردار طیارے اور ''ایل __ 28'' جیٹ بمبار سب ہی شامل ہیں۔

958.ء میں پہلی مرتبہ ''ایل __ 18'' مسافر بردار جیٹ ہوائی جہاز ماسکو کے ہوائی اڈے دنوکووہ میں نظر آئے تھے۔ جلد ہی وہ مسافروں میں کافی مقبول ہو گئے۔ یہ بلا پس و پیش کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہمارے زمانے کے جدید ترین شہری ہوائی جہازوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ جہاز کی پرواز کی رفتار 650 کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ چار ٹربو پروپ انجن اسے چلاتے ہیں جنہیں کوزنیتسوف نے بنایا ہے۔ ''ایل __ 18'' جہاز رکے بغیر 3700 سے 6500 کلومیٹر تک کا فاصلہ طے کر سکتا ہے۔ اس مشہور جیٹ ہوائی جہاز کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اسے پرواز کرنے یا اترنے کے لئے بہت بڑی روش کی ضرورت نہیں ہوتی۔

''ایل __ 18'' دنیا کے تمام براعظموں کی سرزمین کو چھو چکا ہے اور کئی عالمی فضائی نمائشوں میں اسے پیش کیا گیا ہے۔ دنیا کے بہت سے اخبارات نے اس کی غیر معمولی پرواز کی صلاحیتوں کی تعریف کی ہے۔ آج کل چودہ ملکوں میں ''ایل __ 18'' ہوائی جہاز استعمال کیا جا رہا ہے۔

ہوائی جہاز کے ڈیزائن ساز کا ذہن کسی ایک نقطے پر آ کر نہیں رک جاتا۔ وہ مستقل خیالی منصوبے بناتا رہتا ہے، نئے نئے نمونوں کے خواب دیکھتا ہے، تکمیل کی جانب بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بات قابل فہم ہے اور سیرگئی الیوشن بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں کئے جا سکتے۔ چنانچہ

تھوڑے عرصے ہی میں چار انجن کے، بحر اوقیانوس کو پار کرنے والے، مسافر بردار، نئے طاقتور جیٹ ہوائی جہاز ''ایل__62'' کا ڈیزائن ان کے دفتر کی میز پر موجود تھا۔

اس ہوائی جہاز کے بنانے کی ابتدائی منزل میں کئی چھوٹے ماڈل تیار کئے گئے تھے جن میں سے ایک آج بھی سیرگئی ایلیوشن کی میز کی زینت ہے۔ بعد میں چند تجرباتی جہاز فیکٹری میں تعمیر کئے گئے اور تجربے کار طیارہ بازوں نے ان کی پرواز کو جانچا۔ 186 نشستوں والا جہاز ''ایل__62'' تمام آزمائشوں پر کامیابی سے پورا اترا اور عالمی فضائی مظاہرے اور خلائی تحقیقات کی نمائش میں اس کا مظاہرہ ہوا۔ وہ فی گھنٹے 850 سے 900 کلومیٹر تک کی رفتار سے اڑ سکتا ہے اور ماسکو سے براہ راست نیویارک یا ولادیوستوک پہنچ سکتا ہے۔

''مسافر ہوائی جہاز کا ہر ڈیزائن ساز کوشش کرتا ہے کہ اس کا بنایا ہوا جہاز زیادہ سے زیادہ قابل بھروسہ، کم خرچ اور لوگوں کے لئے آرام دہ ہو'' __ سیرگئی ایلیوشن کہتے ہیں۔ ''ایک بہت بڑے جدید ہوائی جہاز، مثال کے طور پر ''ایل__62'' بنانے کے لئے کئی سال تک ڈیزائن سازوں، سائنس دانوں، آزمائشی طیارہ بازوں اور ہوائی جہاز بنانے والوں کو پیہم سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ آپ یہ ذہن میں رکھیں کہ ایک جہاز کی ''عمر طبعی'' دس بارہ سال ہوتی ہے اور اس عرصے میں وہ تقریباً 2 کروڑ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتا ہے۔ اسی لئے جہاز کی خوب ٹھونک بجا کر جانچ کرنا چاہئے __ ایک ایک حصے، ایک ایک سسٹم کی اور ایک ایک آلے سے لے کر پورے سالم جہاز کی۔''

ہوائی جہاز کے ڈیزائن ساز کو ہرفن مولا ہونا چاہئے __ وہ نظریہ دان بھی ہو اور انجینئر بھی، ٹکنیشن بھی ہو اور معاشیات کا ماہر بھی، فن کار بھی ہو اور طیارہ باز بھی۔ شرائط ابھی ختم نہیں ہوئیں۔ اسے اعلیٰ درجے کا منتظم بھی ہونا چاہئے جو صنعتی پیداوار کی اونچ نیچ سے واقف ہو۔ سیرگئی ایلیوشن بالکل ایسے ہی انسان ہیں۔

سیرگئی ایلیوشن ستر سے زیادہ بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں ان تمام باتوں کا مختصر ذکر بھی نہیں کیا جا سکتا جو انہوں نے دیکھیں یا کیں، یا ان تمام مشکلوں کا جو ان کے راستے میں حائل ہوئیں یا تمام کامیابیوں کا جو انہوں نے حاصل کیں۔ لیکن اگر آپ ان کا فکر میں ڈوبا ہوا اور ذرا سخت چہرہ دیکھیں، تو یہ سب چیزیں آپ کو آئینے کی طرح اس چہرے میں جھلکتی ہوئی نظر

آ جائیں گی۔ جب وہ مسکراتے ہیں تو چہرے کی سختی فوراً غائب ہو جاتی ہے لیکن پیشانی پر زخم کا وہ داغ باقی رہتا ہے جو 35 سال سے زیادہ وہاں موجود ہے۔ اس کی کہانی اشترا کی محنت کے دوبار ہیرو اور ایلیوشن کے قریبی دوست طیارے کے ڈیزائن ساز یا کو ولیف سناتے ہیں:

''ہم نے 1935ء میں رابطے کا ایک نیا ہوائی جہاز بنایا۔ یہ خوبصورت، آرام دہ اور چلانے میں آسان تین نشستوں کا ہوائی جہاز تھا۔ ایک فضائی مقابلے میں جب ہوائی جہازوں نے سیواستوپول سے ماسکو تک پرواز کی تو اس نے بھی شرکت کی اور انعام حاصل کیا۔ ایلیوشن کو یہ جہاز بہت پسند آیا، اس لئے کہ انہیں اکثر ماسکو سے ایک سست رفتار اور چھوٹے سے جہاز ''پو__2'' میں مسلسل سفر کرنا پڑتا تھا۔ انہوں نے اپنے استعمال کے لئے یہ جہاز مانگا اور ہم نے خوشی سے انہیں دیدیا۔

''سیرگئی ایلیوشن کئی بار اس جہاز پر ماسکو واپس آ کر ہمارے بہت شکر گزار ہوئے۔ سب ٹھیک چلتا رہا۔ ایک روز شام کو ہوائی اڈے کے منیجر رائیو یچر نے مجھے ٹیلی فون کیا:

''ہمیں ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ماسکو جاتے ہوئے ڈیزائن ساز سیرگئی ایلیوشن کا جہاز گر پڑا۔ وہ کوئی سرخ رنگ کا جہاز اڑا رہے تھے۔ یہ تمہارا تو نہیں ہے؟''

جس جہاز پر ایلیوشن پرواز کر رہے تھے اس کا رنگ واقعی سرخ تھا۔ میرا خون خشک ہو گیا۔ ایلیوشن حادثے کا شکار تو نہیں ہو گئے؟ آخر ہوا کیا؟ میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے میرے پیر زمین پر جم گئے ہوں۔

پھر ہمیں یہ اچھی خبر ملی کہ جہاز تو تباہ ہو گیا لیکن طیارہ باز زندہ ہے! کچھ دنوں بعد ایلیوشن سے میری ملاقات ہوئی۔ ان کے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ انہیں زندہ دیکھ کر مجھے بے پناہ خوشی ہوئی۔

انہوں نے کہا: ''ساشا، مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ تمہارا جہاز تو پرندے کی طرح اڑتا تھا۔ لیکن جب تیل ہی نہ ہو تو انجن کیسے کام کر سکتا ہے۔ اس 'تفصیل' کو نہیں بھولنا چاہئے۔''

''ہوا یہ کہ تیل بالکل ختم ہو جانے سے ہوائی جہاز کا انجن یکایک بند ہو گیا اور رات کی تاریکی میں ایلیوشن کو اسے انجانی زمین پر اتارنا پڑا۔ بعد میں پتہ چلا کہ کوئی مستری صاحب جہاز میں تیل بھرنا بھول گئے تھے! اسی حادثے کا یہ نشان ان کی پیشانی پر ابھی تک نظر آتا ہے اور اس افسوسناک

واقعہ کی یاد دلاتا ہے۔''

سیرگئی ایلیوشن نے بڑا شاعرانہ مزاج پایا ہے۔ وہ گھنٹوں تک موسیقی سن سکتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ خود بھی وہ شاعر اور ساز نواز ہیں۔ روسی لوک گیتوں میں انہیں صداقت، وسعت، آزادی اور غنائیت بے حد محسوس ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ روسی لوک گیت سنتے ہیں تو موسیقی انہیں اپنے بچپن کے دن یاد دلاتی ہے اور وولوگدا کے دریاؤں کی طغیانی اور بسیط میدانوں کے مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔

ایلیوشن اکثر اپنے آبائی گاؤں جاتے ہیں اور وہاں کے لوگوں سے ملتے ہیں۔ وولوگدا کے لوگ بھی اعلیٰ سوویت میں اپنے نمائندہ ممبر کے پاس آیا کرتے ہیں۔ دیہات میں وہ ایک آدھ ہفتہ آرام کرتے ہیں، وولوگدا کے جنگلوں میں دنوں تک شکار کھیلتے ہیں۔ ان میں واقعی شکاریوں کا تحمل ہے۔ وہ دریا کے کنارے گھنٹوں اس انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ مچھلی چارے پر منہ مارے!

اپنے کنبے میں صرف سیرگئی ایلیوشن ہی تنہا فضاییے کے ماہر نہیں ہیں۔ ان کے بیٹے ولادیمیر مشہور آزمائشی پائلٹ ہیں۔ انہیں سوویت یونین کے ہیرو کا خطاب مل چکا ہے۔ وہ ان چند نوجوان طیارہ بازوں میں سے ہیں جنہوں نے سوویت فضاییے کا نام روشن کیا ہے۔ ولادیمیر کو پرواز سے اس وقت دلچسپی شروع ہو گئی تھی، جب وہ لڑکے ہی تھے۔ اپنی عمر کو پہنچے تو ہوائی جہاز چلانا سیکھ لیا۔ وہ پائلٹ ہو گئے اور انہوں نے کئی عالمی ریکارڈ قائم کئے۔ پھر انہیں ایک المیہ پیش آیا۔ وہ موٹر کے حادثے میں بری طرح زخمی ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ آزمائشی طیارہ باز نہیں رہ سکتے۔ لیکن سیرگئی ایلیوشن کو یقین تھا کہ ولادیمیر کو پرواز پھر شروع کرنے میں زیادہ دن نہیں لگیں گے۔ آخر وہ اپنے بیٹے کو جانتے تھے! بہت ہی کم وقفے کے بعد ولادیمیر پھر جہاز چلانے لگے اور جلد ہی فضائیہ کی دنیا میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ اس نڈر طیارہ باز نے ایک اور نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے۔

ایک مرتبہ کسی نے سیرگئی ایلیوشن سے پوچھا کہ زندگی سے انہیں کیوں اتنی بھرپور محبت ہے۔

سوچے بغیر انہوں نے فوراً جواب دیا:

''اس کے علاوہ انسان اور کیا کر سکتا ہے؟ زندگی بڑی ہی دلچسپ چیز ہے!'' اور اسی زندگی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے سیرگئی ایلیوشن، اشتراکی محنت کے دو بار ہیرو اور لینن انعام یافتہ، چیف ڈیزائن ساز عالمی شہرت رکھنے والے ہوائی جہاز تیار کرتے ہیں۔

آرتیوم میکویان

''میگ'' (MIG) کا مطلب کیا ہے؟ کئی لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ علامتی لفظ ہے جس کے معنی تیزی اور رفتار ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے۔ لیکن دراصل یہ تین حروف سوویت جہازوں کے دو ڈیزائن سازوں کے ناموں کے ابتدائی حروف ہیں۔ پہلے دو حروف م اور ی میکویان سے لئے گئے ہیں اور آخری تیسرا حرف گ گوریویچ سے۔

اسے تقریباً تیس سال ہو چکے ہیں جب پہلا ''میگ'' ہوائی جہاز تیار کیا گیا تھا۔ اس وقت یورپ جنگ کے شعلوں میں لپٹا ہوا تھا اور سوویت یونین کی مغربی سرحدوں پر طبل جنگ صاف سنائی دے رہا تھا۔ سوویت افواج کو جدید جنگی ساز و سامان کی ضرورت تھی۔ اسے خاص طور پر فضائیہ کے ماہر شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے جو حال ہی میں سوویت معاشی وفد کے ہمراہ جرمنی سے لوٹے تھے۔

مشہور جرمن طیارہ ساز ویلی میسر شمڈٹ اور ارنسٹ ہینکل نے انہیں اپنے چند جنگی ہوائی جہاز دکھا کر ڈینگ ماری تھی کہ پرواز کے لحاظ سے ان کا کوئی ثانی نہیں۔ طاقت کے اس مظاہرے کا مقصد سب پر واضح تھا۔ جرمن ''نفسیاتی جنگ'' کے ذریعے سوویت لوگوں کو ڈرانا چاہتے تھے اور انہیں دھمکا رہے تھے۔ لیکن سوویت لوگ کمزور دل کے نہیں ہیں۔ خاص کر سوویت طیارہ سازوں نے یہ چال فوراً سمجھ لی۔

حیرت انگیز کم وقت میں سوویت ڈیزائن سازوں نے ایک نیا لڑاکو ہوائی جہاز ''میگ__1'' بنا لیا۔ اس زمانے کے لحاظ سے اس کی رفتار بہت تیز تھی__ یعنی 650 کلومیٹر فی گھنٹہ۔ وہ بارہ کلومیٹر کی بلندی پر اڑ سکتا تھا۔ وہ نہ صرف ملک میں بلکہ دنیا بھر میں سب سے تیز رفتار جنگی جہاز سمجھا جاتا تھا۔

سوویت یونین پر فاشسٹ حملے کے دس مہینے پہلے اگست 1940ء میں ''میگ__1'' کی تمام سرکاری آزمائشیں پوری ہو چکی تھیں۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ایک اور نیا لڑاکو جہاز ''میگ__3'' تیار کر لیا گیا جو زیادہ فاصلہ طے کر سکتا تھا اور زیادہ طاقتور ہتھیاروں سے لیس تھا۔

سوویت یونین پر اچانک دغا بازانہ حملے کی وجہ سے شروع میں جرمن نازیوں کو کافی برتری حاصل تھی__ خاص کر فضائی قوت میں۔ لیکن 1941ء میں ''میگ'' کی جو رفتار تھی اس تک پہنچنے کے لئے جرمنوں کو ایک سال صرف کرنا پڑا۔

اس طرح لفظ ''میگ'' کی شہرت شروع ہوئی۔ اس لفظ کے آگے جو ہندسے بڑھے ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس ہوائی جہاز کے کتنی نئی قسمیں تیار ہوئیں۔ آخری 25 برسوں میں ان ہندسوں میں بہت اضافہ ہوا ہے۔

1944ء کا سال آیا۔ سوویت فوج کے بڑھتے ہوئے حملوں کی وجہ سے نازی دستے مغرب کی طرف پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اسی زمانے میں آرتیوم میکویان کا ڈیزائن ساز بیورو نئے سے نئے طاقتور جہاز بنانے میں مصروف تھا۔ یہ محض پرانے ''میگ'' جہازوں کے تازہ نمونے نہیں تھے۔ یہ بنیادی طور پر ایسے نئے طیارے تھے جنہوں نے فضاییے کے ارتقاء میں ایک پورا کا پورا نیا دور شروع کیا ___ جیٹ کا دور!

اس موقع پر میں آرتیوم میکویان کی تخلیقی صلاحیت کے ایک اہم پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ وہ پرانے آزمودہ طریقوں اور ڈیزائنوں سے بالکل آزاد ہو کر نئے انقلابی خیال کو اپناتے ہیں۔ وہ ایسے موجد ہیں جنہیں اگر یہ یقین ہو جائے کہ نئے اصول بہتر ہیں اور ان سے طیارہ ساز صنعت کو مزید ترقی ہو سکتی ہے تو وہ دقیانوسی خیالات کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دینے سے بالکل نہیں ہچکچاتے۔ ان کی بیباک جدت کی بہترین مثال ایک جہاز ہے جس کا انہوں نے ڈیزائن بنایا تھا۔ اس میں روایتی پسٹن انجن کے علاوہ جہاز کی دم میں جیٹ انجن بھی نصب تھا۔ اسے لوگ ''ن'' کے نام سے جانتے تھے اور اس کی رفتار 850 کلومیٹر فی گھنٹہ تھی۔

وہ کیا تقاضے تھے جنہوں نے ڈیزائن سازوں سے مطالبہ کیا کہ وہ پسٹن انجن کی جگہ جیٹ انجن استعمال کریں؟ جواب آسان ہے۔ وقت کی نبض کبھی نہیں رکتی، ڈیزائن ساز سوچتا رہتا ہے کہ ایسا ہوائی جہاز بنایا جائے جو پہلے سے زیادہ تیز اور بلند پرواز کرے۔ رفتار اور بلندی بڑھانے کا مسئلہ براہ راست جہاز کی ساخت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے دھاتوں کی سائنس، ریڈیو الیکٹرونکس اور طیارہ ساز صنعت کی دوسری اعلیٰ مخصوص شاخوں کے سوال بندھے ہوئے ہیں۔ فضاییے کے آغاز کے وقت بھی جب لکڑی کے ڈھانچے کی جگہ دھات کے ڈھانچے کا استعمال ضروری ہو گیا تھا ڈیزائن ساز ایسے ہی مشکل مسائل سے دوچار تھے۔ آرتیوم میکویان اس نئے میدان میں پہلے مہم جو بن گئے۔

ہوائی جہاز ''ن'' نے واقعی ایک نیا دور شروع کیا، یہ دور تیز رفتار جیٹ ہوائی جہازوں کا دور تھا۔

''میگ ___ 9'' جس پر میکویان نے 1945ء کی ابتدا سے کام کرنا شروع کیا تھا یہ اصولاً

ایک نئے قسم کا ہوائی جہاز تھا۔ایک سال کے اندر ''میگ__9'' کی تمام آزمائشیں کامیابی سے پوری کر لی گئیں۔اس کی آزمائش کرنے والے مشہور طیارہ باز الکسئی گرنچیک تھے۔یہ ان بہادر اور ماہر سوویت طیارہ بازوں سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے سوویت فضائیہ کی کامیابیوں میں بڑا رول ادا کیا ہے۔جب نیا ہوائی جہاز دور آسمان کی گہرائیوں میں داخل ہو جاتا ہے تو زمین پر ڈیزائن ساز اسے صرف بے بسی سے دیکھ ہی سکتا ہے۔اب آزمائشی پائلٹ کی باری آتی ہے کہ وہ نئی تخلیق کو پرکھے اور غیر متوقع باتوں کا سامنا کرے۔اسی لئے پرواز کے وقت اس کے جہاز کا ہر مشاہدہ ڈیزائن ساز کے لئے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔

''میگ__9'' 920 کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے اڑ سکتا تھا۔یہ رفتار اس کے پیش رو ''ن'' سے کافی زیادہ تھی۔آرتیوم میکویان نے ثابت کر دیا کہ اب ''میگ'' جہاز ایک بلند ترین قلع کو فتح کرنے کے لئے تیار ہیں__ یعنی آواز کی رفتار کو۔

فیصلہ کن دھاوا جلد ہی بول دیا گیا۔اب ''میگ__15'' تیار تھا۔اس کی ہر قسم کی پروازی جانچ تیزی سے ختم ہو گئی__ پائلٹ اسے ''سورما'' کے نام سے پکارتے تھے۔بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ جنگ کے بعد دنیا میں یہ بہترین لڑاکو جہاز تھا۔تمام ماہرین فضائیہ جنہوں نے اس جہاز کو دیکھا ہے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

اس نئے طیارے کی غیر معمولی لڑاکو صلاحیت، اس کے طاقتور ہتھیاروں اور رفتار کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔لیکن اس کی جگہ ''میگ__17'' نے لے لی۔اس کی رفتار فی گھنٹہ 1150 کلومیٹر تھی جو چھٹی دہائی کے لئے بے پناہ کہی جا سکتی ہے۔اس ہوائی جہاز نے آواز کی رفتار کو دوڑ میں ہرا دیا۔

آرتیوم میکویان جب جہاز کا ڈیزائن تیار کرتے ہیں تو ہمیشہ مستقبل میں تبدیلیوں کا خیال رکھتے ہیں۔اس کے لئے فضائیہ کی تکنیک کے ارتقاء کے قوانین کو گہرے طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔اس میں میکویان ماہر ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈیزائن کئے ہوئے جہاز زیادہ عرصے تک مسلسل تعمیر ہوتے رہتے ہیں اور جدید ترین بنائے جا سکتے ہیں۔

زندگی کا پہیہ گردش کرتا رہا، سائنس اور تکنیک کی نئی نئی کامیابیاں فضائیہ کی ترقی کے لئے نئے نئے راستے کھولتی رہیں۔''میگ__17'' کے بعد ''میگ__21'' آیا اور اس کی جگہ دوسرے نئے ''میگ''۔مزید رفتار اور مزید بلندی کے لئے جدوجہد جاری رہی۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دن آرتیوم میکویان نے مجھے ایک نیا کیمرہ دکھایا جس پر ''لینن گراد میں بنا ہوا'' لکھا تھا۔ پھر انہوں نے کہا:

''اسے میں اپنے نوجوان ہم وطنوں کو بطور تحفہ دینا چاہتا ہوں جنہیں فوٹو گرافی کا شوق ہو۔''

بعد میں پتہ چلا کہ یہ نوجوان آرمینیا کے ایک چھوٹے سے قصبے سانائین کے اسکولی طالب علم تھے۔ سانائین میکویان کا آبائی قصبہ ہے جو حسین پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اسی جگہ انہوں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ قدرتی بات تھی کہ ساٹھ سال کے ہونے کے باوجود بچپن کی پیاری یادیں ان کے ذہن پر نقش تھیں۔ جب کبھی میکویان آرمینیا جاتے ہیں وہ اس اسکول کا چکر ضرور لگاتے ہیں اور بچوں سے فضائیہ کی دنیا کی باتیں کرتے ہیں اور بہادر طیارہ بازوں کی داستانیں سناتے ہیں۔ بچے اکثر ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا بچپن سے ہی وہ پرواز کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ میکویان رام کہانی سناتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے ہوائی جہازوں سے دلچسپی لینا شروع کی تھی۔ یہ کہانی اسکول کے بچوں کو حفظ یاد ہے لیکن اسے بار بار سننے سے وہ کبھی نہیں تھکتے۔

اس واقعے کو مدت ہو گئی جب ایک ہوائی جہاز کو سانائین کے نزدیک مجبوراً اترنا پڑا تھا۔ مقامی بچوں میں آرتیوم بھی تھے جو اسے دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ اس وقت انہیں مطلق خیال نہیں تھا کہ یہ دن ان کے لئے کتنا فیصلہ کن ہو سکتا ہے۔

آرتیوم کو بچپن ہی سے پڑھنے کا شوق تھا۔ چنانچہ ماں نے انہیں تبلسی بھیج دیا جہاں ان کے بڑے بھائی انستاس تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہاں انہیں کتابوں کی دنیا مل گئی۔ انہوں نے دلچسپی سے پڑھنا شروع کر دیا اور شوقیہ تھیٹر میں بھی حصہ لینے لگے۔

اسکول ختم کرنے کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں آرتیوم روستوف آ گئے اور یہاں حرفتی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ''کراسنی اکسائی'' کارخانے میں خرادی کا کام بھی سیکھنے لگے۔ یہیں انجینئرنگ سے انہوں نے اپنا لگاؤ محسوس کیا۔

پھر روستوف سے وہ ماسکو آئے اور ''ڈینامو'' کارخانے میں خرادی کا کام کرنے لگے۔ جلد ہی ینگ کمیونسٹ لیگ کی ہدایت کے مطابق وہ لال فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے ژوکوفسکی نامی فوجی فضائی انجینئرنگ اکادمی میں داخلہ لے لیا۔ یہاں نوجوان آرتیوم میکویان زندگی میں پہلی بار ہوائی چھتری سے کودے۔ ماسکو کے فضائی کلب کے ممبر ہونے کی حیثیت سے

انہیں یہ حق تھا کہ ہوائی جہاز چلانا سیکھیں۔ اکادمی ہی میں معلوم ہوا کہ وہ ہوائی جہاز ڈیزائن کرنے کی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں۔

1937ء میں میکویان نے اکادمی سے ڈگری حاصل کرلی۔ یہ بے اطمینانی کا زمانہ تھا۔ سر پر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ نوجوان انجینئر فوجی نمائندہ مقرر کردیئے گئے۔ ان کا کام ایک طیارہ ساز فیکٹری سے ہوائی جہاز وصول کرنا تھا۔ جو جہاز تیار کئے جاتے تھے انہیں ان کی جانچ کرنا پڑتی تھی۔ لیکن آرتیوم میکویان کو یہ کام زیادہ پسند نہیں تھا۔ وہ خود ہوائی جہازوں کے ڈیزائن ساز بننا چاہتے تھے۔ خوش قسمتی سے انہیں نکولائی پولیکارپوف کے ڈیزائن بیورو میں جگہ مل گئی۔ پولیکارپوف اس زمانے میں مشہور طیارہ ساز تھے...

ایک روز میں ان کے دفتر آیا۔ بڑے کمرے میں سادہ سا فرنیچر تھا۔ بڑی سیاہ میز کے پیچھے آرتیوم میکویان بیٹھے ہوئے تھے، گٹھے ہوئے بدن کے، سر پر چاندی جیسے سفید بال۔ وہ اپنی عمر سے کم دکھائی دیتے ہیں۔ حسب معمول انہوں نے اپنی مہربان مسکراہٹ سے میرا خیر مقدم کیا۔ ان کے اچھے موڈ سے معلوم ہوتا تھا کہ کام ٹھیک چل رہا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ان کے تازہ ترین جہاز کی تمام آزمائشیں کامیابی سے انجام دیدی گئی ہیں۔ دراصل جہاز کی پرواز کے متعلق آزمائشی پائلٹ سے وہ گفتگو کرکے ابھی ابھی آئے تھے۔

آرتیوم میکویان آزمائشی طیارہ بازوں سے ہمیشہ دوستوں کی طرح پیش آتے ہیں۔ وہ ان سے بات چیت کرنے اور اپنے نئے جہاز کے متعلق مشورے لینے میں گھنٹوں گزار دیتے ہیں۔ آزمائشی طیارہ باز بھی ان کی ایک بزرگ دوست کی طرح عزت کرتے ہیں۔ ایسے ہی دوستانہ لیکن کاروباری ماحول میں کئی اہم سوال حل کئے جاتے ہیں۔ آرتیوم میکویان طیارہ بازوں کی بڑی قدر کرتے ہیں اور نئے جہاز کی آزمائش کے بعد ان کی ہر رائے کو بڑی سنجیدگی سے سنتے ہیں۔ عام طور پر ہر ڈیزائن ساز اپنی ذاتی رائے کی تائید سننا پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا لگایا ہوا حساب کتاب ٹھیک نکلے۔ لیکن میکویان اپنے جہازوں کے بارے میں ہمیشہ دوسروں کا صحیح اندازہ معلوم کرنا پسند کرتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں اگر کوئی سخت تنقید بھی کرتا ہے تو اسے وہ خندہ پیشانی سے قبول کرلیتے ہیں۔ تنقید قبول کرنا، اپنی خودداری کو ٹھیس پہنچانا بڑی ہی مشکل بات ہے۔ لیکن کام صحیح ہونے کے لئے یہ ضروری ہے۔ آج خاص کر ان کا موڈ خراب ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ طیارہ

بازوں نے ان کے نئے جہاز کی بہت تعریف کی ہے۔

ہماری گفتگو تیز رفتار جیٹ ہوائی جہازوں کے مستقبل کے بارے میں ہونے لگی۔ اب آرتیوم میکویان بالکل بدلے ہوئے انسان تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس موضوع پر وہ گھنٹوں بات چیت کرنے کے لئے تیار ہیں۔

''جیٹ ہوائی جہازوں کی ترقی کے سلسلے میں کوئی حد مقرر کرنا بہت مشکل ہے'' میکویان نے کہا۔ ''مجھے یاد ہے کہ 1931ء میں میرے ایک پروفیسر نے دلائل سے ثابت کیا تھا کہ کوئی بھی بازووں والا جہاز 600-700 کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے زیادہ نہیں اڑ سکتا۔ لیکن جیٹ ہوائی جہازوں نے یہ حد پار کر لی ہے اور ہوائی جہاز بنانے والے آواز کی رفتار کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ آواز کی رفتار کو 'ہارس پاور'' کی طرح ایک اصطلاح نہیں سمجھنا چاہئے جو مصنوعی پیمانہ ہے۔ جب رفتار 1000-1200 کلومیٹر فی گھنٹہ ہو تو اس پر ہوائی حرکات (aerodynamics) کے بنیادی قانون جن کا عام پرواز کرنے والے اجسام پر اطلاق ہوتا ہے لاگو نہیں ہو سکتے۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ جہازوں کے ڈیزائن کے متعلق بالکل نئے طریقے سے سوچا جائے۔''

ڈیزائن ساز اور انجینئر جو دو ہزار، تین ہزار کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے اڑنے والے جہاز بنا رہے ہیں ایک اور مشکل سے دوچار ہیں ــــ ''گرمی کی حد''۔ اس رفتار پر ہوا کی رگڑ اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ جہاز کا جسم حد سے زیادہ گرم ہو جاتا ہے۔ لیکن آواز کی رفتار سے زیادہ تیز اڑنے والے ہوائی جہازوں کی آزمائشی پروازوں نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ مسئلہ بھی حل کیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ انجینئرنگ کے مسئلے اور طبی مسئلے ایک دوسرے کے قریب آ گئے ہیں۔ آج کل جو لوگ نئے ہوائی جہاز بناتے ہیں ان میں علم حیات کے ماہر اور ڈاکٹر بھی شامل ہوتے ہیں۔ جب جہاز کی رفتار ایک ہزار کلومیٹر فی گھنٹے یا اس سے زیادہ ہوتی ہے تو وہ انسان کے جسم پر رفتار بڑھاتے اور گھٹاتے وقت کشش ثقل کے اثرات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

جدوجہد طویل اور سخت رہی ہے لیکن انسان کی دانش اور غیر مغلوب قوت ارادی کے سامنے فطرت سر جھکانے پر مجبور ہے۔ غالباً یہی طویل اور دلچسپ جدوجہد فضائیہ کی ترقی کا راز ہے۔ اس کا ثبوت سوویت طیارہ بازوں کے وہ عالمی ریکارڈ ہیں جو انہوں نے رفتار اور بلندی میں قائم کئے ہیں۔ ایک مثال لیجئے۔ 1962ء میں آزمائشی پائلٹ گیورگی موسولوف نے اپنا جہاز 2681 کلومیٹر

فی گھنٹے کی رفتار سے چلا کر اور اسے 34714 میٹر کی بلندی پر لے جا کر نیا ریکارڈ قائم کیا۔ یہ آواز کی رفتار سے دوگنی سے بھی زیادہ رفتار ہے۔ کیا یہ رفتار کی حد ہے؟ نہیں، آرتیوم میکویان کے نئے بنائے ہوئے ہوائی جہازوں کی رفتار اس سے بھی زیادہ تیز ہے۔

اشترا کی محنت کے دو بار ہیرو، سوویت سائنس اکادمی کے رکن آرتیوم میکویان کی داستان کو میں ہمارے بزرگ ترین اور قابل احترام ڈیزائن ساز از خانکیلسکی کے الفاظ پر ختم کرنا چاہتا ہوں:

''واضح مقصد اور اسے حاصل کرنے کے لئے پوری طرح اپنے آپ کو وقف کر دینا ___ یہ ہیں آرتیوم میکویان کی خصوصیات۔ اگر کوئی نیا جہاز بناتے وقت منصوبے کے مطابق گاڑی آگے نہیں بڑھتی یا غیر متوقع پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو ہمارے پیشے کی خصوصیت ہیں تو آرتیوم میکویان اور ان کے ہم کار سکون کے ساتھ اور مشترکہ طور پر ایسی حالت کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ جو لوگ انہیں قریب سے جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ وہ بلا کسی وقفے کے، آنکھ جھپکائے بغیر دن رات کام کرتے رہتے ہیں ___ اس وقت تک جب تک کہ مسئلے کی تہہ تک نہ پہنچ جائیں اور اسے حل نہ کر ڈالیں۔''

جسے بھی آرتیوم میکویان سے ملنے یا ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے وہ ان کی وسیع علمیت، زبردست استعداد اور منکسر مزاجی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میکویان اور ان کے ڈیزائن بیورو کے ممبر کبھی اپنی کامیابیوں کی باتیں نہیں کرتے۔ وہ بس اپنے کام میں مصروف رہنا پسند کرتے ہیں۔

(اکادمیشن آرتیوم میکویان کا 9 دسمبر 1970ء کو ماسکو میں طویل اور سخت بیماری کے بعد 66 سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔)

☆☆☆

ہوائی جہازوں کے تین مشہور ڈیزائن ساز، تین زندگیاں، اور قربانی اور تخلیق کی تین داستانیں۔ درجنوں ہوائی جہاز ___ لڑاکو جہازوں سے لے کر بھاری بمباروں تک، آواز کی رفتار سے زیادہ تیز اڑنے والے جیٹ طیاروں سے لے کر بین براعظمی مسافر بردار جہازوں تک ___ یہ ہے سوویت فضائیے کی تاریخ۔ اور ان تین ڈیزائن سازوں نے اس کے کئی درخشاں باب تحریر کئے ہیں۔

از: البرٹ گاسپریان

دوسرا جنم

فضائی کلب اسکول سے کوئی آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہ اکثر دوڑ لگا کر وہاں جایا کرتا تھا، اور کبھی تو ننگے پیر ہی۔ ایک دن اس نے بڑی ہمت کر کے پوچھ ہی لیا کہ کیا اسے بھی ہوائی چھتری سے کودنے کی اجازت مل سکتی ہے۔ جواب ظاہر ہے یہی ملا: ''میاں، ذرا بڑے ہو جاؤ پھر آنا۔''

اور وہ پھر آیا۔

''بلندی سے تمہیں ڈر تو نہیں لگتا؟''

''نہیں۔''

''تم پڑھ رہے ہو یا کام کرتے ہو؟''

''پڑھتا بھی ہوں اور کام بھی کرتا ہوں، خرادی کا کام سیکھ رہا ہوں۔''

''اچھا، تو ٹھیک ہے۔ دوست، سب سے پہلے تم آلارم گھڑی خرید لو۔ اسے چابی دینا کبھی مت بھولنا۔ سمجھ گئے نا۔''

جب اس نے آلارم گھڑی خریدی تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ چھوٹا آلہ اس کی تمام زندگی سے وابستہ ہو جائے گا، دوست اور ''دشمن جاں'' دونوں طرح۔

گھڑی ٹھیک تین بجے صبح آلارم بجایا کرتی تھی، اس لئے کہ ہوائی چھتری سے چھلانگیں پو پھٹنے سے پہلے لگائی جاتی ہیں۔ یورا خاموشی سے اٹھتا اور سائیکل پر بیٹھ کر کلب روانہ ہو جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے پورے دن کو مختلف کاموں کے لئے بڑی باقاعدگی سے بانٹ لیا کرتا تھا۔

پہلی چھلانگ لگانے کی اجازت ملنے سے پہلے زیر تربیت چھتری بازوں کا پوری طرح طبی معائنہ کیا گیا۔ یورا کی نبض دیکھتے وقت ڈاکٹر نے کہا:

''62 فی منٹ... رفیق بیلینکو، تمہارے اعصاب برے نہیں ہیں۔''

ڈاکٹر کو کیا خبر تھی کہ گھبراہٹ دور کرنے کے لئے بیلینکو نے اپنے دانت زوروں سے بھینچ رکھے تھے۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ جہاز کے کھلے ہوئے دروازہ کے پاس کھڑا ہوا تھا اور بے کراں خاموشی اور دنیا کی شفاف ترین ہوا میں چھلانگ لگانے کے لئے تیار تھا۔ چند لمحے بعد اس نے تازہ ہوا کا پہلا گھونٹ پیا اور پہلی ہی بار اصلی خوشی کے لمس کی لذت محسوس کی۔

اسی سال اودیسہ کی ایک پندرہ سالہ لڑکی نے بھی جو فٹ بال کے استاد کی بیٹی تھی پہلی مرتبہ ہوائی چھتری سے چھلانگ لگائی تھی۔ وہ اودیسہ کے باسیوں کی طرح سرکش قسم کی تھی اور احاطے کی فٹ بال ٹیم میں فارورڈ کھیلا کرتی تھی۔

لوگ اسے فرانچیسکا، فرانیکا یا بعض وقت صرف فرانیا کے نام سے پکارا کرتے تھے... یہ نام اس کے پولستانی دادا نے اسے دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ابھی تک یورا فرانیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

یورا کے سویرے سویرے فضائی کلب کے چکر اس کی ماں سے پوشیدہ نہیں رہے۔ ایک دن ماں نے سوال کیا:

''یہ روز صبح تم کہاں غائب ہو جاتے ہو؟''

''اماں، میں... میں مچھلی کا شکار کرنے جاتا ہوں۔''

''یورا، جھوٹ مت بولو۔ میں خود ہوا بازی کے کلب گئی تھی۔''

ہر آدمی کے لئے پہلی بار سفید جھوٹ بولنا مشکل ہوتا ہے اور ماں سے پہلی بار جھگڑنا اور بھی زیادہ مشکل۔ بہر حال یورا اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ چنانچہ ماں نے فیصلہ صادر کیا:

''اچھا تو اب سائیکل کو ہاتھ مت لگانا۔''

اب یورا کو صبح دو بجے اٹھ کر پیدل روانہ ہونا پڑتا تھا۔ ماں کا فرمانبردار بیٹا بننے کے بجائے اس نے ہوائی چھتری سے جست کرنے کو ترجیح دی۔

مائیں بھی بیویوں سے کم جل ککڑی نہیں ہوتیں۔ لیکن ماؤں میں ایک خاص فہم ہوتی ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ دیر سویر ان کا بیٹا گھر چھوڑ دے گا۔ اور یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ خود گھر سے چلا جائے۔ اس کے دوست، کام، لڑکی اسے پھسلا سکتے ہیں...

''اچھا یورا، میں ہاری۔ تم جست لگا سکتے ہو۔ لیکن بیٹا، احتیاط سے کام لینا۔''

ایک دن ساتھیوں نے اس سے پوچھا:

''یورا، تم نوجوان کمیونسٹ لیگ میں شامل کیوں نہیں ہو جاتے؟''

''ابھی وقت نہیں آیا۔''

''ہم تمہاری سفارش کر دیں گے۔''

''میں نے کہا نا، ابھی وقت نہیں آیا ہے۔''

یورا بے حد کم گو انسان ہے۔ اگر کوئی اس کے دل کی بات سن سکتا تو وہ یہ سنتا: ''ہاں یارو، میں بھی بہت دنوں سے اس کا خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن میرے خیال میں نوجوان کمیونسٹ لیگ ایسے سورماؤں کی تنظیم ہے جیسے گاستیلو، زویا، ماتروسوف۔ ان کے مقابلے میں میں نے کیا کیا ہے۔ ممبری کا کارڈ بڑے بڑے لفظوں سے بھرنا کافی نہیں ہے۔''

یورا نوجوان کمیونسٹ لیگ کا ممبر اس وقت ہوا جب وہ 120 بار جست کر چکا تھا اور نڈر اور مشاق ہوائی چھتری باز کی حیثیت سے اس کی شہرت پھیل چکی تھی۔

نیلا آسمان اس کی سب سے بڑی سفارش تھی۔

''مجھے کوئی اہم کام دیجئے۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''ہمارے ہاں نئے سکھاڑی آئے ہیں۔ میں ان کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں، ان کی ٹریننگ کے سلسلے میں۔''

''تو پھر تم دن بھر ہوائی اڈے ہی پر جمے رہو گے۔ کارخانے اور اپنی پڑھائی کے بارے میں بھی سوچا ہے؟''

''میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ مجھے نوجوانوں کے ساتھ کام کرنا بہت پسند ہے۔''

کہا جاتا ہے کہ ہوائی جہاز سے کودتے وقت چھتری باز کے لئے ایک مشکل ترین نفسیاتی مزاحمت اس کا احساس تنہائی ہوتا ہے۔ اگر آدمی کا کردار ایسا ہو کہ وہ یہ بالکل محسوس نہیں کرتا تو؟ اگر وہ دوستوں کی صحبت کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتا تب؟ تب اس کے لئے جہاز سے چھلانگ لگانا بچوں کا کھیل ہے۔

ایک سالانہ کیمپ میں فرانیکا سے اس کی ملاقات ہوئی۔ فرانیکا اسے دیکھ کر مسکرائی اور اپنے آپ سے کہا: ہاں، ہو بہو ویسا ہی ہے جیسا میں نے تصور کیا تھا۔ یہ بیلینکو... بالکل بیلکا ہے (روسی زبان میں گلہری)۔ اسی نام سے اسے دوست پکارا کرتے تھے... دبلا پتلا، پھرتیلا، پٹسن کے ریشوں کی طرح بال جن کا ایک گچھا بے نیازی سے پیشانی پر پڑا رہتا تھا۔

اسپورٹ کے کھلاڑی فوراً ایک دوسرے سے بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ فرانیکا نے پوچھا:

''بتاؤ، کیا تم بہت بلندی پر سے کودے ہو؟''

''ہوں۔''

''بتاؤ نا مجھے، میں بھی بہت بلندی پر سے کودنا چاہتی ہوں۔''

''کیا بتاؤں؟ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ پہلے میں نے بیرو چیمبر میں ٹریننگ لی اور کود پڑا... رات کا وقت تھا۔''

اسے اپنی بات چیت کے بھونڈے پن پر ہمیشہ شرم آتی تھی۔ جب اپنے پرانے تجربات کو بیان کرنا پڑتا تو اسے الفاظ کی کمی محسوس ہوتی تھی۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' ذرا اس فقرے کی تفصیل ملاحظہ ہو: رات کی سیاہ تاریکی میں بارہ کلومیٹر کی بلندی سے توقف کر کے کودنا۔ روشنی صرف کرانومیٹر سے آرہی ہے جو سینے پر لٹکا ہوا ہے۔ سخت سردی سے اپنے چہرے کو بچانے کے لئے وہ پیٹھ پر لیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ ہوا گرم اور کثیف ہوتی جاتی ہے۔ پھر وہ مڑتا ہے۔ لیکن کوئی چیز نظر نہیں آتی... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کرانومیٹر کی سوئیاں جم گئی ہیں۔ زمین کہاں چلی گئی؟ شاید وہ قریب آرہی ہے اور اسے ہاتھ سے چھوا جا سکتا ہے؟ نہیں، ابھی نہیں، اور انتظار کرو۔ تھوڑا اور۔ ابھی چھتری مت کھولو۔ اگر ریکارڈ قائم کرنا چاہتے ہو تو ابھی چالیس سیکنڈ باقی ہیں۔ تیس... بیس...

''یورا، تم باتیں نہ بھی کرو، پھر بھی دلچسپ انسان ہو!''

اس نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ سامنے ایک دبلی پتلی سی لڑکی کھڑی تھی جس کی پیٹھ پر تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ جیوٹ کی معلوم ہوتی ہے... ہے نا آخر اودیسہ کی رہنے والی... پھر اچانک ایک خیال آیا: اس سے پھر ملنا چاہئے۔

دونوں کی ملاقاتیں ملک کے مختلف ہوائی اڈوں پر ہوتی رہیں۔

''فرانیکا، اب میں تم سے جدا ہونا نہیں چاہتا۔''

''اور میں بھی نہیں چاہتی... لیکن...''

ہوائی چھتری باز کی زندگی کا مطلب ہے ڈسپلن اور سخت ٹریننگ۔ اور فوجی چھتری باز کے لئے تو یہ اور بھی کٹھن ہے۔

ان کے گروپ کا لیڈر بڑا پابند قسم کا آدمی تھا۔ کیا اس سے مشورہ لیا جائے؟ اودیسہ کی

احاطے میں فٹ بال کھیلنے والی لڑکی کے لئے تو یہ بڑی گستاخی کی بات تھی۔

لیڈر نے خود ہی پہل قدمی کی:

''فرانیکا، کیا تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہی ہو؟ بتاؤ تو، یورا کے ساتھ کیا چل رہا ہے؟ نتیجہ یہی نکلے گا کہ اسے کودنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ تمہیں اس سے محبت ہے؟''

''ہاں۔''

''اچھا تو اب تم دونوں ایک ہی شہر میں رہو۔ باقی کام تمہارا ہے۔ شادی کی دعوت ملے گی یا نہیں؟''

شادی نوجوانوں کے کافی ہاؤس میں رچائی گئی۔ مہمانوں میں 120 چھتری باز تھے۔ ظاہر ہے کہ ان میں ''پابند'' لیڈر بھی شامل تھے۔

''ظالم'' گھڑی نے تین بجے آلارم بجایا۔ میز پر ایک پرچی تھی۔ ''یورا، میں ہوائی چھتری سے کودنے جارہی ہوں۔ سوپ چولہے پر رکھا ہے۔ اور کھانا نہیں ہے۔'' یورا کا نوٹ: ''تم اتنی گہری نیند سے سو رہی تھیں کہ جگانے کو دل نہیں چاہا۔ خدا حافظ۔''

''آخر کار آ گئے!'' فرانیکا نے کہا۔

یورا: ''میں اکیلا نہیں ہوں۔ کچھ کھلاؤ گی؟''

سات بھوکے لوگوں کا پیٹ بھرنا تھا۔ (خوش قسمتی سے انہیں رہنے کی جگہ مل گئی تھی۔ ان کا ایک دوست سال بھر کے لئے کسی کام پر باہر گیا ہوا تھا اور اس نے دونوں کو اپنا فلیٹ دے رکھا تھا)۔ کھانے کی میز پر بھی بحث جاری رہی۔ وہ میز کے کپڑے پر اپنے منصوبوں کے نقشے بناتے رہے۔ فرانیکا اب خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ بھی بحث میں شامل ہو گئی۔ بحث کرنے کے لئے بے شمار باتیں تھیں۔

جہاں تک ہوائی چھتری کا تعلق ہے اسے جدید ہونا چاہئے، نئی ہونا چاہئے۔ عالمی مقابلوں نے یہ ثابت کر دیا تھا۔

ایک عام آدمی کے لئے دیکھنے میں پیراشوٹ محض ایک بڑی چھتری معلوم ہوتی ہے۔ درحقیقت مقابلوں اور نمائشی اسپورٹ کے لئے اسے ایک انتہائی پیچیدہ ڈھانچہ سمجھنا چاہئے۔ اس میں لمبے شگاف ہوتے ہیں اور فلیپ بھی۔ اس کے ڈھانچے کی خصوصیات جاننے کے بعد چھتری

باز ہوا کے خلاف بھی تیر سکتا ہے، وہ اپنے گرنے کی رفتار گھٹا بڑھا سکتا ہے، یہاں تک کہ پورا ایک چکر کاٹ سکتا ہے۔

مختلف تجربے گاہوں میں ملک کے بہترین ہوائی چھتری ڈیزائن کرنے والے ایک نئی چھتری بنا رہے تھے۔ لیکن یورا اس کا انتظار نہیں کرتا کہ کوئی دوسرا شخص چیز تیار کر کے اسے پیش کرے۔ اپنی 23 ویں سالگرہ منانے تک وہ 9 عالمی ریکارڈ قائم کر چکا تھا اور وہ جانتا تھا کہ یہ آخری حد نہیں ہے۔ وہ نئے ریکارڈ قائم کرنے والا تھا۔ اسے نئی چھتری کی آزمائش کرنا تھی جو خود اسی نے ڈیزائن کی تھی۔

☆☆☆

یورا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے دوبارہ جنم لیا ہے۔ ایک دفعہ جب وہ آزمائشی جست کر رہا تھا تو ہوائی چھتری نہیں کھلی اور ناگہانی ضرورت والی چھتری بڑی چھتری کی رسیوں میں الجھ گئی۔ اور وہ زمین سے صرف ایک کلومیٹر کی بلندی پر تھا...

فرانیکا نے دیکھا کہ رسیوں نے چھتری کو جکڑ لیا ہے اور وہ یورا کے سر کے اوپر چھوٹی سی ریشمی گیند کی طرح پھڑ پھڑا رہی ہے۔ ''ناگہانی ضرورت والی چھتری کھولو'' اس نے سرگوشی کی آواز میں کہا اور پھر وہ زور سے چلائی ''ناگہانی ضرورت والی چھتری!''

یورا نے ناگہانی ضرورت والی چھتری کی جانب بڑھنے کی کئی بار کوشش کی لیکن ہر مرتبہ وہ رسیوں میں الجھ جاتی تھی اور کھل نہیں سکتی تھی۔

یورا 60 سیکنڈ تک بلا سہارے نیچے گرتا رہا اور ہوائی چھتری کھولنے کی جدوجہد کرتا رہا... پھر اسے خطرے کا پوری طرح احساس ہوا۔ چھتری کی بندشیں اسے تیزی سے نیچے گرنے سے کسی حد تک روک رہی تھیں لیکن پھر بھی وہ 45 فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے نیچے گر رہا تھا۔ تقریباً اسی رفتار سے ماسلین زمین پر گرا تھا۔

... ''دشیبی سیکسنی (مغربی جرمنی) کے ہوائی اڈے کلاؤسہیڈ پر ایک تجربے کار فرانسیسی چھتری باز ٹریرار ماسلین ہزاروں تماشائیوں کے سامنے دھم سے زمین پر آن گرا۔ موسم کے متعلق رپورٹ اچھی نہیں تھی لیکن ماسلین نے معاہدے کی شرطوں کے عین مطابق جست کرنے کا فیصلہ

کیا۔ یہ کرتب ٹیلی وژن پر لاکھوں لوگ دیکھ رہے تھے۔ ماسلین نے غالباً تماشائیوں کی دلچسپی کے لئے بہت دیر میں اپنا پیراشوٹ کھولنا چاہا۔ اس کے کھلنے میں کافی دیر لگی اور وہ تقریباً 50 فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین سے ٹکرا گیا۔" (ایک اخبار سے اقتباس۔)

ہزاروں تماشائیوں نے جنہوں نے سنسنی خیز منظر دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدے تھے اپنی آنکھوں سے اور لاکھوں لوگوں نے ٹیلی وژن پر ژیرار ماسلین کو مرتے ہوئے دیکھا۔ مشاق فوٹو گرافروں نے اور بھی تیزی دکھائی... وہ جلد ہی اس جگہ پہنچ گئے جہاں یہ مشہور چھتری باز زمین پر گرنے والا تھا اور "اسکوپ" لے لیا۔

فوٹو یقیناً "اسکوپ" تھے۔ ماسلین کے آخری لمحات کی تصویریں بیچ کر فوٹو گرافر خوب پیسہ کمانا چاہتے تھے... اسے ستم ظریفی کہئے کہ چھتری باز کو موت سے کھیلنے کی بھی اتنی ہی بڑی رقم ملنے والی تھی...

ژیرار ماسلین اس وقت تک زندہ تھا جب فوٹو گرافر اس کی آخری "قابل دید" تصویریں کھینچ رہے تھے۔ ان میں اس کے ہونٹ اس طرح نظر آتے ہیں جیسے وہ آخری الفاظ کہنا چاہتا ہو۔ کسی کو نہیں معلوم وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ ہوسکتا ہے چھتری باز کے احساس تنہائی کے بارے میں...

فرانیکا نے یکایک دیکھا کہ اناتولی چیکردا نے ترپال اٹھایا جس میں ہوائی چھتریاں تہہ کر کے رکھی جاتی تھیں اور اسے لے کر میدان کے مرکز کی طرف بھاگا جہاں یورا کے گرنے کا امکان تھا۔ اور نوجوان بھی اس کی جانب لپکے۔ وہ بھاری لباس پہنے ہوئے تھے لیکن پاگلوں کی طرح ہانپتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔

6 چھتری باز اس جگہ پہنچ گئے جہاں یورا گرنے والا تھا۔ یہ تھے نوجوان کمیونسٹ لیگ کے کارکن ابراہیم فصحد ینوف، ماسٹر آف اسپورٹ اناتولی چیکردا، لیف بوگدانوف، وکتر کونچوکن، نکولائی ناکورینکو، ویلیری پتوکن۔ ان کا تعلق اس ماہروں کی ٹیم سے تھا جسے لوگ "شاندار سات" کہا کرتے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی ترپال کو کھولا اور ٹیم کے ساتویں ممبر کو جو آسمان سے لڑھک کر نیچے گر رہا تھا اس پر تھام لیا۔

ترپال کے سرے کو یہ سب اپنی سن انگلیوں سے مضبوطی سے تھامے رہے۔ ایک سیکنڈ نہیں

پورا قصہ ختم ہو گیا۔ جب یورا ترپال کے ایک سرے پر گرنے لگے تو اناتولی نے ان سے بچنے کے لئے ترپال بڑی تیزی سے دوسری طرف کھینچ لی۔ نتیجے میں یورا ترپال پر آسانی سے گرے۔

اعصابی تناؤ، ذہنی کرب میں مبتلا، معجزے کے انتظار میں سب کے سب بے حس وحرکت تھے اور دیکھ رہے تھے کہ یورا زمین پر کس طرح کھڑا ہو رہا ہے۔

جب ڈاکٹر آیا تو یورا جنوب کے سورج کی جھلسی ہوئی سخت زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کو دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر نے اپنی زندگی میں اتنے پریشان اور زرد چہرے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اس نے کہا "سانس لو۔" یورا گہری سانس لینے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ پہلا جملہ جو یورا کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا: "دوستو، تمہارا شکریہ"۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کے پہلے الفاظ تھے "ذرا سگریٹ دینا۔" اس کی آواز بھاری تھی اور جذبات سے تقریباً عاری۔

واقعی تشکر کے جذبات کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل تھا۔

فرانیکا نے دوڑ کر اس ٹیم کے پاس آنے کی کوشش کی۔ لیکن لیڈر کا حکم ملا: "جہاز پر جاؤ، یہ آرڈر ہے۔"

کافی دیر کے بعد جب وہ جہاز میں بیٹھی ہوئی تھی اسے خیال آیا کہ دوست جان بوجھ کر چلائے تھے کہ وہ ہونے والے المیے کو نہ دیکھے۔ اس نے جہاز کا دروازہ کھولا... وہ خیالات کا تسلسل توڑے بغیر کودنا چاہتی تھی۔ اسے پروا نہیں تھی کہ وہ جنگل میں گرے گی یا بجلی کے تاروں پر۔ اور خیالات کے اس ہجوم میں اس نے ایک اجنبی اور انجانی کیفیت محسوس کی: "نتاشا!"

اس کے خیالات کا تانا بانا اس وقت ٹوٹا جب پائلٹ نے چلا کر کہا: "زمین نے اطلاع بھیجی ہے۔ وہ زندہ ہے۔ میں زمین پر اترنے والا ہوں۔" کس نے فرانیکا کو ہوائی چھتری سے نکالا، کس نے اسے موٹر میں بٹھایا، اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ "تیز! تیز!" اور جب اس نے یورا کا پیلا چہرہ دیکھا جس پر تکلیف اور کرب کے نشان اب بھی باقی تھے تو ساری دنیا اس کی آنکھوں میں دھندلی نظر آنے لگی۔ "فرانیکا، فرانیکا، فرانیکا"... "یورا، یورا، یورا... نتاشا۔"

اس وقت اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ یقیناً لڑکی ہوگی، اپنی ماں فرانیکا

کی طرح __ اس نے سوچا۔

...پلاسٹر سختی سے چپکا ہوا تھا۔ ایکسرے فوٹو کا فلم سامنے تھا۔

''صرف ایک سوال ہے، ڈاکٹر۔''

''میں جانتا ہوں تم کیا پوچھنا چاہتی ہو: 'ڈاکٹر کیا آئندہ میں پھر ہوائی چھتری سے جست کر سکتا ہوں' ہوائی جہاز اڑا سکتا ہوں؟ ارے تم لوگ تو خبطی ہو۔ بیلینکو، تم جلد تندرست ہو جاؤ گے... مجھ سے بھی زیادہ تندرست۔ مطمئن ہو گئے؟''

''لیکن ڈاکٹر...''

''معلوم ہے تم کہنا چاہتے ہو: 'ڈاکٹر تک کچھ نہیں سمجھ سکتے، تم کیا چھتری باز ہو؟ تم نہیں جانتے جست کیا چیز ہوتی ہے' لیکن میں دوڑنا جانتا ہوں۔ اب مطمئن ہو گئے؟''

''لیکن ڈاکٹر...''

فرانیکا یورا سے ملنے آئی اور اپنے ساتھ بہت سے اخبار بھی لائی۔ اخباروں نے تفصیلات چھاپی تھیں کہ کس طرح اس کی جان بچی۔ ''چھتری باز کی عالمی تاریخ میں ایک ناقابل مثال واقعہ'' ''پیراشوٹ نہ کھلنے سے آدمی ایک کلومیٹر کی بلندی سے گرا اور زندہ ہے'' ''دنیا میں پہلی مرتبہ چھتری باز کو ترپال سے بچایا گیا''۔

''واقعی یہ ایک معجزہ ہے لیکن سمجھایا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے اسپورٹ مین کا آہنی ڈسپلن، دوسرے اس کے دوستوں کی حاضر دماغی۔ ایک سیکنڈ کی دیر بھی...''

''اسے صرف ایک چوٹ آئی... ایک ٹانگ ٹوٹ گئی!''

عام لوگوں کے لئے جنہیں پہلے اس واقعہ سے سخت دھکا لگا تھا اب سوال بس 'ایک ٹوٹی ہوئی ٹانگ' کا رہ گیا تھا۔ لیکن یورا کے واسطے یہ ناقابل تلافی المیہ بن سکتا تھا۔ ٹانگ کی ہڈی کئی جگہ ٹوٹ گئی تھی اور اس کا جڑنا آسان نہیں تھا۔

''فرانیکا، سچ بتانا، کیا میں جست کر سکوں گا؟''

''یقینی تم جست کر سکو گے، میری جان!''

''یورا، ڈاکٹر نے مجھے تم سے بات کرنے کو کہا ہے۔ انہوں نے شکایت کی ہے کہ تم گلوکوز

کے انجکشن لینا نہیں چاہتے... یہ اتنے تکلیف دہ نہیں ہوتے۔ اسے میں لے کر دکھاؤں؟''

ہر چیز کی طرح بہادری کی بھی حدیں ہوتی ہیں، اگر چہ بہت سے لوگ اس بارے میں ڈینگ مارتے ہیں۔ انسان بہر حال انسان ہے، کئی کمزوریوں کا شکار۔ انجکشن لینا کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ اور بے چارے یورا نے تو حادثے سے پہلے پچکاری تک نہیں دیکھی تھی۔

''ہلومت۔ سب ختم ہو گیا۔ بہت درد تھا؟''

جو لوگ یورا کی طرح المیے سے گزرے ہیں وہ پھر بلندی سے بہت ڈرنے لگتے ہیں۔ یہ بیماری نا قابل علاج خیال کی جاتی ہے۔

''ڈاکٹر، آپ کی کیا رائے ہے؟''

''ابھی تک کسی نفسیاتی زخم کا کوئی بھی نشان نہیں ہے۔ گرتے وقت وہ خطرے کے متعلق سوچنے کے بجائے چھتری کھولنے میں مصروف تھا۔ اس کی آہنی قوت ارادی نے اسے بچا لیا۔ اس وقت بھی اور اب بھی۔''

''اور اس کی ٹانگ کیسی ہے؟'' کمیشن کے ایک اور ممبر نے پوچھا۔

''وہ جست کر سکتا ہے۔''

''ڈاکٹر، تم بھی چھتری بازوں کی طرح ہو، جب چاہو جست کرنے کے لئے تیار۔ تم ان کے جانبدار معلوم ہوتے ہو۔''

''جی ہاں، میں جانبدار ہوں۔''

حادثے کے دس مہینے بعد یورا کو پھر چھلانگ لگانے کی اجازت مل گئی۔ اس نے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ 888 ویں ہے۔

وہ جہاز کے کھلے دروازہ کے نزدیک کھڑا تھا اور دل کی تیز دھڑکن کو قابو میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے شاعر مارتینوف کا یہ پسندیدہ شعر یاد آیا: ''کنارے پر کافی کھڑے رہے، تاخیر گناہ کا دوسرا نام ہے۔''

دروازہ سے اس نے قدم آگے بڑھا دیئے۔

''1966ء کے سال، نو میں نو چھتری بازوں نے جن میں یوری ہیلینکو مشہور ماسٹر آف

اسپورٹ اور نوجوان کمیونسٹ لیگ کے ممبر بھی شامل تھے پیچیدہ اجتماعی جست کرنے میں حصہ لیا۔ انہوں نے وہ ریکارڈ توڑ ڈالا جسے پہلے امریکی قائم کر چکے تھے۔ یہ یورا کا دسواں سونے کا تمغہ ہے۔" (اخبار سے اقتباس۔)

ملک کے ایک جنوبی ہوائی اڈے پر یورا بیٹھا ہوا خط لکھ رہا ہے۔ اڈے کے آس پاس نکیلے پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ خط مرکزی روس کے برف پوش شہر پہنچے گا۔ آج یہ اس کا دوسرا خط ہے۔
اس مرتبہ اس کے ساتھ فرانیکا کا آنا ناممکن تھا، اسے ایک سالہ بیٹی نتاشا کی دیکھ بھال کرنی تھی۔ غالباً فرانیکا کو وہ اخبار ابھی تک نہ ملے ہوں جن میں اس کی کامیاب جست کی خبر شائع ہوئی ہے... وہ تار بھیجنے کا قائل نہیں ہے۔ چھتری بازوں اور ان کے کنبوں میں یہ ایک روایت ہے کہ تار نہ بھیجا جائے۔ یہ لوگ بے وقت دروازہ پر ڈاکیے کی دستک سننا پسند نہیں کرتے۔
فرانیکا پریشان تھی۔ اسے معلوم تھا کہ گروپ کی اجتماعی جست میں کتنی مشکلات اور پیچیدگیاں ہوتی ہیں۔ ہر چیز کو سیکنڈ سے بھی کم وقت میں پورا ہونا چاہئے۔ وہ زیادہ بلندی پر سے نہیں کودے تھے اور یکے بعد دیگرے کودے تھے۔ ذرا سی بھی غلطی سے نیچے کے آدمی کی چھتری میں پھنسا جا سکتا تھا۔
لیکن سب کے سب نو چھتری باز انتہائی کامیاب رہے۔ یورا نے بڑے فخر سے فوٹو میں اپنے آپ کو اور دوستوں کو سفید خودوں میں دیکھا۔ دوست ہموار اور سورج سے جھلسی ہوئی زمین پر کھڑے ہوئے تھے۔
فوٹو کے پیچھے اس نے بڑے بڑے حرفوں میں لکھا: "جان من، میرے لئے فکر نہ کرنا... تم دیکھ سکتی ہو کہ آس پاس دوست ہیں۔"

از: وکٹر اسمر نوف

سپاہی کا بیٹا

سبز رنگ کے راکٹ کا رخ آسمان کی طرف تھا۔ راکٹ چھوڑنے کے اڈے پر بالکل خاموشی تھی۔ سب لوگ پناہ گاہوں میں چلے گئے تھے۔ آخری دفعہ جانچ پڑتال کی جا رہی تھی۔ سب کچھ تیار تھا۔

خاموشی میں توپ خانے کے کمانڈر کی آواز گونجی:

"تیار!"

پھر سگنلر نے دہرایا:

"تیار!"

کمانڈر کی گھڑی کی سوئی ٹک ٹک کر رہی تھی۔ فوجی مشقوں کا ماحول جنگ کی طرح تھا...

"راکٹ چھوڑ دو!"

"راکٹ چھوڑ دو!" سگنلر نے مائیکروفون پر چلا کر کہا۔

ایک زبردست گرج ہوئی اور دھوئیں اور شعلے کو چیرتا ہوا راکٹ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ جیسے جیسے وہ بلند ہوتا گیا اس کی رفتار بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو کر آسمان کی گہرائیوں میں غائب ہو گیا۔

اب سگنلر نئے حکم دے رہا تھا۔ جونیئر سارجنٹ ولودیا سیدوف، سارجنٹ میجر کونستانتین سیدوف کا بیٹا راکٹ بازوں کے ساتھ رابطہ قائم کیے ہوئے تھا۔

ولودیا نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ 1942ء میں اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ جنگ کا یہ وہ سال تھا جب بہت کم باپ گھروں میں رہ گئے تھے۔ 5 جولائی کو ولودیا پیدا ہوا اور دو ہی دن بعد__ 7 جولائی کو اس کا باپ ایک لڑائی میں کام آیا۔ کونستانتین کو بھی مرتے وقت تک نہیں معلوم تھا کہ ان کا تیسرا بیٹا پیدا ہوا ہے۔

لیکن ولودیا جانتا ہے کہ اس کا باپ کس طرح مارا گیا تھا۔ اس کے پاس محاذ کے اخبار کا ایک تراشا ہے جو اسے تقریباً حفظ یاد ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ریلوے اسٹیشن پونیری کے قریب ایک لڑائی میں سارجنٹ میجر سیدوف کے توپ خانے اور جرمن ٹینکوں کے درمیان جھڑپ ہوئی۔ جرمنوں کی طاقت کہیں زیادہ تھی۔ پہلی بار سوویت توپخانے کو دشمن کے نئے ٹینکوں__ "شیر"

''چیتا'' اور ''فرڈیننڈ'' کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا اور انہیں پسپا کرنا مشکل تھا۔ پرانے ٹینک مار گولے جرمن ٹینکوں کی مضبوط فولادی دیوار سے ٹکرا کر نیچے گر پڑتے تھے۔

اس لڑائی میں ولودیا کے باپ نے ثابت کر دیا کہ رعب ڈالنے والے ''شیر'' ٹینک جرمنوں کے دوسرے اسلحات سے زیادہ خطرناک نہیں ہیں۔ وہ انتظار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ٹینک ایک سو میٹر کے فاصلے تک آ گئے۔ پھر انہوں نے توپوں سے ان پر گولہ باری شروع کر دی۔

جرمن ٹینک چاروں طرف سے انہیں گھیرے ہوئے تھے اور آگ اگل رہے تھے۔ لیکن سوویت توپ خانے کا دستہ اس وقت تک گولہ باری کرتا رہا جب تک کہ آخری توپ کام کرتی رہی۔ پورے دستے میں صرف تین آدمی زندہ بچے تھے۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور آخری لمحے تک جرمن ٹینکوں کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب ٹینکوں نے آگے بڑھنا چاہا تو سیدوف نے دستی بم لئے اور بڑھتے ہوئے ٹینکوں پر اپنی پوری قوت سے پھینک کر مار دیئے۔

اس لڑائی میں سوویت دستے نے دشمن کے آٹھ ٹینک تباہ کئے اور کونستانتین کو ان کی غیر معمولی بہادری کے صلے میں موت کے بعد طلائی ستارے کا اعزاز عطا کیا گیا۔

اب خاندان میں ان کی بیوی اگرافینا سیدووا کے علاوہ تین لڑکے اور ایک چھوٹی لڑکی ماروسیا تھی۔ زندگی مشکل تھی۔ جنگ نے تولا علاقے کو بالکل تباہ کر دیا تھا جہاں ان کا پنچایتی فارم واقع تھا۔ فارم خاندان کی ضرورتیں مشکل سے پوری کر سکتا تھا۔ انسان کی فطرت اور خاص کر بچوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ رنج والم کی باتیں جلد بھلا دیتے ہیں۔ ولودیا کو بھی اب اس مشکل زمانے کی باتیں یاد نہیں ہیں۔ اسے بس یہ یاد ہے کہ جب کسی تقریب پر مقامی کونسل کے لوگ فوجیوں کے بچوں کے لئے تحفے لاتے تھے تو وہ کتنے خوش ہوا کرتے تھے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ لوگ تقریبیں منانے کے لئے کیا کیا کرتے تھے۔ اور تحفے تو وہ کبھی نہیں بھول سکتے تھے۔

بعد میں لڑکے جب ذرا بڑے ہو گئے تو پنچایتی فارم پر اپنی ماں کا ہاتھ بٹانے لگے۔ ولودیا کا بڑا بھائی پیوتر اس کے لئے ہیرو تھا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگا پھرتا تھا۔ اس وقت پیوتر ٹریکٹر چلانے کی ٹریننگ لے رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے ''بیلوروس'' ٹریکٹر پر چھوٹے بھائی کو بٹھا لیتے تھے۔

سب سے چھوٹی اولاد ہونے کی وجہ سے ولودیا کو کافی لاڈ پیار نصیب ہوا۔ اس نے بیر یوزووا کے مقامی اسکول سے سات جماعتیں ختم کرلیں۔ لیکن تعلیم حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ گھر پر اسے مویشی کی دیکھ بھال کرنا پڑتی تھی، چارہ دینا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ پانی کا انتظام اور باڑے کی صفائی بھی اس کے ذمے تھی۔ پڑھائی کے لئے اسے کافی وقت نہیں ملتا تھا۔

بہر حال اس نے اسکول کا سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا۔ اب اسے فیصلہ کرنا تھا کہ آئندہ کون سا راستہ اختیار کرے۔

جب اس کی ملاقات فارم کے صدر سے ہوئی تو اس نے کہا: ''ولودیا، اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟ فارم میں کافی کام ہے۔ میں یہاں سے تمہیں نہیں جانے دوں گا۔''

صدر ولودیا کو اچھی طرح جانتا تھا۔ پانچویں کلاس ختم کرنے کے بعد چھٹیوں میں وہ فارم میں چھوٹا موٹا کام کرنے لگا تھا۔ اس کا خاص کام گھوڑوں کی نگہداشت تھا ــــ جاڑوں میں لید صاف کرنا اور چارہ دینا اور گرمیوں میں متفرق کاموں میں دوسروں کی مدد کرنا۔ ایک مرتبہ اپنے اچھے کام کے عوض ولودیا کو سو روبل ملے۔ وہ گھر بھاگ کر آیا اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ رقم اپنی ماں کو دیدی۔

اس کی ماں بھی نہیں چاہتی تھی کہ ولودیا گھر چھوڑ دے۔ اس وقت گھر میں وہی باقی رہ گیا تھا۔ ماروسیا بھی قریب دوسرے گاؤں کے یتیم خانے میں کام کرنے چلی گئی تھی۔

ولودیا کا ایک دوست تھا، ساشا میلنیکوف۔ وہ شہر تولا کے حرفتی اسکول میں پڑھ رہا تھا اور ولودیا سے اس کا اکثر ذکر کیا کرتا تھا۔ وہ خوش قسمت تھا۔ اسے سب چیزیں ملنے والی تھیں۔ پانچ سال کی تعلیم کے بعد وہ اچھا پیشہ حاصل کرسکتا تھا اور ثانوی ٹکنیکل اسکول کا ڈپلومہ بھی۔ ولودیا کے لئے تو ایک اور فائدہ تھا۔ اگر اسے تولا میں پڑھنے کا موقع مل جائے تو اس کے تمام اخراجات حکومت دے گی اور ماں بہت سی مالی مشکلات سے آزاد ہو جائے گی۔

یہ دن ولودیا کے لئے آسان نہیں تھے۔ بعض وقت اس کے منصوبے پورے ہوتے ہوئے نظر نہیں آتے تھے۔ آخر کار اسے حرفتی اسکول میں داخلہ مل گیا۔

پانچ سال بڑی تیزی سے گزر گئے۔ ولودیا نے ڈپلومہ حاصل کرلیا اور خودکار روٹر لائنوں پر کام کرنے والا مستری بن گیا۔ جب وہ اسکول کی پہلی کلاس میں تھا تب نوجوان کمیونسٹ لیگ میں

شامل ہوا اور اس کی سرگرمیوں میں بڑے جوش وخروش سے حصہ لینے لگا۔ یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ جس گروپ کا ولودیا رہنما تھا اس نے مسلسل تین سال تک پہلی پوزیشن حاصل کی۔

ان تمام برسوں میں ولودیا نے کبھی وقت نہیں گنوایا۔ دن میں وہ تعلیم حاصل کرتا اور ورکشاپ میں کام سیکھتا اور شام کو فنون کی شوقیہ منڈلیوں کے ساتھ ریہرسل کرتا اور ریڈیو، فوٹوگرافی کے کلبوں میں حصہ لیتا تھا۔ اس کی زندگی ایسے تفریحی مشغلوں سے بھری ہوئی تھی۔ اور وہ ابھی تک بچپن کی ایک عادت نہیں بھولا تھا ___ رات کو دیر تک کتابیں پڑھنا۔

دسویں جماعت میں ولودیا نے پہلی بار ایک تکنیکی کام کو بہتر طور پر اور آسانی سے کرنے کی تجویز کی۔ اس نے اپنے مزدور ہونے کی اہمیت پر بڑا فخر محسوس کیا۔ اس وقت وہ اور اس کے ساتھی گہرے سمندر کے لئے پمپ بنا رہے تھے۔ اس کام میں صحت کی بے حد ضرورت تھی۔ شروع شروع میں نتائج اچھے نہیں نکلے۔ خرابی کی جڑ یہ تھی کہ پہیوں کے اوپری حصے آپس میں ٹھیک نہیں جڑ پاتے تھے۔ اس مسئلے پر ولودیا نے کئی بار غور کیا۔ اس کا حل ضرور ہونا چاہئے۔ آخرکار اسے حل مل گیا۔ اور جب حل مل گیا تو لوگوں نے تعجب سے کہا کہ انہوں نے یہ پہلے کیوں نہیں سوچا تھا۔ پمپ میں دو مختلف جگہوں کے پہیوں میں سوراخ دو الگ الگ مشینوں پر کئے جاتے تھے۔ ولودیا نے مشورہ دیا کہ دونوں کام ایک مشین پر کئے جائیں ___ ایک ہی برما بیک وقت دونوں حصوں میں سوراخ کرے۔

اس کے بعد پمپ بہت ہی اچھے تیار ہونے لگے۔

حرفتی اسکول سے ٹریننگ ختم کرنے کے بعد ولودیا نے چند مہینے کام کیا۔ پھر وہ لازمی فوجی خدمت کے لئے چلا گیا۔ اسے براہ راست راکٹ دستے میں شامل کرلیا گیا۔

یہاں سے ولودیا کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔

نوجوان رنگروٹ نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ اس نے سارجنٹ کی ٹریننگ کا کورس بڑی کامیابی کے ساتھ ختم کیا اور اسے جلد سگنلر بنا دیا گیا۔ ابھی تک جو چیز اس کے لئے شوقیہ تھی وہ اب پیشہ بن گئی تھی۔ جونیئر سارجنٹ سیدوف ایک فوجی دستے میں متعین تھا۔

ولودیا کا نیا مقام زیادہ کام اور زیادہ تعلیم کا متقاضی تھا۔ شروع شروع میں جب معائنے اور چاند ماری میں بہت اچھے نمبر ملے تو اس نے اسے کوئی غیر معمولی بات نہیں سمجھی۔ غالباً

غیر شعوری طور پر نوجوان سگنل والوں پر غفلت اتنی چھا گئی تھی کہ وہ بہت اچھے نمبروں کو گویا اپنا پیدائشی حق سمجھنے لگے تھے۔

لیکن جب میعادی امتحان آئے تب ان کی آنکھیں کھلیں۔ اب بہت اچھے نمبروں کے بجائے انہوں نے محض اچھے نمبر پائے۔

ولودیا نے نوجوان کمیونسٹ لیگ کے گروپ کے رہنما کی حیثیت سے میٹنگ کی۔

''کیا ہم میں سے ہر ایک نے مسئلہ سمجھ لیا ہے؟ اگر سب کچھ صاف ہے تو میں تجویز کرتا ہوں کہ ہم جلد از جلد اپنی غلطی ٹھیک کرنے کی کوشش کریں۔ ہمیں پڑھنے لکھنے پر زیادہ وقت صرف کرنا چاہئے۔ پڑھتے وقت اونگھنا ہم پر حرام ہے۔ ہمیں ایک ایک لمحے کو پوری طرح استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ اپنے ضمیر کو گواہ بنایئے۔''

جو بھی فوج میں رہ چکا ہے اچھی طرح جانتا ہے کہ سپاہی کا دن کتنا مصروف ہوتا ہے۔ لیکن ولودیا اور اس کے دوست پڑھنے کے لئے زیادہ ہی وقت نکال لیتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو مدد دیتے تھے، ایک دوسرے کی نگرانی کرتے تھے اور نوجوان کمیونسٹ لیگ اور اپنے ضمیر کے سامنے جوابدہ تھے۔

ولودیا سے اکثر پوچھا جاتا تھا:

''سخت جسمانی ٹریننگ تم کب شروع کرو گے؟''

اس نے یہ بطور ''ضد'' شروع کر دی۔ لوگ جانتے تھے کہ ولودیا کا جسم کمزور ہے اور اس کے لئے جسمانی ٹریننگ بہت مشکل ہوگی۔ لیکن وہ ٹالنے والا آدمی نہیں تھا۔ دوست اس کی مدد کرنے لگے۔ اور اگر کسی آلے کی ساخت کے سلسلے میں انہیں کوئی بھی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ ہمیشہ ولودیا کے پاس آتے تھے۔ وہ ہر مسئلے پر دانشمندانہ مشورہ دیتا اور ان کی غلطیاں درست کرنے میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ اس نے نکولائی نکیشن کو بہت مدد دی جس نے امتحان میں تیسری ڈویژن پائی تھی۔ خود ولودیا کو دوسری ڈویژن ملی تھی۔ اب ساتھی ترقی کرنے لگے اور انہیں بہت اچھے نمبر ملنے لگے۔

گروپ کے سب لوگوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کام میں ڈھیل نہیں ڈالیں گے۔ سیدوف نے جواب گروپ کا رہنما ہے اپنا وعدہ پورا کر لیا ___ اس نے پہلی ڈویژن حاصل کی۔ دستے میں اس کا کام نہایت ہی ذمے داری کا ہے ___ وہ کمانڈر اور راکٹ بازوں کے درمیان رابطہ قائم رکھتا ہے۔

''کیا تم یہ رابطہ قائم رکھ سکو گے؟'' ایک مرتبہ اس سے پوچھا گیا۔

''بالکل۔ جیسے ہی کمانڈر حکم دیتے ہیں فوراً سگنل کے ذریعے اسے راکٹ بازوں تک پہنچا دیا جاتا ہے۔''

جنگ سے پہلے ولودیا کے باپ کا نہایت ہی پُرامن کام تھا__ اناج اگانا۔ لیکن جب ملک کو ضرورت پڑی تو اپنے ملک کی، اپنے خاندان اور ولودیا کی مدافعت کے لئے جسے وہ جانتا بھی نہیں تھا اس نے ہل کو الگ رکھ دیا اور بندوق سنبھال لی۔

خود ولودیا تمام عمر فوج میں ملازمت کرنا نہیں چاہتا۔ وہ اکثر کہا کرتا ہے: ''لازمی فوجی خدمت کے بعد میں ریڈیو الیکٹرونکس کے انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔''

لیکن اگر ضرورت پڑی تو ولودیا بلا پس و پیش مورچے پر موجود ہوگا اور باپ کی طرح اس کا نشانہ بھی کبھی خالی نہیں جائے گا۔

از: یوری ازیوموف

بلندیوں پر

(1)

ڈرائیور کی کیبن سے ٹیک لگائے ایک نوجوان کھلی لاری پر کھڑا ہوا تھا اور کسی سوچ میں سامنے دیکھ رہا تھا۔ کہر میں لپٹے ہوئے ماسکو کے مضافات کے دھندلے دھندلے نقش اسے نظر آرہے تھے۔

سرد ہوا اور برف سے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ لیکن وہ دیکھے جارہا تھا۔ اس نے اپنی پشت جھکا رکھی تھی اور گرم ٹوپی اتنی نیچی کر لی تھی کہ اس کی کور آنکھوں تک آ گئی تھی۔ لاری کھڑکھڑاتی ہوئی گڑھوں پر سے تیزی سے گزر رہی تھی۔ پھر وہ اچانک مڑی اور مورچہ بندی کی ایک تنگ گزرگاہ میں داخل ہو گئی۔

مورچہ بندی! پہلے یہ لفظ نہ صرف شاگرد فتروں بلکہ 27 سالہ فورمین پروخور تارونتائیف کے لئے بھی محض انقلاب کا رومانوی نشان تھا۔ اور اب مورچہ بندیاں ماسکو میں موجود تھیں۔ سامنے بندوقوں کے موکھے، ریت سے بھرے ہوئے تھیلے اور فولادی رکاوٹیں دکھائی دے رہی تھیں۔

ماسکو کتنا بدلا ہوا نظر آرہا تھا۔ اب یہاں پہلے کی طرح چہل پہل نہیں تھی۔ ہر طرف سخت عزم کا ماحول تھا۔ 1941ء کا سال۔ عظیم مدافعت کی جنگ جاری تھی۔ دارالحکومت کے لوگوں نے دشمن کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے تھے۔ وہ اپنا فریضہ پورا کرنے کے لئے تیار تھے۔ محاذ جنگ پر سپاہیوں کی طرح انہیں بھی اپنی طاقت پر بھروسہ تھا۔

سڑکوں پر بچوں کی ہنسنے کھیلنے کی آوازیں سنائی نہیں دیتی تھیں۔ جگہ جگہ طیارہ شکن توپوں کے دھانے آسمان کو تکتے رہتے تھے۔ دکانوں کی کھڑکیوں کو تختوں اور ریت کے تھیلوں سے محفوظ کر لیا گیا تھا۔ چوراہوں پر ملیشیا والے ڈیوٹی کے وقت کاندھے پر بندوق لٹکائے اور خود پہنے رہتے تھے۔

ہوائی حملے سے خبردار کرنے والے سائرن دیر تک بجتے رہتے۔ لوگوں کو گشتی محافظ جلدی جلدی پناہ گاہوں میں لے جاتے اور سڑکوں پر سناٹا چھا جاتا تھا۔ لیکن فتروں والی لاری جس کا کام ماسکو کی مدافعت کو مضبوط کرنا تھا اجڑی ہوئی سڑکوں پر تنہا گھومتی رہتی تھی۔ لاری کے سامنے والے شیشے پر ایک خاص پاس چسپاں تھا جو ہر جگہ پروانہ راہداری کا کام انجام دیتا تھا۔

کولیا کوروستیلیوف کو یاد ہے کہ جب پہلی بار اس نے لال چوک دیکھا تو کیا محسوس کیا تھا۔ ماسکو کے اس قدیم مرکز سے ہی محاذ جنگ تک سڑک جاتی تھی۔ اور ماسکو سے باہر اس سڑک پر فنر چھوٹے زمیں دوز قلعے بنانے میں مصروف تھے۔ دشمن کے ٹینک روکنے کے لئے سڑک کے آر پار دور دور تک رکاوٹوں کی لائن چلی گئی تھی جو قدیم جانوروں کے ڈھانچوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ کولیا کو اس پر فخر تھا کہ تارونتائیف کی ٹیم نے کئی رکاوٹیں تیار کی تھیں۔ فنر ریل کی پٹریوں اور گارڈروں کے ٹکڑے جوڑ کر ایسی رکاوٹیں بنانے میں مصروف تھے۔ اس نے سوچا کہ سامنے والی رکاوٹیں شاید تارونتائیف اور اس کے نوجوان شاگردوں نے بنائی ہوں۔ لیکن اپنی اور دوسروں کی بنائی ہوئی رکاوٹوں میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ پھر یہ کوئی اہم بات بھی نہیں تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ ماسکو کے چاروں طرف میدانوں اور جنگلوں میں اتنی رکاوٹیں کھڑی کر دی جائیں کہ دشمن کے ٹینکوں کے لئے آگے بڑھنا مشکل ہو جائے۔

(2)

ایک صبح تارونتائیف نے اپنے نوجوان شاگردوں پر ممتحن کی طرح نظر ڈالی جب وہ ملاقات کی جگہ کھڑے تھے اور لاری میں کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ وہ مستقبل کے کام کے سلسلے میں انہیں جانچ رہا تھا۔ ماسکو میں کام کرنا ایک بات تھی لیکن کالینن میں بالکل محاذ کے نزدیک ایک پل کی دوبارہ تعمیر کرنا دوسرا معاملہ تھا۔

''لڑکو، یہ تمہارے کھیلنے کودنے کے دن تھے... لیکن کیا کیا جائے، جنگ جاری ہے۔ مشکل کام تمہارا انتظار کر رہا ہے'' تارونتائیف نے اس طرح ان کی ہمت افزائی کی۔ انہیں کولیا کی پختگی اور برداشت کرنے کی صلاحیت پسند تھی۔ چنانچہ وہ ان کے منتخب کئے ہوئے لڑکوں میں سے ایک تھا۔

شہر کالینن کو دیکھتے ہی پتہ چل گیا کہ حال میں یہاں کئی دنوں تک گھمسان کی لڑائی ہوئی ہے۔ محلے کے محلے تباہ و برباد تھے۔ اب وہاں ملبے کے ڈھیر، آگ اور دھواں نظر آتا تھا۔ مرکزی چوک کو دیکھ کر کولیا خاص طور پر متاثر ہوا جس کے آس پاس جلے ہوئے سیاہ کھنڈر ہی کھنڈر تھے۔ ایک مقامی باشندے نے بتایا کہ نازیوں نے محض نفرت کے جذبے میں کس طرح لینن کے مجسمے پر

مشین گن سے گولیاں چلائیں جو وہاں چوک میں کھڑا تھا۔ یہ سن کر کولیا نے دل میں کہا: ''نازی لینن کے مجسمے کے ریزے ریزے کر ڈالیں لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ لینن کی تعلیمات اور شبیہہ لافانی ہیں۔'' اسے پورا یقین تھا کہ تھوڑے ہی عرصے بعد لینن کا مجسمہ پھر اسی چوک میں کھڑا ہوگا، اس لئے کہ کسی بھی سوویت شہر کا تصور لینن کے مجسمے کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔

فتروں کا کام اس پل کو از سر نو تعمیر کرنا تھا جسے نازیوں نے اڑا دیا تھا۔ اس کا ایک حصہ ٹوٹ کر دریا میں گر پڑا تھا اور دوسرے حصے میں صرف گارٹریں باقی رہ گئی تھیں۔

جنگ سے پہلے اس پل پر سے ٹرام گزرتی تھی۔ یہ والگا کے دو اہم کناروں کو ملاتا تھا۔ محاذ کے اس خطے میں سوویت یونین کی فتح کا دارومدار اس پل کی تعمیر نو پر تھا۔ بہار کا موسم شروع ہونے والا تھا اور پل کے بغیر محاذ کو رسد بھیجنے میں کافی دقت ہوسکتی تھی۔ جب والگا میں برف پگھلنے لگتی ہے تو اسے کشتی کے ذریعے پار کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔

کئی بار جرمن بمبار ہوائی جہاز ٹوٹے ہوئے پل کے اوپر منڈلائے۔ انہوں نے تین بم بھی گرائے جو برف پر گرے اور اس میں تین بڑے بڑے سوراخ کر دیئے۔

محاذ آہستہ آہستہ مغرب کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس لئے جرمن ہوائی جہازوں کی پروازیں ادھر ختم ہوگئی تھیں۔

اپنی زندگی میں پہلی بار کولیا ٹوٹے ہوئے پل کی گارٹروں پر تقریباً 60 فٹ کی بلندی پر کھڑا ہوا۔ نیچے برف سے جمی ہوئی والگا کی سطح صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پل کا عادی ہوتا گیا اور روز بروز اس کی ہمت بڑھتی گئی۔

آخر کار پل کی ساری تعمیر ختم ہوگئی۔

اس زبردست کام کو پورا کرنے پر جن لوگوں کو محاذ کی کمان کی جانب سے مبارکباد دی گئی ان میں کولیا اور اس کے ساتھی فتر بھی شامل تھے۔

سب سے پہلے ایک بکتر بند گاڑی پل پر سے گزری۔ اس کے بغلی تختے پر کمانڈر کھڑا ہوا معماروں کو سلامی دے رہا تھا۔

اس کی جلو میں فوجیوں کی گاڑیاں، ایمبولنسیں، سامان سے لدی ہوئی برف گاڑیاں، گایوں کے گلے اور پناہ گزینوں کے غول چھکڑوں پر سامان لادے ہوئے آرہے تھے۔ پل زندگی کے

وروغل سے گونجنے لگا۔

فٹروں نے اسی کھلی ہوئی لاری پر بیٹھ کر کالینن کو خدا حافظ کہا۔ کولیا اب پھر پروخور تارونسائیف کے مضبوط شانوں سے ٹیک لگائے جھکا ہوا بیٹھا تھا۔

اس کے بعد کولیا نے یاخرو ما مقام پر ماسکو والگا نہر کے آر پار پل کی دوبارہ تعمیر کرنے میں حصہ لیا۔ پھر ایک غمگین واقعہ پیش آیا ــــ کولیا اور تارونسائیف کو ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑا۔ انجینئروں اور فٹروں کے ایک گروپ کے ساتھ پروخور محصور لینن گراد بھیج دیئے گئے۔

کولیا کے لئے لینن گراد کا محاذ بہت کچھ تھا۔ اسی محاذ پر اس کے والد دمتری کوروستیلیوف دشمن کے خلاف سرخ فوج کے صفوں میں لڑ رہے تھے۔

دوستوں کا ساتھ چھوٹنے کا اسے بے حد قلق تھا۔ لیکن کولیا کوروستیلیوف جانتا تھا کہ ابھی وہ تجربے کار نہیں ہے اور ذمے دار کام کے لئے پختہ کار فٹروں کے گروپ میں اسے فی الحال شامل نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں تقریباً جرمنوں کی نظروں کے سامنے کیروف کارخانے سے بڑے کرین اکھاڑنے تھے جن کی اورال میں سخت ضرورت تھی۔

(3)

انسان کے ذہن میں نئے تاثرات ہمیشہ اچھی طرح محفوظ رہتے ہیں۔ کولیا کو بھی اپنی پہلی پرواز کی ایک ایک تفصیل یاد ہے۔ پروخور کے ساتھ وہ ماسکو سے وارسا روانہ ہوا تھا۔ ہوائی جہاز اڑتے وقت کبھی یکا یک نیچے آ جاتا اور کبھی بلند ہو جاتا۔ مسافروں کا برا حال تھا۔ کولیا کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ آخر مسافر اتنے بدحال کیوں ہیں۔ خود وہ ہاتھوں کے سہارے جہاز پر چل سکتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہوائی جہاز کا فرش کبھی نیچے چلا جاتا تھا اور کبھی اوپر اور بعض وقت تو وہ پیروں تلے غائب سا ہو جاتا تھا۔ لیکن اس میں بھی دل لگی تھی، بلندی پر کام کرنے والے کو ''فضائی'' بیماری نہیں ستاتی۔

جنگ کے شعلے بجھ رہے تھے۔ جرمن رہخستاغ پر سرخ جھنڈا لہرا رہا تھا۔ یہ فتح کا نشان تھا۔ لیکن 1945ء کی گرمیوں میں بھی آگ اور دھواں دیکھا جا سکتا تھا۔ شہر اور دیہات تباہ و برباد تھے اور ابھی زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔

جب کولیا نے حرفتی اسکول ختم کیا تو جنگ بالکل ختم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جنگ کے خاتمے تک اس کی عمر فوج میں بھرتی ہونے کے قابل نہیں تھی۔ اس نے جنگ کے بعد ہی لازمی فوجی خدمت انجام دی۔

کوروستیلیوف نے جہاز سے وارسا کا جو منظر دیکھا اسے وہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ جہاز کے بازو کے نیچے ایک لامحدود قبرستان پھیلا ہوا تھا، ایک وسیع پتھریلا صحرا۔ اور جب فٹر موٹروں میں بیٹھ کر شہر سے گزرے تو منظر اور بھی زیادہ دردناک ہو گیا___ دیواریں دھوئیں سے سیاہ تھیں، ملبے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، ٹوٹے ہوئے پتھروں کے ٹیلے کھڑے تھے اور ان پر گھاس اگ آئی تھی۔ پہلے کبھی جو چوڑی چوڑی سڑکیں ہوا کرتی تھیں اب دریا کی تہہ کی مانند تھیں اور ان کی دونوں جانب پتھریلے کنارے تھے۔ ادھر ادھر لوگ کھنڈروں کو کھودنے میں مصروف تھے۔ جا بجا صلیبوں اور جلتی ہوئی موم بتیوں سے پتہ چلتا تھا کہ بموں سے تباہ شدہ مکانوں کے نیچے ہی ان کے باسیوں کے مدفن ہیں۔

وارسا ریڈیو اسٹیشن کا ٹاور نازیوں نے اڑا دیا تھا۔ وارسا کی آواز گھونٹ دی گئی تھی، وہ پولینڈ کے لوگوں سے مخاطب نہیں ہو سکتا تھا۔ فٹروں اور سرنگیں ہٹانے والوں کا کام یہ تھا کہ ٹاور کی از سر نو تعمیر کریں۔

نو وارد مضافات میں مقیم تھے۔ یہ شہر کے مرکز سے تقریباً 20 کلومیٹر دور تھا اور ریڈیو اسٹیشن کے بالکل ہی نزدیک۔

کولیا کی خواہش تھی کہ اس کام کے لئے اسے تجربے کار اور آزمودہ شخص سمجھا جائے۔ چنانچہ اس نے فٹروں کی ایک چوڑی پیٹی کس لی، اس میں اپنے دستانے کھرس لئے اور سر پر خاص خود چڑھا لی۔ آس پاس بوجھ اٹھانے کی بے شمار چرخیاں اور کرین موجود تھے لیکن ریڈیو اسٹیشن کے ٹاور کی مرمت آسان نہیں تھی۔

فٹروں کو اس قسم کے کام کا خاصا تجربہ تھا۔ حال ہی میں وہ بارانووچی میں تباہ شدہ ٹاور دوبارہ کھڑا کر چکے تھے۔ لتھوانیا میں انہوں نے یوم فتح کے موقع پر ایک بڑا ریڈیو ٹاور تعمیر کیا تھا۔

وارسا ریڈیو اسٹیشن کے ٹاور کی تعمیر نو ایک روز صبح پانچ بجے شروع ہوئی۔ اس میں بوجھ اٹھانے کی 20 چرخیاں استعمال کی گئیں۔ کولیا کے ذمے ایک اہم ترین چرخی تھی۔ اسے یہ نگرانی کرنا

تھی کہ چرخی کے بیچ میں تار کا رسہ ٹھیک طرح لپیٹا جائے۔ یہاں بھی تاروننائیف اس کی رہنمائی کر رہے تھے۔ کام ختم کرنے میں پورے دس گھنٹے صرف ہوئے۔ ایک مرتبہ پھر پولینڈ کا قومی ترانہ تمام ملک میں گونجنے لگا۔

(4)

شہر ماسکو کی 800 ویں سالگرہ کے اعزاز میں بہت ہی بلند نئی عمارتوں کی تعمیر شروع ہوئی۔ اس کام کے لئے بلندی پر کام کرنے والے کئی سو فٹروں کی ضرورت تھی۔ جلد ہی ماسکو کی چھتوں کے اوپر بلندی پر کام کرنے والے فٹر نظر آنے لگے۔

کولیا کوردستیلیوف دونباس سے ماسکو آ گیا۔ وہاں اس نے اپنا کیو وہ میں دھوئیں اور میل کچیل سے گھری ہوئی دو بھٹیوں کے درمیان انجن بھٹی کھڑی کی تھی۔ اب وہ ماسکو کے مرکز میں تعمیری کام میں مصروف تھا۔

اسمولینسکایا چوک میں کئی منزلہ عمارت کا فولادی ڈھانچہ آہستہ آہستہ آسمان کی جانب اٹھایا گیا۔ اور پھر لوہے کی کھٹا کھٹ، بڑے دار چرخیوں کی چرخ چوں، بلو لیمپوں کی سی سی، سیٹیاں، چیخ پکار ___ غرض کہ اتنا شور مچتا رہا جو ماسکو میں پہلے کبھی نہیں سنا گیا تھا۔

کولیا اپنے نیچے تمام شہر کو دیکھ سکتا تھا۔ اربات سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی اربات چوک سے مل جاتی تھی۔ اس پر موٹر کاروں کا غیر متناہی سلسلہ جاری رہتا تھا اور موٹریں ماچس کی ڈبیہ کے برابر نظر آتی تھیں۔

بعد میں بلندی پر کام کرنے والے فٹر ماسکو یونیورسٹی کی جائے تعمیر پر اکٹھا ہوئے۔ یہاں کام کے حالات زیادہ مشکل تھے۔ اسمولینسکایا چوک پر جو کئی منزلہ عمارت کھڑی کی گئی تھی اس کا مینار 381 فٹ بلند تھا لیکن یونیورسٹی زمین سے 711 فٹ اونچی تھی ___ تقریباً دوگنی سے زیادہ۔

بلندی پر کام کرنے کے لئے آدمی کو فولادی اعصاب چاہئے۔ اس کے لئے نہ صرف ہنر اور ٹریننگ بلکہ انتہائی تحمل، ضبط اور بعض وقت بے جگری کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

اکثر لوگ بعض بلندیوں کو "سر چکرا دینے والی" بلندیاں کہتے ہیں۔ بارہا کولیا اور اس کے ساتھی مزدوروں کو بڑی بلندی پر ایسی گارڈر پار کرنا پڑی جو سگریٹ کی ڈبیہ سے زیادہ چوڑی

نہیں تھی، انہیں ایسے چھجوں اور چھتوں کے سروں پر چڑھنا پڑا جہاں مشکل سے قدم رکھنے کی جگہ تھی۔ اونچے محفوظ چبوترے پر کام کرنے سے پہلے جس کے گرد حفاظتی کٹہرا ہوتا ہے آخر آدمی ہی حفاظتی کٹہرا کھڑا کرتے ہیں۔ اسی طرح حفاظتی پیٹی استعمال کرنے سے پہلے غیر محفوظ آدمی ہی گارڈر کو جماتے ہیں۔

یونیورسٹی کی عمارت پر کام کرتے ہوئے نکولائی کوروستیلیوف کو کئی مہینے گزر گئے۔ ایک پختہ کار اور لائق مزدور کی حیثیت سے ان کی عزت کی جانے لگی۔ لیکن انہیں مزید تعلیم کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ اور پروفیسر خود انہیں کوئی مدد نہیں دے سکتے تھے۔

جب یونیورسٹی کی عمارت کی تعمیر شروع ہوئی اسی دن سے وہاں شام کا اسکول کھل گیا تھا۔ جو نوجوان مزدور اسکول کا سرٹیفکیٹ حاصل کر کے آئندہ یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتے تھے وہ کام کے بعد یہاں پڑھ سکتے تھے۔ تعلیم کا سرچشمہ تعمیر کرنے سے معماروں کی علم کی پیاس بڑھنا قدرتی بات تھی۔

کئی مرتبہ نکولائی بے چینی کے عالم میں نوٹس بورڈ کے سامنے کھڑے ہوئے جس پر جائے تعمیر کے اسکولوں اور نصاب کی تفصیلات لکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے جائے تعمیر کے دفتر پر یہ نوٹس بھی چسپاں دیکھا: "جو نوجوان معمار آئندہ یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتے ہیں وہ اپنی درخواستیں ابھی بھیج دیں۔"

لیکن نکولائی کے لئے یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ شام کے اسکول میں وہ صرف چھٹی کلاس سے ہی اپنی پڑھائی شروع کر سکتے تھے۔ پھر جب وہ دو مختلف پالیوں میں کام کر رہے تھے تو پابندی سے شام کو تعلیم کیسے حاصل کر سکتے تھے۔ ہر روز انہیں کام پر بہت دور سے آنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ابھی ابھی اپنے لڑکپن کی دوست سنہرے بالوں والی، نیلی آنکھوں والی زینا سے شادی کی تھی۔

ماسکو میں کئی منزلہ عمارتیں بنانے کے بعد نکولائی کوروستیلیوف سائبیریا چلے گئے۔ وہاں انگارا دریا کے کنارے گھنے جنگل میں کارخانوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ ایک نیا شہر ابھر رہا تھا۔ اس وقت نقشے پر شہر انگارسک کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ لیکن وہاں بلند رہائشی مکان اور کارخانوں کی عمارتیں نظر آنے لگی تھیں۔

(5)

وہ وقت بھی آ گیا جب سوویت معمار اکثر دوسرے ملکوں کو جانے لگے۔ وہاں انہوں نے اپنے دوستوں اور پڑوسیوں کے شانہ بشانہ عمارتیں تعمیر کرنے میں اپنا تجربہ استعمال کیا۔

نکولائی کوروستیلیونف بھی ان میں سے ایک تھے۔ اسے دلچسپ اتفاق کہیے کہ سات سال کے بعد وہ پھر وارسا آئے جو جانا پہچانا تو تھا ہی لیکن بدلا ہوا بھی۔

جنگ کو ختم ہوئے سات برس ہو چکے تھے لیکن ابھی تک وارسا میں کھنڈر موجود تھے اور سڑکیں کی سڑکیں غیر آباد تھیں۔

عمارتیں تعمیر کرنے کی ضرورت تھی اور ان میں سائنس اور ثقافت کے محل کو اہم مقام حاصل تھا جسے سوویت حکومت بطور تحفہ بنا رہی تھی۔ نکولائی یہیں کام کرنے والے تھے۔

26 مئی 1952ء کو پہلے دن نکولائی جائے تعمیر پر آئے۔ اس وقت عمارت اٹھنا بھی شروع نہیں ہوئی تھی تو ظاہر ہے بلندی پر کام کرنے والوں کی ضرورت کیوں ہوتی۔ اسے دل لگی سمجھئے کہ بلندی پر کام کرنے والے معماروں نے اپنا کام عمارت کی بنیاد ڈالنے سے شروع کیا!

آخر کار عمارت کا ڈھانچہ تعمیر کر لیا گیا اور اس پر ایک اونچا مینار کھڑا کیا جانے لگا۔ سب سے بلندی پر کام کرنے کے لئے کئی معماروں کے ساتھ نکولائی بھی چنے گئے۔ وہ دن بھی آ گیا جب تقریباً 700 فٹ بلند مینار کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ اس عالیشان مینار کے متعلق لوگوں نے بہت کچھ پڑھا تھا۔ وہ نیچے سڑکوں پر کھڑے ہو جاتے اور سر اٹھا اٹھا کر اسے بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔

21 جولائی 1955ء نکولائی کی زندگی میں اہم تاریخ ہے۔ اس دن سائنس اور ثقافت کے محل کے بڑے بڑے ستونوں پر سرخ اور سفید فیتے لپٹے ہوئے تھے اور درمیان میں میتسکیوچ اور کوپرنیکس کے مجسمے نصب تھے۔ اس افتتاحی تقریب میں بہترین کام کرنے والوں کو اعزاز دیئے گئے۔ نکولائی کے سینے پر "پولینڈ کے احیا کے کمانڈر" کا تمغہ چمک رہا تھا۔ اسی روز انہیں آرڈر آف لینن بھی عطا کیا گیا۔ ایسے انمول انعام ملنے پر نکولائی نے اپنی خوشی ظاہر کرنے میں مطلق تکلف سے کام نہیں لیا۔

(6)

ہر نئے ملک کی آب و ہوا کا عادی ہو جانا آسان نہیں ہے، خاص کر جہاں گرمیوں میں پارہ 104 ڈگری تک پہنچ جاتا ہو۔ بھلائی میں سوویت انجینئر اور معمار نہ صرف اس درجۂ حرارت میں رہتے تھے بلکہ کام بھی کیا کرتے تھے۔ احتیاطاً ڈاکٹروں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ ایک گھنٹہ دھوپ میں کام کرنے کے بعد پندرہ منٹ آرام کیا کریں۔

وہ سورج نکلتے ہی اٹھ جاتے اور دھوپ کی عینک اور کینوس کے لباس کے علاوہ چار سوراخوں والا موٹا ہیٹ بھی پہنتے تھے۔ جب نکولائی بھلائی آئے تو انہوں نے دیکھا کہ ہندستانی مزدور اپنے سروں پر رومال کانوں تک اس طرح باندھتے ہیں کہ وہ جھلستی ہوئی گرمی سے بچے رہیں۔ رومال کو تہہ کر کے سر کے پیچھے سے گزار کر پیشانی کے اوپر اس کی گرہ باندھ لی جاتی ہے۔ اس طرح پسینہ چہروں پر مستقل بہنے کے بجائے رومال میں جذب ہو جاتا ہے۔ اس بھیگے ہوئے رومال سے ذرا خنکی بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔

تھرماس ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتے تھے جن میں عام طور پر ٹھنڈا لیمو کا پانی یا ٹھنڈی چائے بھری رہتی تھی۔ بعض سوویت انجینئر اور مزدور بلا شکر گرم چائے پسند کرتے تھے۔

جب بارہ بجے سورج سر پر آتا اور تمام آسمان بے رحم سخت گرمی سے تپنے لگتا تو جائے تعمیر خالی ہو جاتی تھی۔ سب لوگ دھوپ سے بچنے کے لئے سایہ دار جگہ چلے جاتے تھے۔

لیکن دشواریاں صرف موسم تک محدود نہیں تھیں۔ یہ بھی ضروری تھا کہ نئے طور طریقوں، عادتوں، رسم و رواج، رہن سہن کے حالات غرض کہ ایک پورے نئے نظام حیات کو اپنایا جائے۔

وہاں ایک بڑی دقت زبان کی بھی تھی۔ جب لوگ کسی مشترکہ زبان کے بغیر پیچیدہ کام کر رہے ہوں اور اس کے علاوہ ہدایتیں بھی دینی ہوں تو مشکلات کا اندازہ اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے۔ بہت سے مقامی مزدور ایسے بھی تھے جو انگریزی نہیں جانتے تھے۔ ایسی صورت میں انگریزی اور روسی زبانوں میں لکھے ہوئے کام کے منصوبوں سے کوئی مدد نہیں ملتی تھی۔ وہاں مختلف بولیوں کا شور مچا رہتا تھا، اس لئے کسی کو اپنی بات سمجھانا تقریباً ناممکن تھا۔ انگریزی اور روسی کے علاوہ جائے تعمیر پر ہندستان کی کئی زبانیں بولی جاتی تھیں ـــــ اردو، بنگالی، گجراتی، ملایالم، پنجابی اور خاص کر

ہندی۔صرف روسی کا ایک لفظ ہر قوم کے لوگ سمجھتے تھے یہ تھا ''داوائی'' (''جلدی کرو'')۔

مصیبتیں یہیں پر ختم نہیں ہوئیں۔نکولائی کے لئے انگریزی ناپ اور وزن کے پیمانے دردسر بن جاتے خاص کر جب انہیں مچان بندی کے سلسلے میں حساب کتاب لگانا پڑتا تو بڑی ہی پریشانی ہوتی تھی۔ایک اور بھی مشکل تھی __ وہاں لوگوں کا اصرار تھا کہ فولاد کے موٹے تاروں کے بجائے منیلا کے رسے استعمال کیے جائیں جن کے کس بل سے وہ خوب واقف تھے۔

بھلائی میں جس بڑے پیمانے پر جسمانی محنت استعمال کی جاتی تھی نکولائی کبھی اس کے عادی نہیں ہوسکے __ مزدور پھاوڑوں سے زمین کھودتے تھے، عورتیں سر پر مٹی سے بھری ہوئی ٹوکریاں لے جاتی تھیں، چار مزدور ٹل کر ڈنڈوں پر بھاری پتھر لٹکاتے تھے۔

شروع میں نکولائی کھلی بھٹی پر کام کرتے رہے، پھر انہیں انجن بھٹی پر لگا دیا گیا اور یہاں وہ ترچھے پل کے نگراں مقرر کر دیئے گئے۔ یہ کام انتہائی صبر آزما تھا اور اس میں بڑی مہارت کی ضرورت تھی۔انجن بھٹیوں کی تعمیر کے سربراہ، ایوان فادیئف نے نکولائی کے بارے میں لکھا:

''غیر معمولی جرأت کا مالک۔ ہندستانی انہیں بلندیوں کا فاتح کہتے ہیں۔''

انجن بھٹی کی افتتاح کا وقت قریب آتا گیا۔ایک ہفتہ پہلے وہاں ایک خوبصورت خیمہ نصب کر دیا گیا جس میں پروہت براجمان ہوگئے۔آس پاس کی فضا صندل کی لکڑی کے دھوئیں سے معطر رہنے لگی اور اس میں اشلوک گونجنے لگے۔

ترچھے پل پر سے جسے نکولائی کوروستیلیوف نے کھڑا کیا تھا اب بھاری ڈبے جانے لگے۔

جب تعمیر کا سب کام ختم ہوگیا تو بھٹیاں چالو کر دی گئیں __ پگھلے ہوئے لوہے کی دھار سانچوں میں گرنے لگی اور آگ کی روشنی سے لوگوں کے چہرے تمتمانے لگے۔ہندستانیوں نے جوش میں آکر کئی زبانوں میں نعرے بلند کیے۔اس شوروغل میں روسی الفاظ صاف سنائی دے رہے تھے۔''خروشو'' (اچھا)، ''لینن''، ''داوائی''، ''اسپوتنک''۔ پھر لوگوں نے چلانا شروع کر دیا ''ہندی روسی __ بھائی بھائی''۔

کئی ہندستانی نکولائی کوروستیلیوف کے پاس آئے اور ہاتھ جوڑ کر بڑی عزت سے نمستے کیا۔ سب لوگ نکولائی کو ''روسی ماہر'' کہا کرتے تھے۔ایک نوجوان لڑکے نے بھی جس کی آنکھیں چمک رہی تھیں انہیں مبارکباد دی۔ پہلے یہ اپنے دبلے پتلے ہاتھوں سے سامان ادھر سے ادھر اٹھایا کرتا

تھا۔اس کی یومیہ اجرت ایک روپیہ تھی جس سے وہ اپنا پیٹ مشکل سے بھر سکتا تھا۔''روسی ماہر'' کے آنے کے بعد اس کی کایا پلٹ گئی۔نکولائی نے دوسرے نوجوان مزدوروں کی طرح اس لڑکے کے لئے بھی نئے ہنر کا دروازہ کھول دیا۔وہ سب انہیں دیوتا سمجھنے لگے۔نکولائی نے اسے تحمل اور دوستانہ طریقے سے ٹریننگ دی۔اب لڑکا روزانہ سات آٹھ روپے اجرت پانے لگا۔اس کے علاوہ وہ تربیت یافتہ بن گیا۔یوں کہنا چاہئے کہ اس لڑکے نے دوبارہ جنم لے لیا۔بھلائی میں انجن بھٹیاں تعمیر کرتے وقت ''روسی ماہر'' نے بے شمار لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔

☆☆☆

نکولائی کوروستیلیوف تین سال تک ماسکو سے باہر رہے۔اس عرصے میں انہوں نے ہندستان کے گرم سورج کے نیچے کام کیا اور سخت حالات میں ہزاروں من وزنی فولادی ڈھانچے کھڑے کئے۔

جب نکولائی ماسکو لوٹے تو انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک نئی دنیا میں آ گئے ہیں۔اب انہیں پھر سخت پالے اور سرد ہواؤں کا عادی ہونا پڑا۔گرم آب وہوا میں رہ کر وہ یہ سب تقریباً بھول گئے تھے۔انہیں مشکل سے یقین آتا تھا کہ وہ انگارہ کی جائے تعمیرات پر برفیلی ہواؤں کا مقابلہ کر چکے ہیں۔

خاص طور پر ان کے بچوں کے لئے ماسکو پریوں کی دنیا کی طرح تھا۔جب وہ ماسکو آئے تو غیر معمولی برفباری ہو رہی تھی۔شاید شہر میں یہ تنہا ایسے بچے تھے جو نہ اسکیٹنگ کر سکتے تھے اور نہ اسکی انگ۔سب سے چھوٹی نتاشا نے ابھی تک سمور کا کوٹ، دستانے اور نمدے کے جوتے نہیں دیکھے تھے۔اور جہاں تک برف کا تعلق ہے تو اس نے صرف ریفریجریٹر کے اندر ہی اسے دیکھا تھا۔

اپنے دو بیرونی سفروں کے درمیان انہوں نے تعلیم کے لئے وقت نکال لیا۔چھ مہینے کے بعد انہیں ڈگری مل گئی۔اب وہ فورمین کی حیثیت سے فولادی ڈھانچے کھڑے کرنے کی نگرانی کرتے ہیں۔

طیارے باز کا تجربہ معلوم کرنا آسان ہے۔صرف یہ حساب لگانا ہوتا ہے کہ اس نے کل کتنے گھنٹے پرواز کی۔لیکن بلندی پر کام کرنے والے تعمیری مزدور کے متعلق کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ کتنی

بار جان پر کھیلا۔ ایک بات یقینی ہے___ نکولائی کوروستیلیوف نے کام پر کئی ہزار گھنٹے صرف کیے ہیں، ایسے کام پر جو سخت محنت طلب بھی تھا اور خطرناک بھی۔ اپنی زندگی میں وہ جتنے مستولوں، چمنیوں، ٹاوروں، میناروں، پلوں، گنبدوں، کرینوں، ڈھلانوں، گھنٹہ گھروں، سائبانوں، گیس کے ٹینکوں، چھتوں اور پانی کی ٹنکیوں پر چڑھے ہیں ان کا شمار کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

اگر نکولائی کوروستیلیوف ان تمام تعمیرات کو دیکھنے کا فیصلہ کریں جن میں ان کی محنت بھی شامل ہے تو یہ ایک لامتناہی سفر ہوگا۔

از: یوگینی وورو بیوف

خلانورد کی منزلیں

یہ 12 اپریل 1961ء کی بات ہے۔ ایک نیلے رنگ کی بس سنسان اسٹیپی میدان سے گزر رہی تھی اور اس میں دو غیر معمولی مسافر الگ الگ خاص نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کا لباس بھی غیر معمولی تھا__ موٹے، بہت چست اور ہوا بستہ سوٹ۔ سر پر سفید ایسی خودیں تھیں جنہیں عام طور پر غوطہ خور استعمال کیا کرتے ہیں اور ان پر بڑے بڑے حرفوں میں ''سوویت یونین'' لکھا ہوا تھا۔

دنیا ابھی تک ان کے ناموں سے ناواقف تھی۔ یہ صرف ان کے کنبے والے اور ساتھی کارکن جانتے تھے۔ بس طویل وعریض خلائی اڈے کی جانب جا رہی تھی جو بعد میں کافی مشہور ہو گیا ہے__ بایکانور۔

بس تھوڑی دیر کے بعد ایک دیو پیکر نقرئی راکٹ کے قریب آ کر رک گئی جس کے اردگرد دھات کی جھالروں جیسا پیچیدہ جنگلا تھا۔

جو لفظ ان دونوں افراد کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اسے بھی ہم اس وقت تک نہیں جانتے تھے، یعنی ''خلانورد''۔ ابھی تک انہوں نے یا کسی اور نے بھی خلا میں قدم نہیں رکھا تھا۔ آج کے دن ان میں سے ایک خلا کا کولمبس بننے والا تھا اور انسانیت کے لئے ستاروں سے آگے اور جہانوں کا راستہ کھول رہا تھا۔

دونوں تربیت حاصل کر چکے تھے اور خلا میں جانے کے لئے تیار تھے۔ لیکن ان میں سے صرف ایک ہی خلا میں بھیجا جا رہا تھا۔ سرکاری کمیشن اسے منتخب کر چکا تھا۔ دوسرا شخص ضرورت کے وقت قائم مقام بن سکتا تھا۔

چند ہی گھنٹے بعد تمام کرۂ ارض پر ریڈیو اسٹیشن اپنے حسب معمول پروگرام بدل دیں گے اور تمام دنیا میں تحسین، خوشی اور فخر کی لہر دوڑ جائے گی۔ ماسکو کے ہزاروں باسی فوراً لال چوک میں کھچا کھچ بھر جائیں گے۔ ہمارے سیارے پر صرف ایک نام گونجے گا__ ''یوری گاگارین''۔

یہ انسانیت کے عروج کا لمحہ ہوگا جب 108 منٹ تک دنیا کا پہلا انسان، سوویت نوجوان، پہلا خلانورد یوری گاگارین خلا میں کرۂ ارض کے گرد پرواز کر کے اپنے وطن کی سرزمین پر اترے گا۔

اور دوسرا شخص؟ اس دن ہم ان کا نام نہیں سنیں گے۔ صرف بعد میں جب گاگارین کی پرواز کے سلسلے میں خبریں اور رپورٹیں شائع ہوں گی تو ان کا ذکر کیا جائے گا: پہلی خلائی پرواز کے وقت

خلانورد نمبر 2 نے گاگارین کو خدا حافظ کہا۔ اگر ضرورت پڑتی تو وہ یوری کی جگہ لے سکتے تھے۔

اس ناقابل فراموش دن کے متعلق خلانورد نمبر 2 کہتے ہیں: ''ان لمحوں میں مجھ پر بہت کچھ گزری۔ یوری گاگارین کے ڈسپلن اور قوت ارادی نے مجھے کافی متاثر کیا۔ میں نے راکٹ کے حسن کو حیرت کی نظر سے دیکھا جس نے پہلے زمین کی قوت کشش پر عبور حاصل کیا اور پھر انسان کی پہنچ سے بہت آگے خلا میں جانے لگا۔ غالباً ہم خلانورد جو زمین پر تھے اپنے دوست یوری سے زیادہ تلاطم میں تھے جو بے پناہ رفتار سے زمین کے گرد گھوم رہا تھا اور سخت آزمائش سے گزر رہا تھا۔ یہ تھا ہماری دوستی اور رفاقت کا اظہار۔''

اس ''پُراسرار'' خلانورد نمبر 2 کا نام گیرمن تیتوف ہے۔ انہیں یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ پہلے انسان تھے جو 25 گھنٹے تک خلا میں رہے۔

گاگارین کی پرواز کے چار مہینے بعد، 6 اگست 1961ء کو دنیا نے ایک بار پھر سوویت سائنس اور تکنیک کی داد دی۔ کوسموناوٹ گیرمن تیتوف نے خلائی جہاز ''وستوک__2'' میں دنیا کے گرد سترہ چکر لگائے اور 25 گھنٹوں میں 7 لاکھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا۔

مجھے اس پر فخر ہے کہ جب گیرمن تیتوف کا ماسکو میں خیر مقدم کیا گیا تو ٹیلی وژن پر اس کی رپورتاژ میں نے کی اور ٹیلی وژن کیمرے کے سامنے ان کا انٹرویو لیا۔

گفتگو سے پہلے گیرمن تیتوف جو منکسر اور جاذب نظر انسان ہیں کچھ گھبرائے ہوئے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ انہیں بہت نمایاں نہ دکھایا جائے اور یہ بھی کہ ''میرے تمام مراتب بیان مت کیجیے، بس خلانورد کہیے۔''

میں ان کی ذہنی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔ لیکن بعد میں ٹیلی وژن انٹرویو کے دوران وہ کیمرے کو بالکل بھول گئے، بڑے دلچسپ انداز میں باتیں کرنے لگے اور میرے سوالوں کے جواب بلا تکلف دیے۔ یہی نہیں بلکہ ایک اہم ذاتی راز بھی کھول دیا:

''میں بہت خوش ہوں لیکن میرا ضمیر ایک بات پر ملامت کر رہا ہے۔ جب خلابازی کی تعلیم و تربیت سے پہلے میرا طبی معائنہ کیا گیا تھا تو میں نے ڈاکٹروں کو دھوکہ دیا۔''

''یہ کیسے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''لڑکپن میں ایک بار میں سائیکل سے بری طرح گر پڑا تھا اور میرا بازو ٹوٹ گیا تھا۔ اس کا

اقبال میں کیسے کر لیتا؟ جب مجھے طیارہ باز کے لئے چنا جا رہا تھا تو اس وقت بھی میں نے یہ نہیں بتایا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ قبول نہیں کریں گے۔ آخری بار پھر میں گونگا بنا رہا۔ اب میں یہ دل کھول کر کہنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر آپ کا "نیک نیت" دھوکہ معاف کر دیں گے۔"

تیتوف نے ہنس کر کہا: "مجھے بھی ان کی دریا دلی پر یقین ہے۔"

سچ پوچھئے تو اسی وقت سے میں تیتوف کا گرویدہ ہو گیا اور مجھے یہ معلوم کرنے کا تجسس اور شوق پیدا ہوا کہ یہ شخص کہاں اور کیسے بڑھا پلا؟ اس کا غیر معمولی کردار کس طرح ڈھلا؟ اس کے بعد ہم دونوں کئی بار ایک دوسرے سے ملے۔ اب میں اپنے زمانے کے ایک ہیرو کی داستان سنا سکتا ہوں۔

گیرمن تیتوف سائبیریا میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن التائی میں گزرا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں بلند پہاڑوں کے نیچے زرخیز وادیاں پھیلی ہوئی ہیں، جہاں گھنے جنگلوں کے بعد ایسے وسیع میدان شروع ہو جاتے ہیں جن پر کبھی ہل نہیں چلا۔ جب جاڑے آتے ہیں تو پالے اور برف کی بھرمار رہتی ہے، ہواؤں کے جھکڑ اٹھتے ہیں اور برف کے طوفان سڑکوں اور راستوں کو ڈھانک دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود سائبیریا کی آب و ہوا بڑی صحت افزا ہے اور اس کی خشک اور خنک فضا ہمیشہ صاف اور تازہ رہتی ہے۔ گرمیوں میں ہوا دھوپ سے گرم ہو جاتی ہے اور اس میں گھاس کی مہک اور جنگلوں اور استیپی میدانوں کے پھولوں کی خوشبوئیں بس جاتی ہیں۔ اس بے کراں سائبیریا میں بڑے بڑے دریا خاموشی سے بہتے رہتے ہیں۔ پہاڑوں میں شفاف اور بلور جیسے چشمے قلقل مینا کو بھی مات کرتے ہیں۔ روس کے باہر ایک عام تصور کے برعکس سائبیریا انسان کے لئے فیاض اور دریا دل ہے۔

گیرمن ژوراولیخا گاؤں میں ایک دیہی ٹیچر استیپان تیتوف کے گھر پیدا ہوئے۔ ایک روسی کہاوت ہے: "سیب اپنے درخت کے پاس ہی گرتا ہے۔" تو یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ کس قسم کے درخت سے مستقبل کا خلانورد پھولا پھلا۔

سائبیریا کے لوگ مضبوط اور جفاکش ہوتے ہیں۔ جب روس میں انقلاب نے پیش قدمی کی تو انہوں نے سوویت اقتدار کا دل و جان سے ساتھ دیا۔ ابھی تک لوگوں کو سائبیریا کے چھاپے

ماروں کے بہادر کارنامے یاد ہیں۔انہوں نے جاپانی مداخلت کرنے والوں کے دانت کھٹے کیے، زار کے امیر البحر کولچاک کے خلاف لڑے جس نے اپنے آپ کو سائبیریا کا حاکم مطلق اعلان کر دیا تھا۔وہ انقلاب دشمن روسیوں کی ٹولیوں کے خلاف صف آرا ہوئے اور مقامی مالدار زمینداروں کا قلع قمع کیا جو کسانوں کو زمین نہیں دینا چاہتے تھے۔ژوراولیخا گاؤں نے بھی اس جدوجہد میں حصہ لیا۔یہاں کے غریب کسان خواب دیکھ رہے تھے کہ جدوجہد ختم ہونے کے بعد وہ ایک نئی زندگی شروع کریں گے،الگ الگ نہیں بلکہ اجتماعی طور پر کمیون کی شکل میں۔چنانچہ انہوں نے صنوبر کے جنگل اور سفیدے کے کنج کے درمیان جو زمین تھی اس پر مل کر آباد ہونے کا فیصلہ کیا اور اپنے کمیون کو ''مئی کی صبح'' کا نام دیا۔

خلانورد کے نانا میخائیل نوسوف کمیون قائم ہونے سے پہلے ایک غریب کسان تھے۔وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے سوویت اقتدار کی حمایت کی تھی۔

کمیون کے ممبروں نے جانفشانی سے کام کیا اور اچھی فصل حاصل کی۔پہلی رقم جوان کے ہاتھ میں آئی اسے انہوں نے غریبوں کی زندگی بہتر کرنے کے لئے خرچ کیا۔کل کے پسماندہ اور اَن پڑھ کسان ایک بہتر زندگی شروع کرنے لگے۔اسی لئے انہوں نے سوویت اقتدار کے لئے جدوجہد کی تھی۔

کمیون نے ایک اسکول کھول دیا۔اس وقت خلانورد کے باپ لڑکے تھے۔وہ نہ صرف اس نئی زندگی کے شاہد بلکہ اس کی تعمیر میں حصہ لینے والے بھی بن گئے۔جب کمیون نے کتب خانہ قائم کیا تو اس کی ذمے داری اسکولی طالب علم استیپان تیتوف کو سونپ دی گئی۔لڑکے میں بہت سی صلاحیتیں تھیں۔وہ ڈرائنگ میں مشاق تھا،اسکول کے بینڈ میں وائلن بجاتا تھا اور اسے بڑھئی کے کام میں بھی شد بد تھی۔بعد میں وہ اپنے گاؤں کا پہلا ٹریکٹر چلانے والا اور موٹر ڈرائیور بنا۔اپنا مکان اس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔یہیں خلانورد نے پرورش پائی۔اور گھر کے قریب استیپان تیتوف نے جو باغ لگایا اس کے حسن اور بار آوری کی تعریف لوگ آج بھی کرتے ہیں۔

خلانورد کے باپ اس قسم کے انسان ہیں۔ان تمام کاموں کے ساتھ ساتھ وہ اسکول میں پڑھاتے بھی رہے:اسکول ختم کرنے کے بعد وہ ہیڈ ماسٹر کے معاون بن گئے۔اس طرح ایک ٹیچر کی زندگی شروع ہوئی۔

گیرمن تیتوف آٹھ برس کے تھے جب ان کے باپ نازیوں کے خلاف لڑنے کے لئے فوج میں بھرتی ہوئے۔ یہ 1942ء کا واقعہ ہے۔اس کے بعد وہ اپنی ماں اور چھوٹی بہن زیمفیرا کے ساتھ نانا کے گاؤں مائیسکی آ گئے۔اس وقت کمیون اجتماعی فارم میں بدل گیا تھا۔ان کی ماں وہیں کام کرنے لگیں۔گیرمن اکثر اپنی ماں کے ساتھ کھیت آیا جایا کرتے تھے۔

اس زمانے کے بارے میں خلانورد کہتے ہیں: ''یہ مشکل دن تھے اور ان ہی دنوں میں نے سمجھا کہ مرد ہونے کا کیا مطلب ہے___ ہر رات کو سوتے وقت دکھتے ہوئے ہاتھ اور پیر اور کسکتی ہوئی پیٹھ، دوسرے روز صبح سے پھر کھیت میں کام کرنا لیکن کبھی ریں ریں نہ کرنا۔ جنگ کی وجہ سے مشکلیں بڑھ رہی تھیں۔ جوتے پہنتے پہنتے بالکل پھٹ جاتے تھے لیکن نئے جوتے خریدنا تقریباً ناممکن تھا۔سگریٹ اور تمباکو کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ نانا تمباکو کے لئے ترس گئے تھے۔ چنانچہ احاطے میں ہم نے تھوڑی سی تمباکو بو دی۔ شام کو میں نانا کے لئے تمباکو کی سوکھی پتیاں کاٹا کرتا تھا۔''

1945ء کے موسم بہار میں استیپان تیتوف نے مشرقی پروشیا کی سرحد پر فتح جنگ منائی۔اور خزاں میں وہ اپنے وطن لوٹ آئے۔

اب تیتوف خاندان پھر پولکودنیکووا گاؤں میں اپنے مکان میں رہنے لگا۔

گیرمن اسکول کی فٹ بال ٹیم میں کھیلا کرتے تھے اور سردیوں میں اسکیٹنگ کرتے تھے۔ ان کے اسکول کی ادبی انجمن ہاتھ سے لکھا ہوا ایک رسالہ ''ہماری تخلیق'' شائع کیا کرتی تھی۔ اس کی جلدیں اب بھی محفوظ ہیں۔ان میں گیرمن کی لکھی ہوئی کہانی ''فوجی سراغ رسانی'' شائع ہوئی تھی۔ یہ انہوں نے اپنے باپ کی جنگ کے زمانے کی یادوں کی بنا پر تحریر کی تھی۔ اسی رسالے میں ان کا باتصویر لفظوں کا معمہ بھی شامل ہے جس کا حل یہ ہے: ''طوطے کی طرح کلاس میں شور مت کرو۔''

ایسے کئی رسالے خود گیرمن نے شروع سے آخر تک لکھے تھے۔اور اگر یہ ذہن میں رکھا جائے کہ ایک رسالہ 72 صفحوں اور دوسرا 110 صفحوں پر مشتمل تھا تو یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔

ان کی دلچسپیاں بے شمار تھیں۔ وہ ہر چیز کو جاننا چاہتے تھے اور ہر کام کو کرنے کے لئے بے تاب رہتے تھے۔کبھی وہ تمام شام فلم پروجیکٹر کی کیبن میں بیٹھے رہتے۔اور اس وقت تک وہاں

جاتے رہے جب تک کہ انہوں نے پروجیکٹر خود چلانا نہ سیکھ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے اجتماعی فارم کے ڈرائیور چچا تیشا سے دوستی شروع کر دی۔ وہ انہیں ٹرک کی صفائی کرنے، پیٹرول ڈالنے اور پہیہ بدلنے میں مدد دینے لگے۔ اکثر وہ بلا جھجک پوچھتے: ''یہ کیا ہے؟ یہ کس لئے ہے؟'' اس تیز لڑکے کو دیکھ کر ڈرائیور تیشا مسکراتا اور دریافت کرتا: ''گاڑی کے آس پاس نمدا لے کر گھومنے سے تھکتے تو نہیں ہو؟''

''نہیں چچا تیشا، بالکل نہیں'' گیرمن بڑی سچائی سے جواب دیتے۔ ''بس...''

''بس... میں جانتا ہوں تم کیا چاہتے ہو۔ تم مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو کہ تمہیں گاڑی چلانا کب سکھاؤں گا؟'' ڈرائیور لڑکے کا جملہ کاٹ کر کہتا۔ ''ارے، تم تو لڑکیوں کی طرح شرمانے لگے۔ چلو ٹرک کی اگلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھو۔''

گیرمن نے لڑکپن ہی میں موٹر چلانا بھی سیکھ لیا۔ ان کے اسکول میں ایک چھوٹا سا پرانا بجلی گھر تھا۔ یہ کمیون کے زمانے میں بنایا گیا تھا۔ بچوں کا ایک گروپ اس کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ گیرمن ان کے لیڈر تھے۔

ویسے گیرمن عام لڑکوں جیسے تھے۔ جو چیز انہیں اپنے ہمجولیوں سے ممتاز کرتی تھی وہ ان کی دلچسپیوں کی وسعت تھی۔

ایک شام کو گیرمن گھر پر جرمن زبان کا سبق یاد کر رہے تھے۔ وہ کتاب کے صفحے پر ہاتھ رکھ کر مشق کے الفاظ اونچی آواز سے کہتے اور پھر صفحے سے اپنا ہاتھ ہٹا کر دیکھتے تھے کہ انہیں جرمن لفظ صحیح یاد ہیں یا نہیں۔

ان کے باپ، جو قریب ہی بیٹھے ہوئے اپنے بیٹے کو توجہ سے دیکھ رہے تھے کہ وہ کس طرح سبق یاد کر رہا ہے، بولے: ''گیرمن، کیا خیال ہے تمہارا اگر ہم کوئی چیز ایجاد کریں؟''

''ابا، کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''یہاں دیکھو، استیپان نے کہا اور کاغذ پر ایسا نقشہ بنانے لگے جیسے کسی تعمیر کا خاکہ ہو۔ پھر باپ اور بیٹا سرگوشی سے باتیں کرنے لگے تاکہ متجسس بہن زیمفیرا انہیں نہ سن سکے۔ یہ ایک ''حیرت انگیز'' چیز کی ابتدا تھی۔

سب سے پہلے انہوں نے لکڑی کا ایک بڑا تختہ بنایا۔ تختے پر ڈرائنگ پن لگانے پر گیرمن

نے کئی شامیں صرف کیں۔ پھر انہوں نے اس پر باریک تار مکڑے کے جال کی طرح چپکا دیا۔ اور آخر میں حروف لکھے۔

ایک دن اسکول میں جب بچے جرمن زبان سیکھ رہے تھے تو انہوں نے کلاس میں ایک عجیب وغریب تختہ دیکھا۔ اس پر ایک طرف روسی لفظ لکھے ہوئے تھے اور دوسری طرف جرمن لفظ۔ ساتھ ہی بہت سے ڈرائنگ پن بھی تھے۔ تختے کی ایک جانب بجلی کے دو تار تھے جن کے سرے دھات کے تھے۔

''ارے یہ کیا ہے؟ کس لئے ہے؟'' لڑکوں نے پوچھا۔ اور کلاس میں شور مچنے لگا۔

''تمہیں ہر چیز معلوم ہو جائے گی'' مسکرا کر ٹیچر نے کہا۔ ''اچھا، بتاؤ، گھر پر یاد کرنے کے لئے تمہیں کیا دیا گیا تھا؟'' اب بڑی دلچسپ چیزیں شروع ہوئیں۔ ایک شاگرد بورڈ کے پاس آیا۔ اس نے دونوں تار ہاتھوں میں لئے اور ایک سرا روسی لفظ کے قریب ڈرائنگ پن سے چھوا (ٹیچر کی ہدایت کے مطابق) اور دوسرا خود جرمن لفظ کے نزدیک کرنے والے ڈرائنگ پن سے۔ پہلا لڑکا جو یہ تجربہ کر رہا تھا گھبراہٹ کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے جرمن لفظ ''دخانی جہاز'' نہیں دکھا سکا۔ اسی وقت جب تختے کے مرکز میں چمکتا ہوا ہندسہ (سوویت اسکولوں میں امتحان کے سب سے اچھے نمبر 5 ہوتے ہیں اور سب سے کم 1) نظر آیا تو سب دنگ رہ گئے۔

لڑکے ''واہ، واہ'' چلانے لگے اس لئے کہ خود لڑکے نے یہ نمبر اپنے آپ کو دیا تھا۔

اس تختے کو اسکول کے لڑکے ''تیتوف کی خودکار مشین'' کہنے لگے۔ وہ ایک کلاس سے دوسری کلاس میں گھومنے لگا، یہاں تک کہ ایک مقامی نمائش میں بھی اسے دکھایا گیا۔ وہ اتنا مقبول ہوا کہ پڑوسی گاؤں کے اسکول کے لئے تیتوف کو ایک اور ایسا تختہ بنانا پڑا۔

گرمیوں میں باپ کی پرانی سائیکل گیرمن کے ہتھے چڑھ گئی۔ لیکن انہوں نے اپنی زوردار ٹریننگ راز میں رکھی۔

یہ امتحان کا زمانہ تھا۔ دوستوں نے ان سے قریب کے قصبے سے ریاضی کا نقشہ لانے کو کہا۔ گیرمن فوراً سائیکل پر بیٹھ کر گاؤں کی سڑکوں پر فراٹے بھرنے لگے۔ اچانک ایک مرغی باڑ پر سے اڑی اور سائیکل کے عین سامنے تقریباً پہیے کے نیچے آ گئی اور سائیکل نے بڑی تیزی سے یکا یک دوسری طرف موڑ لیا۔ اب سب قابو سے باہر تھا۔ گیرمن ہینڈل کے اوپر سے اڑے اور زمین پر دھڑ

سے گر گئے۔ جب ہوش وحواس ٹھیک ہوئے تو انہوں نے سائیکل کھڑی کرنا چاہی لیکن درد سے ان کی چیخ نکل گئی۔ بائیں بازو کی آستین احتیاط سے چڑھا کر وہ ہاتھ کو آہستہ چھوتے ہی چیخ اٹھے۔

آخرکار ہینڈل کو صرف دائیں ہاتھ سے پکڑ کر وہ سائیکل پر بیٹھ گئے۔ شدید درد کی وجہ سے وہ چلانا چاہتے تھے لیکن چیخ کو روکنے کے لئے انہوں نے دانت بھینچ لئے۔ اس طرح وہ ہسپتال پہنچے۔

ڈاکٹر نے معائنے کے بعد کہا: ''ہاں، تمہارے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔'' چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دل میں لڑکے کی بڑی عزت ہے اس لئے کہ طویل معائنے کے دوران وہ ایک مرتبہ بھی نہیں چلایا تھا۔

اور جب ڈاکٹر نے ان کا بازو پلاسٹر میں باندھا تب بھی وہ خاموش رہے۔

جب وہ گھر آئے تو اپنے ماں باپ کو تسلی دینے کی کوشش کی:

''کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔ میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

لیکن خود وہ بہت پریشان تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر ہڈی اچھی طرح نہیں جڑی تو بازو آزادی سے نہیں ہل سکے گا اور پہلے کی طرح وہ کھیل کود میں حصہ نہیں لے سکیں گے۔

دو ہفتے گزر گئے۔ ایک دن جب گھر میں کوئی نہیں تھا تو تسلے میں پانی ڈال کر انہوں نے اپنی کہنی اس میں ڈبو دی تاکہ پلاسٹر نرم ہو جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنی سے پلاسٹر الگ ہو گیا۔

گیرمن نے سوچا: ''اب بازو کو ہلانا چاہئے۔ یہ ٹھیک سے نہیں ہل رہا ہے۔ اسے ہلانے میں میں اور زور لگاتا ہوں۔ اف، کتنا درد ہے۔ کوئی بات نہیں۔ ایک مرتبہ اور...''

گیرمن روزانہ سب سے چھپا کر اپنے بائیں بازو کو ہلانے کی مشق کرنے لگے تاکہ وہ آزادی سے حرکت کر سکے۔ اور جب ان کے بازو سے پلاسٹر الگ کر دیا گیا تو ڈاکٹر کی ہدایت کے خلاف وہ زیادہ زور لگا کر بازو ہلانے کی مشق کرنے لگے، یہاں تک کہ کئی بار انہوں نے باسکٹ بال بھی کھیلی۔

جب ہاتھ اچھا ہو گیا تو شاموں میں انہوں نے ایک نیا مشغلہ شروع کیا۔ اپنے باپ کی مدد سے انہوں نے ماسکو کے کریملن کے اسپاسکی مینار کی ہوبہو نقل بنائی۔ اس میں ایک اصلی گھڑی بھی تھی۔ اسکول میں ان کی دلچسپی کے سامان دوسرے تھے۔ وہاں انہوں نے اسکول کے ریڈیو کے لئے پرزے جوڑ کر لاؤڈ اسپیکر بنایا اور طبیعیات کے تجربوں کے واسطے کئی آلات تیار کئے۔

اسکول کی تعلیم ختم ہو رہی تھی۔ خاندان کے لوگ گیرمن تیتوف کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے۔ بات چیت کی ابتدا اکثر باپ ہی کیا کرتے تھے۔ انہیں اپنے بیٹے پر ناز تھا کہ وہ بہت سرگرم اور مستقل مزاج ہے۔ لیکن وہ گیرمن کی ضدی طبیعت سے ذرا پریشان بھی تھے۔ انہیں یہ خیال ستایا کرتا تھا کہ اگر ان کے بیٹے کو اپنی پسند کا کام نہیں ملا تو وہ ہمیشہ کام بدلتا رہے گا اور نتیجہ نقصان دہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے ملائم لہجے میں دوست کی طرح گیرمن کو سمجھایا کہ جو بھی پیشہ وہ اختیار کرے اسے تمام عمر نبھائے۔

''مجھے اپنے باپ سے بڑی محبت ہے'' گیرمن تیتوف اپنی تصنیف ''خلا میں 7 لاکھ کلومیٹر'' میں لکھتے ہیں۔ ''میرے لئے پہلے بھی وہ نمونہ تھے اور اب بھی مشعل راہ ہیں، اس لئے کہ وہ مضبوط قوت ارادی کے حامل، بامقصد انسان ہیں اور معلومات کا خزانہ۔ وہ اپنے ہاتھوں سے ہر چیز بنا سکتے ہیں۔ ان کی تمام عمر علم حاصل کرنے میں گزری ہے۔ میرے باپ نے مجھے اس قسم کے لوگوں کی عزت کرنا سکھایا ہے۔ ان لوگوں نے وطن کے لئے بہت کچھ کیا ہے ___ ملک میں انہوں نے ہی اعلیٰ قسم کی اشتراکی صنعت قائم کی، اجتماعی فارم کھولے اور فاشسٹ جرمنی کو شکست دی۔

ایک دفعہ میں نے اپنے باپ سے پوچھا:

''بتایئے، جب آپ نوجوان تھے تو کہاں سے اتنی توانائی حاصل کرتے تھے؟''

''انہوں نے الماری میں سے لینن کی ایک جلد نکالی اور اسے کھول کر وہ صفحہ دکھایا جہاں یہ الفاظ تحریر تھے:

''علم حاصل کرو، اور علم حاصل کرو، پھر اور علم حاصل کرو۔''

''صدیوں تک کئی نسلیں اس پر عمل کر سکتی ہیں۔ لینن کی ہدایت کے مطابق میں نے بہت کچھ پڑھا ہے اور آئندہ بھی اس پر کافی وقت صرف کروں گا۔''

سوال یہ تھا کہ گیرمن تیتوف کون سا پیشہ اختیار کریں۔ عام طور پر وہ لڑکے جو طیارہ بازی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ذاتی طور پر جانتے ہیں یا ان کے خاندان میں کوئی طیارہ باز ہوتا ہے تو بچپن سے ہی اس پیشے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ گیرمن کے بھی ایک رشتے دار طیارہ باز تھے، ان کے ماموں ساشا۔ وہ گھنٹوں ان کے قصے دلچسپی سے سنتے رہتے تھے، خاص کر جنگ کے زمانے میں طیارہ بازوں کے بہادر کارنامے۔ لیکن ان کا خواب دوسرا تھا۔

''... لڑکپن میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک دن میں طیارہ باز بنوں گا۔ اس وقت تو میری آرزو انجینئر بننے کی تھی۔ میں نئی نئی مشینیں تیار کرنا چاہتا تھا۔ یہ مشینیں کیسی ہوں گی اس کا مجھے بالکل پتہ نہیں تھا۔ مجھے ہر وہ مشین بھلی لگتی تھی جس میں پہیے ہوں، وہ چل سکے اور لوگوں کی محنت آسان کرے۔''

اس علاقے میں سوویت فوج میں بھرتی کرنے کا ایک مرکز تھا۔ اس کا نگراں عرصے سے ٹیچر کے بیٹے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اسے معلوم تھا کہ گیرمن سائنس کے مضامین اچھی طرح جانتا ہے، اسے مشینیں پسند ہیں اور انہیں وہ سمجھتا بھی ہے۔ جسمانی طور پر وہ مضبوط اور ایک باعزم لڑکا ہے۔ جب لڑکا اسکول سے فارغ ہوا تو نگراں نے مشورہ دیا کہ وہ فوجی فضائی کالج میں داخلہ لے۔ اور یہ کہہ کر اس نے داخلے کا فارم بھی دیدیا جو پورے علاقے کے لئے صرف ایک تھا۔ یہ فارم اور فضائی کالج میں داخلے کی تجویز دونوں غیر متوقع باتیں تھیں۔ گیرمن نے سوچا:

''وہاں بھی میں ٹکنیک سے قریب رہوں گا جو جدید بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔''

اس داخلے کے فارم پر سوچ وچار کرنے کے لئے خاندان جمع ہوا۔ باپ نے فوراً ہی ''ہاں'' نہیں کہا۔ وہ دیر تک سوچتے رہے کہ ان کا بیٹا اس کے لئے موزوں ہے یا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا تیز مزاج ایسے پیشے کے لئے مفید نہ ہو۔ شروع میں ماں بھی ڈریں۔ ہوائی جہاز چلانا آسان نہیں ہے۔ اس میں خطرے ہیں۔

گیرمن اس نئے خیال کو پسند کر چکے تھے اور انہوں نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ طیارہ باز بنیں گے۔

اب ان کا مقصد واضح تھا ___ فضائی کالج میں پڑھنا۔ وہ بس ایک ہی خواب دیکھ رہے تھے ___ جتنی جلد ممکن ہو ہوا میں اڑیں۔

کالج کا نصاب آسان نہیں تھا۔ شروع میں انہیں وہ تمام پیچیدہ چیزیں سیکھنا تھیں جو معمولی سپاہی کی تعلیم میں شامل ہوتی ہیں۔

تعلیم کے زمانے میں ایسے لمحے بھی آئے جب گیرمن کا دماغ بالکل الجھ جاتا تھا اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تمام نئی چیزوں کو کیسے سنبھالیں۔ بعض وقت ایسا بھی ہوا کہ وہ سپاہیوں کے دستور العمل پر صحت سے عمل نہیں کر سکے اور فوجی کمانڈر نے انہیں سزا دی۔

شروع میں وہ کبھی تیز مزاجی اور کبھی بے صبری کے شکار رہتے تھے۔ لیکن انہوں نے جلد ہی سمجھ لیا کہ جو چیزیں انہیں سکھائی جا رہی ہیں وہ ان کے لئے قطعی ضروری ہیں اور ان کے کمانڈر اپنے شاگردوں پر بڑی توجہ دیتے ہیں اگرچہ بظاہر وہ سخت گیر ہیں۔

آخر کار روز کی قواعد ختم ہوگئی اور بھاری سامان سے لدے ہوئے مارچ بھی۔ نشانہ بازی کی آزمائش پوری ہوگئی اور فوجی قاعدوں کا امتحان بھی۔

''اب ہم پرواز شروع کریں گے'' ہونے والے طیارہ بازوں نے خوش ہو کر کہا۔

''ابھی تو ہم تمہیں سکھانا شروع کر رہے ہیں'' ٹریننگ کے انچارج نے کہا۔ نوجوانوں نے محسوس کیا کہ ان پر بالٹی بھر ٹھنڈا پانی ڈال دیا گیا ہے۔ ''اب تم ہوائی جہاز کی ساخت اور اس کی تمام تفصیلات کے بارے میں سیکھو گے۔ اس کے علاوہ تمہیں انجن کے مختلف حصوں کو جاننا ہوگا اور انہیں بالکل حفظ یاد کرنا پڑے گا۔ مطلب یہ ہے کہ تم انجنوں کا نظریہ سیکھنے والے ہو...''

چنانچہ نظریاتی سبق شروع ہو گئے۔ مستقبل کے پائلٹ اب یہ سیکھ رہے تھے کہ نقشے پر اپنی پرواز کا راستہ کیسے تلاش کیا جاتا ہے، اور یہ کس طرح معلوم کرتے ہیں کہ ہوا کب طیارہ باز کے لئے مفید ہوتی ہے اور کب مضر۔ وہ ریڈیو رسل و رسائل اور فضا میں نشانہ بازی کے اصولوں کی بھی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

صبر کی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد وہ دن بھی آ گیا جس کا نوجوان عرصے سے خواب دیکھ رہے تھے: پرواز کرنا۔

ٹریننگ کے لئے جو ہوائی جہاز ''یاک__18'' استعمال کیا جاتا ہے اس میں آگے پیچھے دو نشستیں ہوتی ہیں اور کنٹرول کے لئے صرف دو پہیے۔ اگلی نشست پر معلم جہاز چلا رہے تھے اور گیرمن دوسری سیٹ پر بیٹھے ہوئے اپنے پہیے پر ہاتھ رکھے تھے جو خود بخود معلم کی نقل کر رہا تھا۔ وہ جہاز کی مسلسل اور پُراسرار نقل و حرکت کو سمجھنا چاہتے تھے۔ پیڈل پر بھی ان کے پیر اپنے معلم کی جنبش دھرا رہے تھے۔

''کچھ پلے نہیں پڑا'' اپنی پہلی پرواز کے بعد گیرمن نے دوستوں کے سامنے اعتراف کیا۔ ''کیا میں بالکل الو کا پٹھا ہوں؟''

''ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا'' ساتھیوں نے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ''یہ ہر ایک کے

ساتھ ہوتا ہے۔"

کئی پروازوں کے بعد گیرمن کے ہاتھ محسوس کرنے لگے کہ جہاز کی نقل وحرکت کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ چنانچہ معلم نے انہیں ایک سطح پر ہوائی جہاز اڑانے کی اجازت دیدی۔ اوخدا، یہ کیا ہو رہا ہے؟ جہاز یکا یک نیچے چلا جاتا ہے اور یکا یک اوپر اٹھتا ہے۔ وہ سیدھا اڑنے کے بعد چکر لگانا چاہتا ہے!

پروازیں جاری رہیں۔ معلم اور شاگرد نے پہیے تبدیل کر لئے۔ اب معلم پچھلی نشست پر بیٹھنے لگے اور گیرمن کے کام میں کم سے کم مداخلت کرنے لگے۔

پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جسے پائلٹ تمام عمر یاد رکھتے ہیں ___ پہلی تنہا پرواز۔ اسے نئے طیارہ باز کی پیدائش کا دن کہا جاتا ہے۔

معلم گونیشیف تیتوف سے زیادہ خوش نہیں تھے۔ ان کے شاگرد جہاز کو یکسانی سے نہیں چلاتے تھے۔ وہ پرواز کے نئے نئے طریقے آزمانے کی کوشش کرتے جو اکثر کامیاب نہیں ہوتے تھے۔ اس سے گیرمن کا دل ٹوٹ جاتا تھا اور وہ سوچنے لگتے تھے کہ وہ کبھی طیارہ باز نہیں بن سکتے، ان میں جہاز پر قابو پانے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ایسے بھی لمحے آئے جب انہوں نے طیارہ بازی کو الوداع کہہ کر گھر لوٹنا چاہا۔ گونیشیف گیرمن کی ہمت بڑھاتے رہے لیکن اپنے شبہات کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ دراصل وہ اپنے پُراسرار شاگرد کا کردار اور اس کی قابلیت سمجھنا چاہتے تھے۔ اور جب وہ گیرمن کو اچھی طرح سمجھنے لگے تو پھر انہوں نے شاگرد کے ساتھ اپنے رویے میں بڑی احتیاط برتنا شروع کردی۔ انہوں نے کوشش کی کہ گیرمن کا اپنی صلاحیت پر اعتماد بڑھے۔

ایک مرتبہ گیرمن جہاز میں بیٹھے ہوئے اپنے معلم کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ آئیں اور اپنی نشست پر بیٹھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گونیشیف کو کوئی جلدی نہیں۔ گیرمن اس کا سبب نہیں سمجھ سکے۔ معلم نے ایک بار اور جہاز کا چکر لگایا اور اندر آنے کے بجائے وہ بازو پر چڑھ گئے اور گیرمن کے اوپر جھک کر کہا:

''تیتوف، اب تم تنہا پرواز کرو، چکر لگاتے ہوئے۔'' معلم گیرمن سے بیٹے کی طرح بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ ''سب کام اطمینان سے کرو جیسے کہ میں ساتھ بیٹھا ہوا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اسے انجام دو گے۔''

''جی ہاں، رفیق معلم میں انجام دینے کی کوشش کروں گا'' گیرمن نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''شروع کرو۔''

''ہوائی جہاز کے پنکھے سے دور رہے'' گیرمن چلائے اور انجن چلانا شروع کر دیا۔ ان کی بائیں ہتھیلی میں سمت متعین کرنے والے دستے کی پیلی گیند تھی، سیدھا ہاتھ پہیے کو پکڑے ہوئے تھا اور پیر پیڈل پر جمے تھے۔

''روانہ ہونے کی اجازت ہے؟''

''ہاں، جاؤ!''

جہاز حرکت میں آیا اور ذرا لرزتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ معلم بھی جہاز کے ساتھ ساتھ اس کا بازو پکڑے ہوئے چلنے لگے۔

دونوں کشاکش کی حالت میں تھے لیکن ایک دوسرے سے چھپا رہے تھے۔ گیرمن کی گھبراہٹ صرف اپنے لئے تھی۔ معلم اس لئے پریشان تھے کہ ان پر نہ صرف شاگرد کی جان بلکہ اس کے مستقبل کی بھی دوہری ذمے داری عائد ہوتی تھی۔ پہلی پرواز کی ناکامی ان کی تمام کوششوں اور گیرمن پر صرف کی ہوئی محنت پر پانی پھیر سکتی تھی۔ پھر گونیشیف نے اپنے آپ سے کہا: ''نہیں، میں نے غلطی نہیں کی۔ گیرمن تیتوف تیار ہے، وہ اپنے اعصاب پر قابو پا رہا ہے۔''

گیرمن نے جب آخری بار اپنے معلم کو دیکھا تو ان کے چہرے پر ہمت بڑھانے والی مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ زمین سے اوپر اٹھنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ سگنل دینے والے نے لال جھنڈی لہرا دی ___ یعنی ''اجازت ہے۔''

گیرمن آہستہ آہستہ رفتار بڑھاتے گئے۔ ہوائی جہاز تیز سے تیز تر چلنے لگا۔ پھر انہوں نے گیر بدلا۔ جہاز کی چونچ اوپر کو اٹھی اور پہیے زمین سے اوپر اٹھنے لگے۔ غیر شعوری طور پر گیرمن نے ٹھیک لمحے آہستگی سے گیر (gear) کو واپس کر لیا۔ اب جہاز ہوا میں اڑ رہا تھا۔ اس کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ سبز ہوائی اڈہ جہاز کے بازوؤں کے نیچے الٹا دوڑنے لگا۔ گیرمن نے جلد بورڈ پر نظر ڈالی۔ سوئی 100 کلومیٹر دکھا رہی تھی۔ ہوائی جہاز اونچا ہوتا جا رہا تھا... زمین نیچے تیر رہی تھی... گیرمن نے جہاز کو ایک طرف جھکا دیا۔ جہاز مڑنے لگا۔

اب پھر جہاز بالکل سیدھا پرواز کر رہا تھا۔

''اڑ رہا ہوں! اڑ رہا ہوں! اڑ رہا ہوں!'' گیرمن کا پورا وجود چیخ رہا تھا۔ انہوں نے زمین پر نگاہ ڈالی۔ وہاں چار بینچیں مربع کی شکل بنائے ہوئے تھیں اور ان پر دوست اور معلم بیٹھے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک کی نظر ان کے ہوائی جہاز پر جمی ہوئی تھی۔ اس وقت کوئی جلدی جلدی دیواری اخبار تیار کر رہا ہوگا۔ اس پر مبارکبادیں لکھی ہوں گی۔ فضائی کالج کی یہ ایک روایت ہے۔

سب سے زیادہ خوش نصیب انسان زمین کے اوپر اڑ رہا تھا ــــ فضا کا فاتح، گیرمن تیتوف... ہاں، وہ طیارہ باز بن چکا تھا۔

لیکن ابھی بہت کچھ سیکھنا باقی تھا۔ تیز رفتار ''یاک ــــ 11'' پر، پھر لڑاکو جیٹ ہوائی جہاز ''میگ'' (M.I.G.) پر پروازیں۔ تیتوف نے یہ بھی سیکھ لیا۔ اب وہ طیارہ بازی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔

... لینن گراد کے نواح کے اوپر نیلگوں بلندیوں میں روپہلے تیر کی طرح ایک جہاز چمکا اور غائب ہو گیا۔ اس کے پیچھے زبردست شور سنائی دیا جیسے کوئی غیر مرئی اور غضبناک چیز فولادی پرندے کا تعاقب کر رہی ہو۔

یہ جیٹ انجن کی آواز تھی جو جیٹ ہوائی جہاز کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ جہاز آواز کی رفتار سے بھی زیادہ تیز اڑ رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ پہلے جہاز نظر آتا تھا اور پھر اس کی آواز سنائی دیتی تھی۔

اب نوجوان آزمائشی پائلٹ لیفٹیننٹ تیتوف ایسے ہی جہازوں پر پرواز کیا کرتے تھے۔ اور انہیں وہ خوبصورتی سے اڑاتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سوویت اسپوتنکوں نے خلا میں داخل ہو کر کرۂ ارض کے اردگرد چکر لگانا شروع کر دیا تھا۔ اور ہزاروں لوگ راکٹ میں اڑنے کا عجیب و غریب لیکن جری خواب دیکھ رہے تھے۔

گیرمن تیتوف بھی ان میں سے ایک تھے۔ لیکن انہیں شائبہ تک نہ تھا کہ وہ ان چند لوگوں میں ہوں گے جنہیں مادر وطن پہلے خلائی جہازوں میں سفر کرنے کا فریضہ سپرد کرے گی۔

''میرا خواب پورا ہو گیا'' تیتوف لکھتے ہیں۔ ''میری صحت اور قابلیت کام آئی۔ تمام انتخابی کمیشنوں نے مجھے منظور کر لیا۔ اب میں خلانوردوں کے گروپ کا ایک رکن تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا

کہ میں ایک نئی زندگی شروع کررہا ہوں۔"

جی ہاں، پھر انہیں ایک نئے کام کی ابتدا کرنا تھی۔ گیرمن ماسکو کے قریب خلانوردوں کی بستی "ستاروں کے شہر" میں رہنے لگے۔ یہاں وہ اپنے نئے ساتھیوں اور معلموں سے ملے۔

انہیں بالکل معلوم نہیں تھا کہ ان کے ایک کمانڈر وہ شخص ہوں گے جو سب سے پہلے سوویت یونین کے ہیرو کا خطاب پانے والے لوگوں میں تھے۔ انہوں نے 1934ء میں تباہ شدہ برف توڑ جہاز "چلیوسکن" کی مشہور امدادی مہم میں حصہ لیا تھا۔ تیتوف پڑھ چکے تھے کہ کس طرح بہادر طیارہ بازوں نے چھوٹے ہوائی جہاز جو اس کام کے لئے موزوں نہیں تھے ان کو بچے کھچے لوگوں کا کیمپ تلاش کرکے بحر شمال کی برف پر اتارا اور لوگوں کو نہ صرف جہازوں کے اندر بٹھایا بلکہ لکڑی کے بکسوں میں بٹھا کر انہیں جہاز کے بازوؤں پر بھی لٹکا دیا تاکہ کوئی آدمی چھوٹ نہ جائے۔

اس طرح قطبی مہم کے تمام لوگ بچا لئے گئے جن میں مہم کے سربراہ، عالمی شہرت کے مالک اکادمیشن اوٹو شمیدت بھی شامل تھے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب ایسے عظیم اور بے مثال طیارہ بازوں کے لئے سوویت یونین کے ہیرو کا اعزاز قائم کیا گیا تھا۔ اس اعزاز کو پانے والوں میں نوجوان ہوا باز نکولائی کامانین بھی تھے۔ کامانین جو اب جنرل ہیں خلانوردوں کی ٹریننگ کے نگراں ہیں۔

"ستاروں کے شہر" میں تقریباً سب ہی نوجوان زندہ دل اور ہنس مکھ لوگ تھے۔ جلد ہی ان کی آپس میں دوستی ہوگئی۔ وہ اس طرح رہنے لگے جیسے ایک خاندان کے فرد ہوں اور آپس میں سگے بھائی۔ گیرمن کے سب سے گہرے دوست بے حد دلچسپ، نیک دل اور صحت مند نوجوان یوری گاگارین تھے۔

اب پھر سخت ٹریننگ اور مسلسل پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ گیرمن کو چیف ڈیزائن ساز، اکادمیشن کورولیف سے اپنی پہلی ملاقات ہمیشہ یاد رہے گی۔

اسی دن انہوں نے پہلی مرتبہ خلائی جہاز "وستوک" دیکھا۔

خلانوردوں نے خلائی جہاز کی کیبن میں گھنٹوں بیٹھنا شروع کردیا۔ وہ اس کی تمام تفصیلات کا خوب مشاہدہ کرتے تھے اور ہونے والی پرواز کی زمین پر مشق۔

ایک تیتوف کیبن میں اپنے ساتھیوں سے زیادہ دیر تک بیٹھے رہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ

خلائی جہاز میں کنٹرول بورڈ پائلٹوں کے لئے کافی آرام دہ نہیں ہے۔ شام کو گھر لوٹنے کے بعد وہ پھر اس کے بارے میں سوچتے رہے۔ اس کے حل کی انہوں نے کئی اسکیمیں سوچیں۔ آخر کار انہوں نے اپنی رائے اکادمیشن کورولیف کو بتانے کا فیصلہ کیا۔

چیف ڈیزائن ساز نے نوجوان پائلٹ کو توجہ سے سنا، ان کے خاکے کو غور سے دیکھا اور پھر اپنے مددگاروں سے کہا:

''تیتوف ٹھیک کہتے ہیں۔ کچھ تبدیلیاں ضروری ہیں۔''

بچپن میں تکنیک سے گیرمن تیتوف کی دلچسپی کا آخر کچھ نتیجہ نکلنا ضروری تھا۔

خاص تکنیکی کونسل نے جو خلائی جہازوں کے ڈیزائن، ان کی ساخت اور پیچیدہ الیکٹرونک آلات کا بڑی صحت سے مطالعہ کرتی ہے اور انہیں جانچتی ہے گیرمن تیتوف کو اپنے کام میں شریک ہونے کی دعوت دی۔

خلانوردوں کی ٹریننگ زیادہ پیچیدہ اور مشکل ہوتی گئی۔ خاص کر مرکز گریز چکر پر جسے وہ ''شیطان کی چرخی'' کہتے تھے آخر تک گھومنا تقریباً ناقابل برداشت تھا۔

دھات کے ایک لمبے شہتیر پر ڈبے کی طرح ایک کیبن تھی... اس میں نرم اور ڈھلواں کرسی پر خلانورد نیم دراز ہو جاتا تھا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد جب انجن چالو کیا جاتا تو کیبن پاگلوں کی طرح گردش کرنے لگتی تھی۔

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کرسی پر بیٹھے ہوئے خلانورد کو کوئی ناقابل بیان قوت دبا رہی ہو۔ اس حالت میں ہاتھ پیر ہلانا ناممکن تھا۔ سر ایسا ہو جاتا تھا جیسے اس کے اندر پگھلا ہوا سیسہ بھرا جا رہا ہو... ایسی غیر معمولی قوت کشش برداشت کرنا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن مستقبل کے خلانوردوں کو قیامت کے یہ تجربے سہنا پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں روشنی کے کمان دینے والے سگنلوں پر نظر رکھنا پڑتی ہے اور کمان کو پورا کرنا ہوتا ہے۔

اس طرح کی قوت کشش راکٹ کی پرواز شروع ہونے کے وقت محسوس ہوتی ہے جب دو کروڑ گھوڑوں کی طاقت والے انجن خلائی جہاز کو زمین سے اوپر اٹھا کر دور ستاروں کی طرف لے جاتے ہیں۔

ٹریننگ کے دوران ایک اور کٹھن چیز تھی، پہلی سے بھی زیادہ سخت۔ یہ تھی رو ٹر کی مشق۔ اس

کے اندر کیبن اس طرح نصب ہوتی ہے کہ ایک ساتھ تین دھریوں پر چکر لگایا جاسکتا ہے۔ گیرمن اس کی ناقابل تصور گردشوں کو بھی سہہ گئے۔

تیتوف دھات کی ایک بڑی گول میز کے کنارے پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ میز کے پایوں کی جگہ پیچیدہ لیور تھے۔ ڈاکٹر جو تمام آزمائشوں اور مشقوں میں خلانورد پر نظر رکھتے تھے انجن چالو کر دیتے تھے۔ میز جہاز کے ڈیک کی طرح ڈگمگانے لگتی تھی۔ گیرمن کا جگہ سے ہٹے بغیر توازن قائم رہتا تھا۔ لرزش اتنی زیادہ تیز ہو جاتی تھی جیسے کہ ڈیک کے نیچے کوئی زبردست طوفان آ گیا ہو۔ لیکن تیتوف کسی جادو کی طاقت سے توازن نہیں کھوتے تھے۔ وہ اس طرح کھڑے رہتے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

جب راکٹ کے انجن چالو کیے جاتے ہیں تو اس کا جسم کچھ دیر تک شدت سے تھرتھراتا ہے۔ ٹریننگ کے زمانے میں خلانوردوں کو ایک خاص پلیٹ فارم (vibrostanol) پر اس کی بھی مشق کرنا پڑتی ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح تھرتھراتا ہے اور آدمی کو ناخوشگوار کپکپاہٹ سے جھنجھوڑ ڈالتا ہے۔ گیرمن نے یہاں بھی ہار نہیں مانی۔ دوسری بار یہاں وہ اپنے ساتھ کتاب لائے۔ پہلے چند منٹ تک حروف آنکھوں کے سامنے اچھلتے رہے اور لہروں کی طرح اوپر نیچے ہوتے رہے۔ لیکن پھر تیتوف اپنے پسندیدہ شاعر پوشکن کی نظمیں آسانی سے پڑھنے لگے۔

تربیت کے وقت صرف ایک چیز میں لطف آتا تھا۔ یہ تھا لچکیلے ربر کا بنا ہوا چوڑا جال۔ اس پر اچھلا جاتا تھا۔ اس پر ذرا زور سے کودیے اور آپ ہوا میں اتنے اونچے چلے جائیں گے کہ سرکس والوں کی طرح قلابازیاں کھا سکتے ہیں۔

ٹریننگ کے پروگرام میں چھتری بازی کا اسپورٹ بھی شامل تھا۔ تیتوف پہلے عام ہوائی جہازوں سے کودے ___ کبھی کھیت پر تو کبھی پانی میں۔ پھر انہیں جیٹ ہوائی جہاز سے جست لگانا پڑی۔ اس میں خلانورد کیبن کے باہر سیٹ کے ساتھ بڑی تیزی سے چھوڑا جاتا ہے۔

بے وزنی کی حالت والے چیمبر میں پرواز بڑی پُر مذاق ہوتی ہے۔ حالانکہ یہاں بھی کش مکش کم نہیں۔ خلانورد ہوا میں تیرتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ پیروں پر کھڑے ہوں لیکن اپنے آپ کو سر کے بل کھڑا پاتے ہیں۔ یہاں مشق کی اور اپنے بدن کو قابو میں رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ایسی حالت میں بھی آدمی کام کر سکے۔

آخری چیز تنہائی برداشت کرنے کا تجربہ تھا جو شاید سب سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ بھی تھا۔ دراصل یہ خلائی پرواز کا ریہرسل کہا جا سکتا ہے۔

''خدا حافظ'' تجربے کے نگراں ڈاکٹر نے کہا۔''واپسی پر ملاقات ہوگی۔''

خلانورد بے آواز چیمبر میں داخل ہوئے اور اس کا بھاری فولادی دروازہ بند کر دیا گیا۔ اندر کیبن میں کرسی تھی، اس کے سامنے کنٹرول بورڈ۔ قریب ہی کھانے پینے کی چیزیں اور ڈائری تھی۔ یہیں ٹیلی ویژن کیمرہ کی آنکھ بھی تھی۔ جو خلانورد کی دیکھ بھال کرنے میں ڈاکٹروں کی مدد کرتی ہے۔ چیمبر میں بالکل سکوت کا عالم تھا، یہاں تک کہ خاص گھڑی کی ٹک ٹک بھی سنائی دیتی تھی۔

تیتوف تنہا تھے۔''پرواز'' شروع ہونے والی تھی لیکن کسی منزل کے لئے نہیں۔ یہ بہت طویل ہوگی، شاید کئی دنوں کے لئے۔

یہاں تیتوف کی زندگی اصل پرواز کی زندگی کی طرح تھی ــــ مقررہ پروگرام کو ٹھیک ٹائم ٹیبل کے مطابق پورا کرنا، ڈائری میں اندراج کرنا، خاص خلائی غذا کھانا اور مقررہ وقت پر سو جانا۔

چیمبر میں کوئی بھی آواز داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ یہاں عجیب سی افسردہ خاموشی چھائی رہتی تھی۔ گیرمن پابندی کے ساتھ ''زمین'' کو آلات کا مطالعہ بتاتے تھے اور اپنی صحت کے بارے میں اطلاعات دیتے تھے۔ باہر لوگ گیرمن کو دیکھتے تھے، انہیں سنتے تھے لیکن جواب نہیں دیتے تھے... سخت صبر آزما کام تھا۔

اس ''پرواز'' کے وقت تیتوف اپنے پسندیدہ شاعر پوشکن کا مجموعہ ساتھ لے گئے تھے۔ خالی وقت میں وہ پڑھتے تھے، گاتے تھے یا تصویریں بناتے تھے۔

''پرواز'' ختم ہوگئی۔ بے آواز چیمبر سے گیرمن تیتوف باہر نکلے۔ ان کی گھونگھریالی سنہری ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی، وہ تھکے ہوئے نظر آتے تھے لیکن ہمیشہ کی طرح پُرسکون۔ صرف ان کے پیر ذرا لڑکھڑائے ــــ اس آدمی کی طرح جو کئی دن تک بستر پر لیٹا رہا ہو...

پھر ایسا وقت بھی آیا جب گیرمن یوری گاگارین کے ساتھ ایک کمرے میں سوئے تاکہ دونوں میں سے کوئی ایک صبح کو ستاروں تک پہنچنے کا پہلا راستہ ہموار کرے...

یوری گاگارین اپنے دوست کے متعلق لکھتے ہیں:''خلانورد نمبر 2 کو بھی میری طرح ٹریننگ دی گئی تھی۔ شاید وہ مجھ سے زیادہ لائق تھے۔ غالباً انہیں پہلی پرواز کے لئے اس لئے نہیں

چنا گیا کہ وہ دوسری پرواز کے لئے محفوظ رہیں جو زیادہ پیچیدہ تھی۔"

اس وقت قائم مقام خلانورد کا نام کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ کسی کو بھی یہ نہیں معلوم تھا کہ پہلی پرواز کی تیاری اور خلائی جہاز کا ڈیزائن بہتر کرنے کے سلسلے میں گیرمن تیتوف کو ملک کا سب سے بڑا اعزاز آرڈر آف لینن مل چکا ہے۔

6 اگست کو نیلے رنگ کی بس پھر خلائی اڈے کی جانب جارہی تھی۔ اس بار اس میں خلانورد نمبر 2 اور خلانورد نمبر 3 بیٹھے ہوئے تھے۔

ہر چیز اسی ترتیب سے ہوئی جیسی کہ گاگارین کی پرواز کے وقت ہوئی تھی۔ تیتوف نے دوستوں اور ساتھیوں کو الوداع کہا، انہیں گلے لگایا۔ پھر وہ لفٹ پر چڑھ کر راکٹ کے اوپر خلائی جہاز میں داخل ہوئے اور کیبن کے اندر مقررہ جگہ پر بیٹھ گئے۔

"کیبن گھر کے کمرہ کی طرح آرام دہ تھی" تیتوف نے بعد میں لکھا۔ "پائلٹ کی کرسی ایسی کوچ کی طرح تھی جس پر میں بیٹھ سکتا تھا، لیٹ سکتا تھا اور کام بھی کر سکتا تھا۔ ہر چیز نزدیک ہی رکھی ہوئی تھی۔ ہر بٹن اور لیور کو آسانی سے دبایا جا سکتا تھا... روانگی کے لئے دس منٹ کی تیاری کا اعلان ہوا۔ سرکاری کمیشن کے صدر نے میری طبیعت پوچھی۔"

"میں بالکل چاق چوبند ہوں۔" اگلے چند منٹوں میں جو ہونے والا تھا بے تابی سے اس کا انتظار کرتے ہوئے میں نے جواب دیا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔

ٹھیک نو بجے کمان دی گئی:

"روانہ ہو!"

ایک انجانی خوشی کے جذبے سے بے قابو ہو کر میں نے کہا:

"جی ہاں، روانہ ہو رہا ہوں..."

خلائی اڈے میں زبردست گھڑگھڑاہٹ سنائی دی۔ راکٹ کی دم سے ایک طوفانی شعلہ نکلا اور فولادی سگار آہستہ زمین سے اوپر اٹھنے لگا۔ پھر پل بھر کے لئے اس کی رفتار رک سی گئی گویا گیس کا فوارہ اپنی ہتھیلی پر راکٹ کا وزن تول رہا ہو۔ دوسرے ہی پل میں راکٹ فضا میں داخل ہونے لگا۔

خوشی کے مارے تیتوف چلائے: "چل پڑے، میرے پیارے!" ان کی پُرمسرت آواز لاؤڈ اسپیکر پر سن کر زمین پر بھی لوگ خوشی سے مسکرا دیئے۔

پہلے لمحوں میں گیرمن بالکل ساکت بیٹھے رہے۔ وہ تمام باتوں کو اپنے ذہن میں نقش کر لینا چاہتے تھے __ خلائی جہاز کی بے پناہ رفتار، پیچھے بھاگتے ہوئے کھیت، شہر اور روشندان سے دکھائی دینے والے چمکیلے بادل...

ٹیلی وژن پر صاف نظر آ رہا تھا کہ خلانورد مضبوطی سے کرسی پر جم کر بیٹھے ہیں۔

''تیتوف کی نبض تیز ہو رہی ہے: 118...134 بار فی منٹ'' ڈاکٹر نے سرکاری کمیشن کے صدر کو رپورٹ دی۔

''سمجھ گیا۔ مدار میں داخل ہوتے وقت یہی سب سے مشکل حصہ ہے، سب سے زیادہ دباؤ کا وقت'' صدر نے کہا۔

''میں زمین کے اوپر جا رہا ہوں، اپنے وطن کے اوپر'' تیتوف کی پُرسکون آواز پھر سنائی دی۔ دھوپ میں نہائے ہوئے، مصور کی رنگ برنگی نرالی تختی کی طرح ہمارے کرۂ ارض کے ناقابل تصور نظارے کو اس سے پہلے دنیا میں ایک ہی انسان نے دیکھا تھا۔

... خلائی جہاز مدار میں داخل ہو گیا۔ انجن خاموش ہو گئے۔ راکٹ کا آخری حصہ الگ ہو گیا۔ تیتوف بے وزنی کی حالت محسوس کرنے لگے اور اس لمحے کو نوٹ کرنے کے لئے تیار ہوئے... یکایک ان کی آنکھوں کے سامنے ہر چیز چکرانے لگی۔ ایسا لگا کہ کسی انجانی قوت نے خلانورد کو الٹ دیا ہے... تیتوف نے بڑی قوت ارادی سے اپنا سر گھمایا۔ اب پھر ہر چیز حسب معمول تھی۔ پہلی کی طرح اب بھی وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے کنٹرول بورڈ تھا... نہیں، ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پہلے کی طرح بیٹھے نہیں ہیں بلکہ کرسی کے اوپر تیر رہے ہیں!

''عقاب! عقاب!'' تیتوف نے اپنا خلائی نام سنا۔ ''آپ مدار پر ٹھیک پہنچ گئے ہیں'' زمین سے پیغام ملا۔

خلائی جہاز کرۂ ارض کا اسپوتنیک بن گیا۔ ان بلندیوں میں نہ بارش ہے نہ برف اور نہ بجلی کی کڑک۔ یہاں خلا کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

کچھ ہی دیر بعد خلائی جہاز زمین کے سایے میں تیرنے لگا۔ تیتوف نے لیمپ جلایا۔ غیر محدود سیاہ اندھیرے کے پس منظر میں ستاروں کی ٹھنڈی ٹمٹماہٹ نظر آنے لگی۔

پرواز کو ایک گھنٹہ گزر گیا اور اسی ایک گھنٹے میں خلاباز نے زمین کے گرد پورا ایک چکر لگایا جو

ان کے خیال میں بس ایک پل کے برابر تھا۔

''عقاب! عقاب! میں طلوع بول رہا ہوں'' تیتوف نے زمین کی آواز سنی۔ ''تم دستی کنٹرول استعمال کر سکتے ہو۔''

''میں عقاب ہوں۔ سمجھ گیا'' تیتوف نے گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

''دنیا کے کسی انسان نے ابھی تک خلائی جہاز کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں چلایا ہے۔ کیا میں اس طرح جہاز کو چلا سکوں گا؟'' تیتوف نے سوچا اور عزم کے ساتھ اپنا ہاتھ کنٹرول بورڈ پر رکھ دیا۔

جہاز نے سبک روی سے اپنی پوزیشن بدلی۔ حساس آلات نے فوراً اس تبدیلی کو نوٹ کر لیا۔ تیتوف نے اسی قسم کی مسرت محسوس کی جیسی انہوں نے فوجی پائلٹ کی ٹریننگ کے زمانے میں پہلی تنہا پرواز کے وقت کی تھی۔ دستی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے وہ اپنے آپ کو خلائی جہاز کا اصلی ناخدا سمجھ رہے تھے۔

ان کے عزیز ترین دوست یوری گاگارین اس وقت کناڈا میں تھے۔ وہاں سے انہوں نے خلائی جہاز کو یہ تار بھیجا: ''پیارے گیرمن، میرا دل تمہارے ساتھ ہے۔ پیارے دوست، میں تمہیں گلے لگاتا ہوں اور پیار کرتا ہوں۔ میں بڑی بے چینی سے تمہاری پرواز کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری پرواز کامیاب رہے گی، اور ایک بار پھر ہمارے عظیم وطن اور سوویت عوام کی شہرت بڑھائے گی۔ ہم جلد ملیں گے۔''

گیرمن نے فوراً شکریے کا جوابی تار بھیجا۔

تیتوف نے جب ریڈیو کھولا تو خوشی اور حجاب کے ساتھ سنا کہ ساری دنیا میں ان کا چرچا ہو رہا ہے۔

خلائی جہاز زمین کے گرد ایک کے بعد دوسرا چکر لگاتا رہا۔

افق پر چمکتی ہوئی نارنجی رنگ کی ایک پٹی سی جھلک اٹھی۔ اس کے اوپر دوسرے رنگ کی پٹی۔ قوس قزح کے تمام رنگوں کی پٹیاں وہاں تھیں... زمین کے چاروں طرف نیلگوں ہالہ تھا۔ اور دور نیچے پہاڑوں کی چوٹیاں، باریک فیتوں کی طرح دریا، جنگل، ریگستان، کھیت اور تیرتے ہوئے بادل دکھائی دے رہے تھے... پریوں کی کہانی کا ایک منظر تھا!

خلانورد نے ہوا میں تیرتا ہوا فلمی کیمرہ اپنی طرف بڑھایا۔ اب وہ بالکل روشن دان کے

سامنے تھا۔ دنیا میں پہلی مرتبہ خلائی کیمرہ مین نے ہمارے سیارے کی متحرک فلمیں لیں۔

جہاز مدار پر 28 ہزار کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے اڑتا رہا۔ ہر چکر میں دن اور رات دونوں آتے تھے۔ تیتوف بڑی لگن سے کام میں مصروف رہے: اپنے مشاہدے ڈائری میں لکھے، ریڈیو کے ذریعہ پرواز کے متعلق رپورٹیں بھیجیں اور مقررہ وقت پر ورزش بھی کی۔

دوپہر کے کھانے کا وقت آ گیا۔ ''کھانا'' ٹیوبوں کے اندر تھا۔ انہیں منہ میں لے کر تیتوف نے سوپ پیا، پسی ہوئی کلیجی کھائی اور آخر میں پھلوں کا رس نوش کیا۔ اتفاق سے رس کی ایک بوند منہ سے پھسل گئی اور فضا میں تیرنے لگی۔ تیتوف نے ہوشیاری سے اسے ٹیوب کے ڈھکن میں لیا اور ہنستے ہوئے منہ میں ڈال لیا۔ یہ بڑا ہی دلچسپ منظر تھا!

اگر ٹائم ٹیبل پر سختی سے عمل کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تو شاید تیتوف روشن دان سے اپنی نظر کبھی نہیں ہٹاتے۔ اس شاندار بلندی سے انہیں کیا کیا نظر نہیں آ رہا تھا__ بحیرے اور بحر، پورے کے پورے براعظم: جنگلوں کے ہرے دھبوں والا پیلا افریقہ، طویل پہاڑی چوٹیوں کے سلسلے سے دو حصوں میں بٹا ہوا شمالی امریکہ، بڑے شہروں کے سنہرے قمقموں سے جھلملاتا ہوا یورپ...

نیچے زمین پر لوگ بے تابی سے خلائی خبریں سن رہے تھے۔ یہاں تک کہ ماسکو کے لوگوں کے نام یہ بظاہر معمولی سا تار بھی پلک جھپکتے ہی ساری دنیا کو معلوم ہو گیا... ''اب میں سونے والا ہوں، آپ چاہیں یا نہ چاہیں۔''

درحقیقت یہ سائنس کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ تھا۔ زمین کے ایک چھوٹے سے اسپوتنیک کے اندر آدمی سونے والا تھا!

اب جب کہ خلانورد ستاروں کے سایہ میں ہفتے گزار چکے ہیں، آدمی چاند پر قدم رکھ چکا ہے، سوویت خودکار اسٹیشن نے چاند سے مٹی حاصل کر لی ہے اور ''لونا خود'' نمبر 1 چاند پر دوڑ لگا چکا ہے اس واقع پر کسی کو شاید ہی تعجب ہو۔ لیکن اس وقت یہ پہلی بار تھا۔

''وستوک__2'' نے کرۂ ارض کے سترہ سے زیادہ چکر لگائے۔ چیف ڈیزائن ساز نے تیتوف سے پوچھا:

''اترنے کے لئے تیار ہو؟''

''جی، تیار ہوں۔''

بریک والے انجن چلنے لگے۔ زمین کے اسپوتنیک نے اپنی رفتار کم کر دی اور ہمارے سیارے کی جانب روانہ ہو گیا...

زمین کی کشش نے نہ معلوم کب خلانورد کو کرسی پر جما کر بٹھا دیا۔ ہوا میں معلق سب چیزیں بھی اپنی اپنی جگہ پر آ گئیں۔ خلائی جہاز فضا کی گھنی تہوں میں داخل ہونے لگا۔ یہ ایک اور اہم آزمائش تھی۔

خود خلا باز اس کے متعلق کہتے ہیں:

''اترنے والے جہاز پر گرمی روکنے والا غلاف فوراً انگارہ کی طرح گلابی ہو گیا اور آس پاس چنگاریاں اڑنے لگیں۔ پھر یہ اور گہرا ہو کر پہلے سرخ، گہرا سرخ اور آخر میں ارغوانی نظر آنے لگا۔ لیکن کیبن میں تھرمامیٹر کو دیکھا تو درجہ حرارت معمول پر تھا، یعنی 22 ڈگری سینٹی گریڈ۔ میں نے آنکھ میچ کر باہر دیکھا تو جہاز کے آس پاس آگ سی لگی ہوئی تھی۔ یہ منظر حسین بھی تھا اور دہشت ناک بھی!''

واقعی اس انسان کے احساسات کا اندازہ صرف سطحی طور سے ہی لگایا جا سکتا ہے جو تیز شعلوں کے ہالے سے گھرے ہوئے، تپش سے سرخ جہاز میں اڑ رہا ہو۔ وہ جانتا ہے کہ جہاز کی ہر چیز قابلِ اعتماد ہے، ہر چیز کی پہلے اچھی طرح جانچ پڑتال ہو چکی ہے لیکن پھر بھی ایمانداری سے کہتا ہے کہ منظر ''دہشت ناک'' بھی تھا۔

خیر، یہ آزمائش بھی بخیر و عافیت پوری ہو گئی۔ جہاز مقرر کی ہوئی جگہ کی جانب ٹھیک بڑھتا رہا۔ جب وہ اتنا نیچے پہنچ گیا کہ اس میں سے کودا جا سکتا تھا تو تیتوف نے بٹن دبا دیا۔ فوراً ہی کرسی تیزی سے جہاز سے باہر خارج ہو گئی اور خلانورد کے سر کے اوپر ہوائی چھتری کا نارنجی گنبد پھیل گیا۔

نیچے زمین تھی، اس پر گیہوں کے کھیتوں کے وسیع سنہرے قطعے پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان چاندی کے فیتے کی طرح پیارا وا لگا تھا۔ اور عظیم روسی دریا کے کنارے مشہور شہر ساراتوف اور اینگلس تھے۔

تیتوف نے دھرتی کی زندگی بخش مہک محسوس کی۔ کہیں ایک کھیت میں لال کمبائن سکون کے ساتھ چل رہا تھا۔ ریلوے لائن پر مال گاڑی دوڑ رہی تھی۔ اس کا ڈرائیور انجن کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ یہ ہماری پیاری زمین تھی۔

تیتوف نے گھڑی دیکھی اور جلدی سے اپنے ذہن میں حساب لگایا کہ پرواز کتنی دیر تک جاری رہی__ 25 گھنٹے اور 18 منٹ، یعنی ایک دن اور ایک رات سے بھی زیادہ۔

''ان گھنٹوں نے میری ساری زندگی کو حق بجانب ثابت کر دیا''۔ خلاباز نے بعد میں کہا۔

یہاں پر ہماری داستان ختم ہوتی ہے۔ تاریخی لحاظ سے یہ بھی ایک پرواز بھی۔ خلا کے پہلے باسی نے اپنے تجربے اور علم سے دوسری پروازوں کے لئے راہ کھولی اور اسی سلسلے میں اپنی دیرینہ خواہش کے مطابق انہوں نے فضائی انجینئرنگ کی سب سے اعلیٰ اکادمی، ژوکوفسکی نامی فوجی فضائی انجینئرنگ اکادمی سے ڈگری حاصل کی۔

دنیا کے کئی ملکوں میں خلانورد نمبر 2 کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ ہمارے کرۂ ارض کے کونے کونے میں لوگ تیتوف کے دوست بنے۔ بہت سے ملکوں نے انہیں اپنے خطاب دے کر عزت بخشی۔ لیکن تیتوف کو سب سے زیادہ فخر اس سونے کے ستارے پر ہے جو انہیں بہادر دویت نام نے دیا ہے۔ وہاں وہ سوویت نامی دوستی کی انجمن کے صدر کی حیثیت سے کئی بار جا چکے ہیں۔

اپنی زندگی میں گیرمن تیتوف نے بہت کچھ کیا ہے اور ابھی انہیں بہت کچھ کرنا ہے۔

از: یوری گالپیرن

کلاسیکی اور جدید موسیقی کا امتزاج

اگر ایک شہر میں پیتروف نام کے 40 ہزار لوگ رہتے ہوں تو ان میں سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز ہونے کے لئے آدمی کو غیر معمولی ہونا چاہئے۔

یہی وجہ ہے کہ آندرئی پیتروف کو کسی دوسرے سے خلط ملط نہیں کیا جاتا۔ لوگ انہیں پہچانتے ہیں اور ان کی عزت کرتے ہیں۔ کنسرٹ ہالوں میں اور ریڈیو پر ان کی موسیقی سنی جاتی ہے، ملک میں اور ملک سے باہر بھی ان کے بیلے پیش کئے جاتے ہیں، ان کے گیت ولادیوستوک سے وارسا تک اور ارخانگلسک سے سوفیا تک گونجتے ہیں... اس کے علاوہ وہ لینن گراد کے موسیقی نگاروں کی انجمن کے صدر ہیں۔

تخلیق کی راہ

بچپن بہتے ہوئے پانی کی طرح گزر جاتا ہے
لیکن اپنے نشان چھوڑ جاتا ہے
یہ ہیں بچپن کے گیت...

وہ لوگ بڑے خوش قسمت ہیں جو لڑکپن ہی میں فیصلہ کر لیتے ہیں کہ آئندہ کیا بنیں گے اور کس طرح۔ ان کے نزدیک مستقبل ایک طے شدہ خواہش کی تکمیل ہے۔ ایسے لوگوں کی کامیابی کا راز کیا ہے؟ قوت ارادی؟ صلاحیت؟ یا زمانے کے محض اتفاقات؟

وجہ کچھ بھی ہو لیکن ایک بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے: محض خیالی پلاؤ پکانے سے دیرینہ خواب کبھی پورا نہیں ہوتا۔

میں ایک سائنس داں کو جانتا ہوں۔ دس برس کی عمر سے ہی انہیں علم فلکیات سے بے حد دلچسپی تھی۔ پچیس برس کے بعد اسی شخص نے خلا میں چکر لگائے... ان کا نام اب تمام دنیا میں مشہور ہے۔ یہ ہیں خلانورد کونستانتین فیا کتستوف۔

یہ مثال میں نے اس لئے پیش کی کہ آندرئی پیتروف کی داستان حیات بھی ایسی ہی ہے۔ وہ چودہ برس کے تھے جب انہوں نے قطعی طور پر اپنی زندگی کی منزل مقرر کر لی تھی اور مسلسل کوششوں کی بدولت اس تک پہنچ بھی گئے۔

محاصرے کے زمانے میں دوسرے بچوں کے ساتھ انہیں ایک چھوٹے سے قصبے میں منتقل کر

دیا گیا تھا۔ وہ پھر لینن گراد آ گئے۔ اس وقت کی یادیں، جوان کے ذہن پر اب بھی نقش ہیں، یہ ہیں ـــ چراغ کی مدھم جھلملاتی ہوئی روشنی میں طویل شامیں، اور گیت ''رات تاریک ہے'' کی موسیقی۔ ہزاروں لوگوں کی طرح ان کے لئے بھی یہ گیت محض اچھی موسیقی اور موزوں الفاظ کا ہی مجموعہ نہیں ہے، بلکہ یہ بچپن کے تمام غموں اور خال خال خوشیوں، جنگ کے زمانے کی تلخ روٹی اور ماؤں کی تنہائی کی تصویریں خیال کے سامنے لا کھڑی کرتا ہے۔

آندرئی نے پہلی بار سینما 1944ء میں دیکھا۔ اس وقت لینن گراد میں ''عظیم والز'' فلم دکھایا جا رہا تھا۔ اس میں مشہور موسیقی نگار اشتراؤس کی سوانح پیش کی گئی تھی۔ اسے دیکھنے کے بعد ہی آندرئی نے اپنے مستقبل کا فیصلہ کر لیا۔ لڑکے کو فلم میں موسیقی کی تخلیق کی پہلی جھلک مل گئی۔ جنگ سے پہلے آندرئی وائلن بجانا سیکھ رہے تھے اور جانتے تھے کہ موسیقی کے ذریعے کسی خیال کی تشریح کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ اب انہیں موسیقی لکھنے کی دلکشی بھی محسوس ہونے لگی۔

پیتروف کو سخت افسوس تھا کہ انہوں نے پیانو بجانا چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ پورے جوش و خروش سے وہ پیانو بجانے میں مہارت حاصل کرنے لگے اور وائلن نوازی بھی جاری رکھی۔ ان کی محنت بارآور ثابت ہوئی۔ موسم خزاں میں انہیں موسیقی کے کالج میں داخلہ مل گیا۔ کالج کے نصاب میں ان کی خوش قسمتی سے موسیقی نگاری بھی شامل تھی۔

یہاں آندرئی کا بچپن ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کے نو سال مسلسل مشقت کے سال تھے۔ اس میں موسیقی کی تعلیم اور کنسرویٹری میں ٹریننگ شامل تھی جہاں وہ کامیابیوں اور ناکامیوں دونوں ہی سے دوچار ہوئے۔

تعلیم حاصل کر کے آندرئی ایسی چیز کی تلاش میں مصروف ہو گئے جو موسیقی نگاری کی دنیا میں بالکل نئی اور انوکھی ہو۔

جانا پہچانا نغمہ

اے انسان، اگر تو اپنا نشان چھوڑے بغیر گزر رہا ہے
تو ایسے جینے سے کیا فائدہ؟

دو سال ہوئے میں تالین میں تھا۔ اگست کا مہینہ تھا اور بارش تھی کہ رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔

کہر خاموش سمندر کو لپیٹے رہتا تھا۔ میرے پڑوس میں ایک نوجوان لڑکی رہتی تھی۔ تمام دن اس کا کام ایک ہی ریکارڈ کو بار بار بجانا تھا۔ یہ فلم ''لنگرگاہ کی راہ'' کا ایک گیت تھا۔ اس گیت میں جہاز کی گھنٹیاں بجتی تھیں اور سمندر کے اوپر کہر کی دبیز چادر سے ایک ملاح کا نغمہ ابھرتا تھا جس میں وہ اپنی ناکام محبت پر آہیں بھرتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اگر دس برس کے بعد یہ گیت سنوں تب بھی وہ مجھے گیلی گودیوں، کہر میں لپٹے ہوئے سمندر اور ان تمام باتوں کی یاد دلائے گا جو مجھ پر اس اگست میں گزری تھیں۔ اس نغمے سے بہتر اور کوئی دوسری چیز میرا ماضی پوری طرح نہیں جگا سکتی۔

اس وقت میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ آندرئی پیتروف ہی اس گیت کے خالق ہیں۔ لیکن اب میں ان کے نغمے فوراً پہچان لیتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ انہیں موسیقی کی دنیا میں اتنا بلند مقام کیوں حاصل ہے۔

انہیں ایک مرتبہ سننے کے بعد بھی آدمی محسوس کر سکتا ہے کہ ان کی موسیقی میں صرف وضاحت ہی نہیں بلکہ انتہائی گہرائی بھی ہے۔ میں اس مقابلے کی معذرت چاہتا ہوں: آندرئی کے نغمے ان کئی منزلہ بلند عمارتوں کی طرح ہیں جو پیچیدہ بھی ہوتی ہیں اور ساتھ ہی جدید تعمیر کے انوکھے پن اور سادگی کی حامل بھی۔

اس پیچیدگی اور تازگی کا سرچشمہ کیا ہے؟ بنیادی طور پر آندرئی پیتروف سمفنی نواز ہیں اور ان کے نغموں کی جڑیں کلاسیکی موسیقی میں پیوست ہیں۔ ان کے نغموں میں ''خالص'' موسیقی جدید موسیقی کے نسبتاً زیادہ آسان ڈھانچے میں جڑ جاتی ہے۔ موسیقی کی دو مختلف صنفیں ان کی تخلیقات میں ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ اگر ایک طرف ہمیں سمفنی کی موسیقی میں ہلکے گیتوں کا شوخ رنگ ملتا ہے تو دوسری طرف ہلکے پھلکے گانوں میں کلاسیکی موسیقی کی گہرائی محسوس ہوتی ہے۔

اس کے متعلق خود آندرئی پیتروف نے مجھے بتایا کہ وہ ایک گیت میں دہرائی جانے والی موسیقی کے پابند رہنا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے گیتوں پر رزمیہ نظم یا رومان کا رنگ چڑھانا پسند کرتے ہیں۔ نغمہ لکھتے وقت وہ یہ پیش نظر رکھتے ہیں کہ اس کا ایک مکمل منظر نامہ یا خاکہ ہو اور اس میں ڈرامہ، خطاب اور نقل سب ہی سموئے ہوئے ہوں۔

آندرئی کے ایک گیت نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا ہے۔ یہ نوجوان ٹرام کنڈکٹر خاتون

کے بارے میں ہے۔ گانے والی کی آواز موسیقی کی شکل میں کنڈکٹر کی زندگی اور تمناؤں کا بہترین اظہار کرتی ہے۔ آواز پہلے رکی رکی اور گھٹی گھٹی سی ہے جو اس کے روزمرہ کے بے رنگ کام کی عکاسی کرتی ہے۔ پھر یکا یک لے اوپر اٹھتی ہے اور کنڈکٹر کے گرد مصنوعی دیوار کو گراتی ہوئی ستاروں سے بھی آگے پہنچ جاتی ہے۔ سننے والا اب کنڈکٹر کی امیدوں، اس کے خوابوں کی اندرونی طاقت محسوس کرسکتا ہے... ''اب میں ستاروں تک جانے کا تمہیں ٹکٹ دوں گی''۔ کیا اس نمایاں تقابل کا تاثر محض تکنیکی چالاکی یا گانے والی کے مصنوعی جذباتی اور ڈرامائی انداز کا نتیجہ ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ خود موسیقی نگار نے اپنی تخلیق میں ''اثرات'' اس طرح بٹھائے ہیں کہ اجزا سے ایک ایسی سالم چیز بن جاتی ہے جو اس کے موضوع کا پورا مطلب دل نشین کرادیتی ہے۔

میں ان کے یہ گیت اکثر سنا کرتا ہوں: ''گرمیوں کی فضا خوشبو سے عطر آگیں ہے'' ''ماسکو میں چہل قدمی'' ''خرگوش''۔ آخرالذکر گیت اس انسان کے بارے میں ہے جو دنیا میں اپنے نقوش چھوڑتا ہے اور اس بادل کی طرح نہیں ہے جو ایک بار نظر آنے کے بعد آسمان میں غائب ہو جاتا ہے۔ میں نے آندری سے پوچھا:

''آپ کی موسیقی کی بنیاد کیا ہے؟ کیا اس کا سرچشمہ فن کی مہارت ہے؟''

''ابتدائی خیال بلاشبہ وجدانی ہوتا ہے۔ لیکن موسیقی کو ٹھوس شکل دینے کا انحصار بڑی حد تک تکنیکی مہارت اور ذاتی قابلیت پر ہوتا ہے۔ آپ کا غالباً سوال یہ ہے کہ کیا نغمہ گری کا ماہر موسیقار مصنوعی طور پر نغمہ ترتیب دے سکتا ہے؟ میری ناچیز رائے میں یہ ناممکن ہے۔ اگر ایسا کیا بھی جائے تو ماحصل بالکل بے جان ہوگا ___ تکنیکی لحاظ سے بے داغ لیکن فنی اعتبار سے بے روح۔ وجدان کے تحت باشعور عنصر کو فن پارے کی مکمل شکل دینے کے لئے یقینی موسیقانہ مہارت کی ضرورت ہے۔ یہ شطرنج کی طرح ہے ___ کوئی بھی ابتدائی چال اچھی چل سکتا ہے۔ لیکن سوچے سمجھے ہوشیار منصوبے کے مطابق پھر آگے بڑھنے اور بازی جیتنے کے لئے ایک اچھا ماہر ہونا چاہئے۔

''شاذ و نادر ہی میرے ذہن میں دھن بلاتصور وارد ہوتی ہے۔ عام طور پر اس کا تعلق کسی خیال یا موضوع سے ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں رنگ، کردار، نفسیات اور موزوں استعارے بھی دھن کو ڈھالنے میں مدد دیتے ہیں۔''

''ایک اور سوال کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ پیشتر ہی محسوس کرلیتے ہیں کہ آپ کا فلاں نغمہ

کامیاب رہے گا؟"

"اس کا مجھے کبھی پیشتر اندازہ نہیں ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ میں ایک مرتبہ لینن گراد کی شاہراہ نیفسکی پر چہل قدمی کررہا تھا۔ وہاں میں نے پہلی دفعہ اپنا ایک گیت کسی کو سیٹی پر بجاتے ہوئے سنا۔ ایک غیر شعوری تجسس نے میرے پیر وہیں روک دیئے۔ میں نے سوچا کہ گیت جانا پہچانا معلوم ہوتا ہے۔ پھر اچانک خیال آیا کہ یہ تو میرا اپنا لکھا ہوا گیت ہے۔ پہلے مجھے یقین نہیں تھا کہ میرے گیت سڑکوں پر بھی سنائی دیں گے۔ حیرانی اور خوشی سے میں ہکا بکا رہ گیا۔

روسی ٹوایسٹ

"کیا بات ہے، تمہیں ٹوایسٹ ناچ پسند نہیں؟"
"نہیں، پسند ہے! لیکن اس
سے کوئی یاد وابستہ ہے۔"

اگر چہ نوجوان موسیقی نگار گیتوں کی دھنیں لکھنا پسند ضرور کرتے ہیں لیکن ان پر وہ اپنا زیادہ تخلیقی وقت صرف نہیں کرتے۔ ان کی فنی تخلیقات کا میدان بہت وسیع ہے۔ وہ تین بیلوں اور کئی فلموں کے لئے موسیقی لکھ چکے ہیں اور بہت سی گانے والی سمفنی نظموں اور رومانوں کے مصنف بھی ہیں۔

لینن گراد میں موسیقی نگاروں کا کلب ایک عالیشان محل میں واقع ہے۔ اس کے کنسرٹ ہالوں کی دیواروں پر ایک خاص قسم کی لکڑی چسپاں کی گئی ہے تا کہ آواز اچھی طرح سنائی دے۔ یہاں میں نے آندرئی پیتروف کی سمفنی کا سلسلہ سنا جو "ہمارے وقت کے گیت" کے نام سے مشہور ہے۔

ہوسکتا ہے کہ میں موسیقی کو خیالی مناظر کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بہر حال میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس فن پارے کی موسیقانہ تصویروں نے مجھ پر گہرا تاثر چھوڑا ہے۔ "طوفان" کے حصے میں آپ برف کے شدید طوفان کی چیخوں میں سے گزرتے ہوئے انقلابی دستوں کا مارچ "دیکھ" سکتے ہیں۔ اس کے بعد بہار کی آمد پیش کی گئی ہے۔ سننے والا برف پگھلنے، منجمد درختوں کی چھال سے زمین پر قطرے گرنے، آسمان کی بلندیاں ابھرنے کے منظر تصور میں دیکھ سکتا ہے

چوتھے اور پانچویں حصوں میں موسیقی جشن کی موسیقی کی طرح ابھرتی ہے۔ یہاں ہم والزاور مارچ کی دھنیں سنتے ہیں جو بار بار خاص موضوع سے آہنگ ہو جاتی ہیں۔ پھر یکا یک موسیقی بکھر جاتی ہے اور تلخی اور غم کا ماحول پیدا کر دیتی ہے۔ جنگ شروع ہو گئی ہے اور اپنے ساتھ تباہی لا رہی ہے:

''جہاں پہلے گھر تھا اب وہاں مٹھی بھر راکھ کے سوا اور کچھ نہیں۔''

پیتروف کی موسیقی میں بلا کی صحت اور بے حد واضح منظر نگاری ملتی ہے۔ اسی لئے ہم ڈرائنگ سے اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

''روسی ٹوایسٹ'' ناچ نے بھی مجھے بہت متاثر کیا ہے، اور دوسری وجوہات کی بنا پر۔ پہلے میں مزاحیہ موسیقی سن کر بس مسکرا دیتا تھا۔ لیکن پھر اس ناچ نے تو مجھے قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا!

اس کا مزاح ستھرا ہے اور کسی کا مذاق نہیں اڑاتا۔

اس کی دھن گڈریوں کی بانسری، بالالائیکا اور مختلف قسم کے لوک سازوں پر بجائی جاتی ہے... نتیجہ ایک شوخ ظرافت کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔

''آپ نے یہ کیسے تحریر کیا؟''

آندرئی نے ہنس کر جواب دیا:

''آپ نے محسوس نہیں کیا کہ اس ٹوایسٹ کی تال ہمارے روسی چاستوشکا* سے کتنی ملتی جلتی ہے؟''

کامیابیوں کے بعد

میں اپنی قسمت سے مطمئن ہوں
لیکن میرے دل میں نئی نئی امنگیں کروٹیں لیتی رہتی ہیں...

ہم دونوں موسیقی نگاروں کے کلب کے ایک وسیع ڈرائنگ روم میں آتش دان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سوال کر رہا تھا اور آندرئی جواب دے رہے تھے۔

''میرے خیال میں جدید موسیقی کو ترقی دینے کے لئے اظہار کے نت نئے اسلوب ڈھونڈھنے کے بجائے، ہمارے پاس جو کچھ موجود ہے اس کے سب سے زیادہ مضبوط اور خوش

* ایک مزاحیہ روسی لوک گیت۔

آ ئندعناصر کو استعمال کرنا چاہیے۔ مختصر الفاظ میں یہ عناصر ہیں ___ لے، ہم آ ہنگی، کئی سر، تال اور آرکسٹرا کے لئے نغمے کی ترتیب۔ بیسویں صدی میں موسیقی کے ان تمام عناصر نے انتہائی ترقی کی ہے۔ میری رائے میں اب وقت آ گیا ہے کہ ان عناصر کا ایک نیا امتزاج کیا جائے۔ مثال کے طور پر روایتی اوپیرا کی جگہ اوپیرا اور سمفنی، اوپیرا اور بیلے کا موسیقانہ امتزاج کرنا چاہیے۔ یہ ناممکن نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ریڈیو اور سینما اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔

''فن کا بنیادی معیار جوہر ہوتا ہے۔ جوہر کے بغیر فن زندہ نہیں رہتا۔''

یکا یک ہماری گفتگو رک گئی۔ قریب ہی کے کمرے میں کسی نے پیانو بجانا شروع کر دیا___ ابتدا میں احتیاط سے اور پھر اعتماد کے ساتھ۔

''میں اس شخص پر رشک کرتا ہوں جو مہارت سے کوئی ساز بجا سکتا ہے'' اچانک آندرئی نے کہا۔ ''اس کا مجھے سخت افسوس ہے کہ میں اتنا ماہر نہیں ہوں کہ پبلک میں کوئی ساز بجاؤں... اسی طرح میں تقریر بھی نہیں کر سکتا۔ جب میرے سامنے لوگوں کا مجمع ہوتا ہے تو میری سٹی گم ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ میں نے عہد کیا تھا کہ اس خامی کو دور کروں گا... لیکن یہ کب ہوگا، پتہ نہیں۔''

''آپ نے پوچھا۔ ہے کہ میری کامیابیاں کس کی مرہون منت ہیں؟'' پھر آندرئی سوچنے لگے۔ ''میں ابھی آپ کو بتاتا ہوں۔ موسیقی کا اسکول جہاں میں نے تعلیم حاصل کی ایک سابق محل تھا۔ میں ینگ پائنیروں کے محل جایا کرتا تھا جہاں پہلے کوئی رئیس رہتا ہوگا۔ اور اب جس وسیع عمارت میں میں کام کرتا ہوں اس کے مالک خطاب یافتہ مختلف امیر زادے تھے... میرے سچے محسن وہ مجاہد ہیں جنہوں نے 1917ء میں جدوجہد کر کے یہ محل عوام کے حوالے کئے۔ اگر حالات مختلف ہوتے تو شاید میں موسیقی نگار نہیں بن سکتا تھا۔

''میں خاص طور پر نوجوان کمیونسٹ لیگ کا بھی ممنون ہوں۔ اس تنظیم کی رکنیت کے زمانے ہی میں مجھے کئی دلچسپ شخصیتوں سے ملنے کا موقع میسر ہوا، میں نے مفید کام کئے اور ماحول کے گہرے تاثرات حاصل کئے۔ ان ہی برسوں میں میں نے لوگوں سے اور ان کی زندگی سے محبت کرنا سیکھی۔ یہی وجہ ہے کہ میرے بہت سے گیت نوجوانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔''

لوک کہانیاں اور مصوری

کوئی شخص دلچسپ ہے یا نہیں اس کا انحصار اس کے فلسفہ زندگی پر ہوتا ہے۔اس لئے کہ انسان فلسفہ زندگی کے ذریعے سے ہی اپنے آپ کو فرسودہ رواجوں اور گھٹیا باتوں سے بلند رکھ سکتا ہے۔

تمارا یوفا اس اصول کی زندہ مثال ہیں۔ان کا نام ملک کے اکثر اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتا ہے۔ وہ اتنی مشہور ہیں کہ خط بھیجنے کے لئے لفافے پر صرف ان کا نام اور شہر پیترو زاوودسک لکھنا کافی ہے، سڑک اور مکان کے نمبر کی بالکل ضرورت نہیں۔

اس نوجوان مصور کی مقبولیت روز افزوں بڑھتی جا رہی ہے۔ان کی ہر نئی تصویر، ہر نئی نمائش شہرت کا نیا باب کھولتی ہے۔

تمارا کی تصویریں ہر قسم کے لوگ پسند کرتے ہیں__ ان میں مقامی ماہی گیر بھی شامل ہیں جو پہلی بار نمائش میں ان کے شاہ کار دیکھنے آتے ہیں اور پیشہ ور نقاد بھی جو بہت کچھ دیکھ چکے ہیں۔

لوک کہانیوں کا رنگ

تقریباً ایک صدی پہلے جب بریولوف کی تصویر ''پومپئی کا آخری دن'' پیٹرسبرگ کے عجائب گھر اریمتاژ میں دکھائی جا رہی تھی تو گوگول نے اس سے مرعوب ہو کر مصور کے بارے میں لکھا تھا:

''وہ تمام فطرت کو اپنے قوی ہیکل بازوؤں میں لینے کی کوشش کرتا ہے اور جذباتی عاشق کی طرح اسے زور سے بھینچتا ہے۔''

قوی ہیکل بازوؤں میں لینا... اگر ہم اپنی ابتدا اس کے برعکس پہلو سے کریں (اور دعوے بھی کریں کہ یہ صحیح ہے) تو ہمیں تمارا یوفا کے فنی طرز کی ایک سب سے ممتاز خصوصیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی__ یہ ہے ان کا زندگی کا حیرت انگیز مدھم اور غنائی تصور۔

تمارا زندگی اور دنیا کو جب اپنی تصویروں میں پیش کرتی ہیں تو ان کی ترتیب آزاد اور بے قید ہوتی ہے۔یہاں ہمیں لوک کہانیوں اور دیومالاؤں کا اثر صاف نظر آتا ہے۔

جہاں ہر چیز ممکن ہے

تمارا یوفا لینن گراد آرٹ اسکول کی گریجویٹ ہیں۔انہوں نے قدیم کریلیا کے ایک گاؤں لادوا میں فنون کی استانی کی حیثیت سے کام شروع کیا۔

وہ کون سی کشش تھی جو انہیں کریلیا لائی؟

اب وہ اس کا جواب یقین کے ساتھ دے سکتی ہیں۔ کریلیا کی لوک کہانیاں اور خاص کر اس کی قومی رزمیہ کہانی ''کالیوالا'' اور اس کی ہیروئن آئینو۔

تمارا اب اچھی طرح محسوس کرتی ہیں کہ وہ کیوں کریلیا آئی تھیں۔ یہ شدید موسم کی سرزمین بھی ہے اور شاعرانہ حسن کی بھی۔ یہاں ہر جگہ گیت اور لوک کہانیاں سنی جاسکتی ہیں۔ اور شاید دنیا میں سب سے زیادہ گہری برف اسی علاقے میں ہوتی ہے اور سب سے زیادہ نیلی اور بلور کی طرح شفاف جھیلیں بھی۔

تمارا گرافک آرٹ کی ماہر ہیں اور کتابوں کے لئے تصویریں بناتی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ ان کا فن محدود ہے۔ وہ اپنے آپ کو کتاب کی عبارت میں مقید نہیں رکھتیں۔ یہ درست ہے کہ لوک کہانیوں کی ایک خاص مقبولیت کی وجہ سے نئے رنگ میں ان کی تشریح کرنا بہت مشکل کام ہے۔ لیکن تمارا کی تصویروں میں اکثر ایک بالکل نیا زاویہ ملتا ہے۔ اور یہی تخلیقی فن کی نشانی ہے۔

''کالیوالا'' کی وضاحت کئی طرح سے کی جاسکتی ہے۔ ایک فن کار اسے المیے کے طور پر پیش کرے گا جس کے تمام ہیرو بدنصیب ہیں۔ دوسرے مصور کو اس میں رزمیہ ڈرامہ اور بہادری کے کارنامے نظر آئیں گے۔ تمارا یوفا کے لئے ''کالیوالا'' میں سب سے دلچسپ چیز عورتیں اور ان کا اداس مقدر ہے۔

نوجوان مصورنے ''کالیوالا'' کو جو تشبیہی معنی عطا کئے ہیں ان کے ظاہری روپ سے اگر ہم ذرا آگے دیکھیں تو ہمیں زندگی کا ان کا مفرد تصور نظر آئے گا۔ ان کی تشبیہات بڑی غیر معمولی ہوتی ہیں۔ ان کی ایک ہی تصویر کے پس منظر میں سورج اور چاند دونوں ساتھ دکھائے گئے ہیں اور پانی میں جادو کی مچھلیاں آئینو کا مردہ جسم اٹھائے ہوئے ہیں۔ تمارا یوفا کی تخلیقی دنیا جولانی تخیل کی دنیا ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ لوک کہانیوں اور پریوں کے قصوں کے متعلق تصویریں بنانا پسند کرتی ہیں۔ آج کل وہ سیلویا اور سیلویسٹر کی تصویر کشی میں مصروف ہیں جو زخاریاس توپے لیوس کی کتاب ''جاڑوں کی کہانی'' میں دو ہیرو بچے ہیں۔ تمارا یوفا کو یہ بچے خاص کر اس لئے پسند ہیں کہ وہ سردیوں

میں جہاں بھی جاتے ہیں وہاں برف کی جگہ ہریالی پھیل جاتی ہے اور پھول کھلنے لگتے ہیں۔

زندگی

تمارا کو دیومالا ڈن اور ''کالیوالا'' سے آخر اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ اس کا جواب ہمیں ان کے بچپن سے ملتا ہے۔ وہ ذادونسک اور یلیتس قصبوں میں پیدا ہوئیں اور پلی بڑھیں۔ یہ روس کا وہ علاقہ ہے جو اپنی قدیم تاریخ اور رزمیہ روایات کے لئے مشہور ہے۔ یہاں کا ایک ایک پتھر ماضی کی بہادر داستانیں سنا سکتا ہے۔ بچی تمارا کے ذہن پر سورماؤں کے یہی قصے نقش ہو گئے۔ یہ ملک کا وہ حصہ ہے جہاں وادیوں میں سفیدے کے درخت اور جھاڑیاں، خانقاہیں اور چھوٹے چھوٹے گرجے بکھرے ہوئے ہیں۔ یہیں قدیم روسی دستکاری اب بھی محفوظ ہے۔ یہاں آج بھی ایسے مکان دیکھے جاسکتے ہیں جو نفیس چوب کاری سے آراستہ ہیں۔

بلاشبہ تمارا نے اپنی والدہ انتونینا واسیلے وِنا سے بھی کافی اثر قبول کیا۔ وہ جھالریں بنانے میں استاد تھیں۔ شروع سے ہی انہوں نے بیٹی کے کام پر کڑی نظر رکھی اور بے لاگ رائے دی۔ جب وہ کسی تصویر کی تعریف کرنا چاہتی ہیں تو بس یہ کہتی ہیں: ''بالکل اصلی معلوم ہوتی ہے'' (اور یہ پریوں کی کہانی کی تصویر ہوتی ہے!)۔

تمارا کہتی ہیں: ''میری ماں کی احساسات کی دنیا بڑی وسیع ہے، میں اُن کی رائے مانتی ہوں۔''

تنہا ماں نے تمارا کی پرورش کی۔ تمارا جب اپنا بچپن یاد کرتی ہیں تو یہ بات اپنے لئے بڑی ہی خوش قسمت معلوم ہوتی ہے کہ ذادونسک اور یلیتس کے درمیان بس کا کرایہ کم کر دیا گیا تھا۔ ذادونسک میں وہ رہتی تھیں اور شہر یلیتس میں پائنیروں کا محل تھا جہاں مصوری کا اسٹوڈیو تھا۔

یہاں پہلی مرتبہ تمارا کی تصویروں کی نمائش ہوئی۔ ان میں پوشکن کی کتاب ''کپتان کی بیٹی'' کے متعلق تصویریں بھی شامل تھیں۔ ان کی کچھ تصویروں کو ''ادبی البم'' میں شامل کر لیا گیا (طالب علم درسی ادبی کتابوں سے متعلق جو تصویریں بناتے ہیں ان کا مجموعہ) اور کچھ تصویریں دیواری اخبار کی زینت بن گئیں۔

پھر تمارا یلیتس کے آرٹ اسکول میں پڑھنے لگیں۔ یہاں مصوری کے پہلے امتحان میں وہ

فیل ہو گئیں۔

لیکن چند ہی سال بعد ان کا شمار اچھے مصوروں میں ہونے لگا۔ کریلیا میں ان کے بہت سے شاگردوں نے بچوں کی تصویروں کے مقابلوں میں اعلیٰ انعام حاصل کئے ہیں۔

''مجھے ایک بات کا یقین ہے'' تمارا نے کہا۔ ''اگر جان پہچان کے لوگ میری مدد نہ کرتے اور نیک خواہشات سے نہ نوازتے تو میں کبھی فن کار نہیں بن سکتی تھی۔ میں بڑی ہی خوش قسمت ہوں کہ لوگوں نے میری ہمت افزائی کی اور ذاتی طور پر میرے کام سے دلچسپی لی۔ میں بالکل مبالغے سے کام نہیں لے رہی ہوں... لوگوں کی آنکھوں سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ مخلص ہیں یا محض خوش کرنے کے لئے تعریف کر رہے ہیں۔ اگر میری تصویر دیکھ کر کسی کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگتی ہیں تو اس سے بڑھ کر میری اور کوئی ہمت افزائی نہیں ہو سکتی۔''

پیتروزاوودسک کی نوجوان کمیونسٹ لیگ کے ممبروں سے تمارا کے اچھے دوستانہ تعلقات ہیں۔ وہ ان کی کامیابیوں سے سب سے زیادہ مسرور ہوتے ہیں۔ اور تمہارا بھی جانتی ہیں کہ ضرورت کے وقت لیگ کے ممبر ہی ان کی امداد کے لئے پیش پیش ہوں گے۔ جہاں تک نوجوان فن کار کا تعلق ہے تو لیگ کی علاقائی کمیٹی ہو یا شہر کی تنظیم یا نوجوانوں کا اخبار وہ اس کی ضرورت بروقت پوری کرنا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔

انسان کی زندگی ایک شاہراہ کی طرح ہے۔ اس میں تیز موڑ بھی آتے ہیں __ کبھی بہتر اور کبھی بدتر۔ بعض وقت آدمی آنسو بہا کر آخری فیصلہ کرتا ہے۔ پھر خیال بدلتا ہے اور زندگی میں امید کی کرن پھوٹ نکلتی ہے۔ ہر انسان کی قسمت جدا ہوتی ہے لیکن زندگی کا دھارا بہتا رہتا ہے __ لوگ مزاح پر ہنستے ہیں، غمگین واقعہ پر روتے ہیں، تصادموں اور ٹکروں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا... ایسی صورت میں نوجوان تمارا یوفا (جنھوں نے ابھی تیس بہاریں بھی نہیں دیکھی ہیں) کی سوانح حیات بیان کرنا بے تکی سی بات ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ میں ان ہی کے الفاظ دھرا دوں:

''میں اچھی ساعت میں پیدا ہوئی تھی۔''

اگر آپ تمارا کے فلیٹ میں داخل ہوں تو آپ کو کام کی میز کھڑکی کے قریب نہیں بلکہ کمرے کے تقریباً بیچ میں نظر آئے گی۔ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تمارا کو کام کے لئے

دن کی روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ عرصے سے رات کے وقت کام کرنے کی عادی ہیں۔ اس کی ابتدا لادوا سے ہوئی جہاں وہ اسکول ٹیچر تھیں۔ دن میں وہ اسکول جاتیں اور رات کو بیٹی کو سلانے کے بعد خاموش اور پُرسکون ماحول میں اپنا تخلیقی کام شروع کیا کرتی تھیں۔

لادوا میں انہیں وہ دونوں چیزیں مل گئی تھیں جن کی انہیں تلاش تھی ــــ ''کالیولا'' کے نوجوان ہیرو اور بوڑھے دانا لوگ جن کے جھریوں دار چہرے دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ وہ لکڑی سے تراشے گئے ہیں۔ وہ دیو مالائی سورماؤں کے مکمل نمونے تھے اور کارآمد نقاد بھی۔ انہیں چولہے بنانے والا وہ بوڑھا ابھی تک یاد ہے جو قریب ہی رہتا تھا اور وہ بڑھیا بھی جو روز صبح دودھ لایا کرتی تھی۔

تمارا یوفا بچوں سے بہت محبت کرتی ہیں ــــ اپنی بیٹی ریتا سے بھی جو خود اچھی تصویریں بناتی ہے اور خواب دیکھتی ہے کہ بڑی ہو کر دوکان میں بڑے دن کے موقع پر کھلونے بیچے گی، اور ان لڑکے لڑکیوں سے بھی جن کو انہوں نے لادوا میں پڑھایا اور جو اب پیتروزاوودسک کے پائنیر محل کے آرٹ اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

ذوق اور میلان طبع

تمارا سے ملاقات کرنا مشکل ہے۔ ابھی ابھی وہ لینن گراد سے لوٹی تھیں جہاں وہ لوور کی تصویروں کی نمائش دیکھنے گئی تھیں۔

سوانح عمری کی تفصیلات کے مقابلے میں آدمی کا ذوق اور میلان طبع اس کے متعلق بہت کچھ بتاتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کے پسندیدہ مصور وروبیل، نیستیروف، روبلیف، جوتو اور بوتیچیلی ہیں۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ سرخ، سفید، سیاہ اور بھورے رنگوں کو ترجیح دیتی ہیں۔ موسیقی کے شعبے میں ان کا انتخاب بے حد وسیع ہے۔ آج کل وہ اسکریابن اور موزارٹ کے نغمے زیادہ سنتی ہیں۔

ان کے تقریباً تمام دوست ہم عمر ہیں ــــ فن کار اور اداکار جو مقامی تھیٹر یا ٹیلی وژن اسٹوڈیو میں کام کرتے ہیں۔

تمارا تھوڑی بہت خوابوں، وجدان اور پیش خبری کی بھی قائل ہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے خواب میں ایک دوست کو دیکھا جس سے وہ برسوں سے نہیں ملی تھیں۔ دوسرے ہی دن صبح کو

پیتروزااوودسک کی سڑک پر ان کی اپنے دوست سے ٹکر ہوگئی!

"اس کا مطلب ہے کہ خواب سچے ہوتے ہیں...؟"

یہ کہہ کر سنہرے بالوں والی نوجوان مصور خاتون سوالیہ انداز میں مسکرانے لگیں۔ان کی آواز نرم اور ٹھہری ہوئی ہے۔ان کے بولنے کے انداز سے ایسا لگتا ہے کہ جن چیزوں کے بارے میں وہ پہلے کافی سوچ چکی ہیں انہیں پھر یاد کر رہی ہیں۔

بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ زیادہ تر مصور غیر شعوری طور پر اپنے ہیرو میں اپنی خصوصیات سمو دیتے ہیں۔تمارا کے متعلق بڑی حد تک یہی کہا جا سکتا ہے۔تمارا اور آئینو کی بیرونی مشابہت پر بحث کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن اس میں مطلق شبہ نہیں کہ آئینو کی دل ربائی، نسائیت اور کشش تمارا ہی کا پرتو ہیں۔

مستقبل کے منصوبے؟ تمارا یوفا "کالیوالا" کی بنیاد پر ایک اور نئی تصویر بنائیں گی (پہلے دن جب میں پیتروزااوودسک میں ان کے ہاں گیا تھا تو میں نے اس قدیم دیومالا کے بارے میں غیر مکمل خاکے دیکھے تھے جو کندہ کار تصویروں کے لئے ہیں)۔اس کے علاوہ جزیرہ کیوی کے گرجے گھروں اور دشمنوں کے خلاف قدیم روسی شہزادہ ایگور کی مہم کے بارے میں بھی مرقعے کھینچیں گی۔

تمارا کے مستقبل کے منصوبے خلا اور سیاروں کی دنیا سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔اور یہ ان کی ایک خصوصیت، خیال کی پرواز کا اظہار ہے۔ان کے گھر میں ایک تصویر آویزاں ہے جس کا نام "مریخ کی حسینائیں" ہے۔ان کی آنکھیں اسپوتنک کی طرح ہیں بھنوؤں کی شکل اسپوتنک کے مدار جیسی ہے اور پلکیں انٹینا سے ملتی جلتی ہیں!

آخر میں میں نے پھر پوچھا: "آپ کو خاص طور پر "کالیوالا" سے کیوں اتنا لگاؤ ہے؟"

"مجھے امید ہے کہ میری تصویریں دیکھ کر لوگ اس رزمیہ کہانی کو پڑھیں گے اور خود اس کی گہرائی اور حسن کو محسوس کریں گے۔"

"... ان کی غیر معمولی اور معرکے کی تصویروں کی ایک بڑی خصوصیت اظہار کا اسلوب ہے۔ان میں شمالی فرک فن کی تمام دولتیں سمٹی ہوئی ہیں اور ان کی انسان دوستی بے حد متاثر کرتی

ہے۔تمارا یوفا کی فنی تخلیقات، مثلاً آ ئینو، المار ینین اور لیمنکا ئینین کی تصویروں میں ہمیں ایک دلچسپ دوہرا رنگ نظر آتا ہے۔ان سورماؤں کی روایاتی تشریح کے ساتھ ساتھ تمارا نے ان میں زندگی کے اپنے انوکھے اور مخصوص تصور جیسے عناصر بھی شامل کر دیے ہیں۔ان کی تصویروں میں صرف شوخ رنگ کے قومی لباس ہی نہیں ملتے بلکہ ہمارے ہم عصروں کے خدوخال بھی دکھائی دیتے ہیں جو مضبوط کردار اور گہرے جذبات کے مالک ہیں اور جو زندگی کی کلفتوں اور مشکلوں سے دوچار ہیں ___ ماں، لڑکی، لوہار... ان کے مخصوص تصور کا ایک اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ اشاریت کو بے باکی سے استعمال کرتی ہیں۔اگر کریلیا کے جانے پہچانے قدرتی مناظر کی تصویر کو غور سے دیکھیں تو آپ کو اس میں ایک نیا بعد نظر آئے گا۔تمارا یوفا کے فن کی ایک اور خوبی کو لیجیے جو غالباً سب سے زیادہ اہم ہے۔وہ پیچیدہ اور گوناگوں ترتیب (کمپوزیشن) میں انتہائی صحت کے ساتھ اور بڑی نزاکت سے تصویر اتارتی ہیں۔"

(رسالہ "فن کار"۔)

از: اولیگ اسپاسکی

گلوکار کی دنیا

اٹلی کے لوگ کہتے ہیں: ''اگر کوئی شخص اوپیرا ''ریگولیٹو'' میں ڈیوک کا رول گا سکتا ہے تو وہ سب کچھ گا سکتا ہے۔''

اناتولی سولوویانینکو اونچے سروں میں گاتے ہیں اور ان کی آواز میں دھات کی طرح کھنک ہے۔ جب وہ اپنی زبردست اور پراعتماد آواز سے ''ریگولیٹو'' گاتے ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ اٹلی کے لوگ جو بات کہتے ہیں سوچ سمجھ کر ہی کہتے ہیں۔

اناتولی سولوویانینکو دونیتسک کے ایک کان مزدور کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے میلان میں موسیقی کی اعلیٰ تعلیم پائی، پہلی بار ماسکو میں اپنا فن پیش کیا اور اب کیئف اوپیرا تھیٹر میں سولو گلوکار ہیں۔

دونیتسک

حال ہی میں ایک اخبار نے سولوویانینکو کو ''کان مزدوروں کا ڈیوک'' کہا ہے۔ میں اس لقب کا مخالف نہیں ہوں۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اناتولی نے اپنی زندگی کوئلے کی کان سے شروع کی اور پھر اوپیرا کے اسٹیج تک پہنچے۔ درحقیقت ان کی یا ان کے خاندان کی زندگی کوئی ڈرامائی نہیں تھی۔ بلاشبہ ہم اسے دلچسپ کہہ سکتے ہیں۔

ان کے باپ کان میں کام کرتے تھے اور ماں دو کان میں خزانچی تھیں۔ جنگ ہوئی اور شہر چھوڑنا پڑا لیکن اس کے باوجود اور دوسرے ہزاروں نوجوانوں کی طرح اناتولی بھی ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کالج میں داخل ہوں گے، اس وقت کسی کو بھی گمان نہ تھا کہ ایک دن وہ مشہور مغنی بنیں گے۔ سب یہی سمجھتے تھے کہ وہ اچھے ماہر انجینئر ہوں گے۔ میں نے لفظ ''اچھے'' اس لئے استعمال کیا کہ انہیں پولی ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں تحقیقات کرنے کے لئے وظیفہ پیش کیا گیا تھا۔

اناتولی نے انکار کر دیا۔ انہیں یقین تھا کہ ان کا مستقبل موسیقی سے وابستہ ہے۔ لڑکپن میں وہ کان مزدوروں کے شوقیہ کنسرٹوں میں گایا کرتے تھے۔ اس وقت ان کی آواز بھاری ہوا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اونچے سروں کی آواز میں بدل گئی۔ وہ کان کنی کے انجینئر تھے لیکن موسیقی دل میں چٹکیاں لیتی رہتی تھی۔

اناتولی دونیتسک ہی میں کام کرنے لگے۔ وہ گرافک جیومیٹری کے شعبے میں مددگار تھے۔ ہفتے میں دو مرتبہ وہ مشاق اوپیرا گانے والے اور تجربے کار استاد الکساندر کورا بیچینکو سے سبق لیتے تھے۔

یہ سال ان کے لئے بہت ہی مشکل تھے۔ انہیں ہر دن کو اپنے محکمے کے کام کے لئے، آواز کی تربیت اور نوجوان کمیونسٹ لیگ کی سرگرمیوں کے لئے باقاعدہ تقسیم کرنا پڑتا تھا۔

''فطرتاً میں تنہا پسند تھا۔ نوجوان کمیونسٹ لیگ نے مجھے سماجی انسان بنایا۔ میں بحیثیت فن کار اور ذمے دار شہری کے اس تنظیم کا بہت ممنون ہوں'' اناتولی نے یاد کیا۔

اس طرح آٹھ برس گزر گئے۔

جب میں اس نوجوان گلوکار کے ارد گرد شائقین کا مجمع دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں: یہ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ان کے پسندیدہ مغنی کی زندگی لاٹری کا خوش قسمت ٹکٹ حاصل کرنے والے آدمی کی طرح ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اناتولی کی زندگی مسلسل کوششوں، انتہائی قربانیوں اور ذاتی مشکلوں کا مجموعہ ہے۔ ان کے بارے میں شائقین حضرات یہ بالکل نہیں جانتے۔

میلان

1962ء اناتولی سولوویانینکو کی زندگی میں بہت ہی یادگار سال ہے۔ اس سال ان کی بے پناہ محبت بارآور ثابت ہوئی۔

اسی سال کیف کے شوقیہ کنسرٹوں میں ان کے علاقے نے بھی حصہ لیا۔ اس کے فوراً ہی بعد کیف اوپیرا تھیٹر نے سولو مغنی کی حیثیت سے کام کرنے کی انہیں پیش کش کی۔ ایک ماہ گزرا تھا کہ انہیں ماسکو کے کریملن کانگرس محل میں ٹریڈ یونینوں کے شوقیہ کنسرٹ میں گانے کا موقع ملا۔ اسی وقت ماسکو میں گانے والوں کا مقابلہ ہوا۔ اس میں کامیابی حاصل کرنے کا مطلب تھا اٹلی کا سفر۔ پانچ جگہوں کے لئے 70 گلوکار مقابلے میں شریک ہوئے۔ پانچ خوش قسمت لوگوں میں اناتولی بھی تھے۔

29 سال کی عمر میں دونیتسک کا نوجوان مغنی اب میلان کے لا اسکالا اوپیرا تھیٹر میں مشہور موسیقی کے استاد جینارو بارا سے گانا سیکھنے لگا۔

دن گزرتے گئے۔ اناتولی کا روزانہ پروگرام تقریباً ایک ہی جیسا ہوتا تھا۔ وہ صبح آٹھ بجے اٹھ کر ورزش کرتے اور پھر ناشتے سے فارغ ہوتے تھے۔ دس بجے استاد بارا سے ان کے سبق شروع ہو جاتے ___ آواز کی مشقیں۔ اس کے بعد وہ دوسرے مشہور موسیقی کے استاد کنڈکٹر پیازو کے پاس جاتے جو کبھی توسکانینی کے نائب کنڈکٹر رہ چکے تھے۔ ان سے وہ اوپیرا کے ایک رول کا گانا سیکھتے تھے۔ اگر اناتولی کوئی ہدایت بھول جاتے تو پیازو اپنا مطلب سمجھانے کے لئے سخت لیکن پُرلطف زبان استعمال کرتے تھے۔ مثلاً: ''موسیقی کے لئے یہ ورق اب میں تمہارے گلے میں اتارتا ہوں۔''

پیازو سے سبق لینے کے بعد وہ خود گھر پر مشقیں کیا کرتے تھے۔ عام طور پر ایک بجے کے قریب وہ تھیٹر کے کیفے میں اسٹیج کے مزدوروں اور کورس گانے والوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتے۔ پھر دو گھنٹے اطالوی زبان سیکھنے پر صرف کرتے تھے۔ تقریباً ہر روز شام کو انہیں تھیٹر جانا پڑتا تھا جہاں وہ فن کاروں کو مشق کرتے ہوئے یا اوپیرا گاتے ہوئے دیکھتے تھے۔

میلان میں اپنے قیام کے آخر میں اناتولی ''توسکا'' کے کوارادوسی، ''لاترادیاتا'' کے الفریدو، ''لابوھیم'' کے رودولفو، ''لوچیا ڈے لامیرمور'' کے ایڈگر، ''مامون'' کے دے گریئے اور ''ال تروباتور'' کے مانریکو کے رول گا سکتے تھے۔ یہ بڑی کامیابی تھی۔

استاد بارا سوویت یونین کے نوجوان مغنیوں کی اکثر تعریف کیا کرتے تھے۔ وہ ان سے کہتے: ''تم روسیوں کے پاس بے انتہا مسالا اور غیر محدود ذرائع ہیں۔ انہیں ترقی دینا چاہئے۔ مشکل یہ ہے کہ تمہیں مزید تربیت کی ضرورت ہے اور میرے پاس کافی فالتو وقت نہیں ہے۔''

جب اناتولی میلان سے رخصت ہونے لگے تو بارا نے کہا: ''آپ لوگ جب چاہو یہاں آسکتے ہو۔ پیسے کی فکر مت کرنا۔ آپ کے لئے روٹی اور پنیر ہر وقت حاضر ہے۔''

ماسکو

اٹلی میں تعلیم ختم کرنے کے بعد اناتولی سولوویانینکو ماسکو لوٹے اور یہاں بالشوئی تھیٹر میں شامل ہو گئے۔ اگر آپ سوچتے ہیں کہ اب اناتولی کے تمام مسئلے حل ہو گئے تو آپ غلطی پر ہیں۔ دنیا

کے کاروبار آسانی سے نہیں چلتے۔ خاص کر نوجوانوں کو کامیابی حاصل کرنے کے لئے بڑی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔

اناتولی اس حقیقت کو سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے منیجر سے کہا: "مجھے اوپیرا میں گانے کا موقعہ دیجئے ورنہ میں اسٹیج پر اداکاری بھول جاؤں گا۔"

کیا انہیں نظر انداز کیا جا رہا تھا؟ میرے خیال میں اس کا تعلق ان کے گانے سے نہیں تھا، سب انہیں اچھا گلوکار مانتے تھے۔ ان میں اداکاری کی کمی تھی۔ وہ گلوکاری اور اداکاری میں ربط قائم نہیں کر سکتے تھے۔

وجہ بہرحال کچھ بھی ہو، ایک عرصے تک اناتولی کو اوپیرا میں حصہ لینے کا موقع نہیں ملا۔ پھر حسن اتفاق کہئے کہ تھیٹر کے اونچے سروں میں تمام گانے والے بیمار پڑ گئے۔ ان حالات سے محروم نوجوان مغنی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ وہ تو یہ خواب دیکھتے تھے کہ پبلک کے سامنے آئیں اور شہرت کا راستہ ہموار کریں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خواب اب پورا ہونے ہی والا ہے۔ لیکن اناتولی کی خواہش پوری ہونے میں ہنوز مشکلیں حائل تھیں۔

تھیٹر کے منتظمین نے شہر گورکی سے ایک مغنی کو بلا لیا۔ مغنی ہوائی جہاز سے ماسکو آئے اور ٹیکسی سے اتر کر تھیٹر میں داخل ہونا چاہتے تھے کہ ان کا پیر پھسل گیا اور پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

غرضیکہ یکے بعد دیگرے ایسے افسوس ناک حادثوں کے بعد اناتولی سولوویانینکو کی قسمت کا ستارہ چمکا اور انہیں اپنی قابلیت کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا۔ انہیں بالشوئی تھیٹر کے اسٹیج پر "ریگولیٹو" کے ڈیوک کا رول ادا کرنے کو دیا گیا۔ اناتولی نے اوپیرا اطالوی زبان میں گایا۔ تماشائیوں نے جوش وخروش سے ان کی داد دی۔

1964ء کی خزاں میں بالشوئی تھیٹر نے اٹلی کا دورہ کیا۔ ساتھ اناتولی بھی تھے۔ لیکن اس بار پھر انہیں کوئی رول نہیں ملا۔ یہ سفر ان کے لئے مایوس کن ہو سکتا تھا لیکن ایک واقعہ نے ہوا ہی بدل دی۔

نیپلس

نیپلس کا ذکر کئے بغیر یہ داستان ادھوری رہے گی۔ جب اناتولی اٹلی میں تھے تو نیپلس میں

ٹیلی وژن پر گیتوں کا عالمی مقابلہ ہونے والا تھا۔ اس میں نیپلس ہر ملک کا مقابلہ کر رہا تھا اور سامعین آخری فیصلہ کرنے والوں میں تھے۔

اصول یہ تھا کہ آٹھ ملک اپنے اپنے تین گیت پیش کریں اور ان کے مقابلے میں نیپلس ایک نغمہ سنائے۔

حصہ لینے والوں میں چوٹی کے ہلکے پھلکے گیت گانے والے اور اوپیرا کے سنجیدہ گلوکار سب ہی شامل تھے۔ فیصلہ کرنے کے لئے ایک بین الاقوامی جیوری بھی تھی۔ مقابلے کے ہر دور کے بعد سننے والے اپنی رائے بھیجتے تھے۔ رائے شماری کے بعد نتیجہ ٹیلی وژن پر نشر کر دیا جاتا تھا۔

مقابلے میں ایک ملک دوسرے ملک کے بعد ہارتا گیا ــــ فرانس، پولینڈ، مغربی جرمنی۔ سوویت یونین بھی دو گیتوں میں ناکام رہا۔

نصف فائنل میں سوویت یونین کا مقابلہ برازیل (جو رقص رومبا کی دھن پر ''برازیل'' گیت گا رہا تھا) اور انگلستان ''نغمہ'' موم بتی کی روشنی میں' والز) سے تھا۔ اناتولی سولوویانینکو ''ماسکو کی شامیں'' گا کر اپنے ملک کے وقار کی مدافعت کر رہے تھے۔

اناتولی نے یہ گیت تین مرتبہ، مقابلے کے تین سلسلوں میں گایا اور ہر مرتبہ مختلف انداز سے اور مختلف سازوں کے ساتھ۔ مقابلہ ختم ہونے سے پہلے ہی گیتوں کے ملک اٹلی کی سڑکوں پر آپ اس نغمے کی دھن سن سکتے تھے۔

آخری فیصلہ کن مقابلہ روم میں ہوا۔ نیپلس اپنی تین گیتوں سے میلان، اسپین اور سوویت یونین کا مقابلہ کر رہا تھا، ان میں ''میرے سورج'' گیت بھی شامل تھا۔ ہماری امیدیں اناتولی سولوویانینکو اور ''ماسکو کی شامیں'' سے وابستہ تھیں۔

مقابلے میں پہلا انعام نیپلس کو ملا، اس کا سورج سے روشن اور گرمجوش گیت ''نیپلس کی ریپلک'' تھا۔ میلان نے سوویت یونین کی نسبت بہت کم نمبروں سے دوسرا انعام پایا۔ اور تیسرا انعام ''ماسکو کی شامیں'' گیت نے حاصل کیا۔

یہ سوویت گیتوں اور نوجوان مغنی اناتولی کی بڑی کامیابی تھی۔ وطن لوٹنے سے پہلے انہوں نے انعام یافتہ گیت کے ساتھ دوسرا روسی گیت ''وولگا کا نغمہ'' ریکارڈ کیا۔ پہلے ہی ہفتے میں ان کے 60 ہزار سے زیادہ ریکارڈ فروخت ہو گئے!

کیف

اناتولی سولوویانینکو کی پوری زندگی فن کے لئے وقف ہے۔ اگر آپ ان کے گھر آئیں تو آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ ان کے ہاں فرنیچر برائے نام ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کمرہ جتنا زیادہ خالی ہوتا ہے آواز بھی اتنی ہی زیادہ اچھی سنائی دیتی ہے۔ نشست کے کمرے میں کئی ٹیپ ریکارڈر رکھے ہیں۔ ان پر وہ اپنی آواز بار بار ریکارڈ کرتے ہیں اور پھر سن کر اسے بہتر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہیں بے شمار ریکارڈ ہیں اور ریکارڈ پلیئر بھی۔ جب ضرورت ہوتی ہے تو وہ کلاسیکی موسیقی سنتے ہیں۔ ہر چیز کا تعلق ان کے کام سے ہے ___ الماری میں کتابیں، روزانہ کا پروگرام، آرام، ورزش، کھانا، مستقبل کے منصوبے ___ ان سب کا مقصد صرف ایک ہے: آواز بہتر ہو۔

یہ مسلک انہوں نے سوچ سمجھ کر اور اپنی مرضی سے اختیار کیا ہے۔

خود اناتولی کہتے ہیں: ''اگر میں مسلسل دو دن تک موسیقی نہیں سنوں تو بیمار پڑ جاؤں۔''

میں اناتولی کے گھر تیسری مرتبہ آیا اور ابھی بہت سی باتیں کرنا باقی تھیں۔ لیکن میں اس مشہور مغنی کی بیماری کی ذمے داری اپنے اوپر لینا نہیں چاہتا تھا۔ میری خواہش پر ہم دونوں لدزارو کی آواز سننے لگے۔

''سن رہے ہیں؟'' اناتولی ذرا جذباتی ہو کر بولے۔ ''ایسے مغنی کو تو اب وہ سونے کی پالکی پر بٹھا کر سڑکوں پر گھمائیں گے۔''

''کیا آپ کا مطلب ہے کہ اچھے اوپیرا گانے والے کم ہوتے جا رہے ہیں؟''

''بالکل۔ خود اٹلی کے لوگوں نے مجھ سے کہا کہ ان کا اوپیرا اسکول گھٹیا ہوتا جا رہا ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ نوجوان جو اچھے گلوکار بن سکتے ہیں سخت پابندیوں سے گھبرا کر بھاگ جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل ہر ایک تن آسانی سے کام لینا چاہتا ہے۔ عام رویہ یہ ہے: اس قیمت پر یہ آپ ہی کو مبارک ہو۔ شاید اسی لئے اٹلی میں موسیقی کے استاد چاہتے ہیں کہ سوویت یونین کے نوجوان ان کے شاگرد بنیں۔ ہم روزمرہ کے سخت فرائض سے نہیں بھاگے اور نہ ان سے ڈرے۔ مجھے یاد ہے بارا نے کہا تھا کہ وقت آ گیا ہے کہ سوویت یونین عالمی اوپیرا اسٹیج پر سرگرمی سے حصہ لے۔ ان کے الفاظ یہ تھے: ''موسیقی کی دنیا فتح کرنے کے لئے تمہارے ملک کے پاس سب کچھ موجود ہے۔''

اناتولی سولووینیکو سنیاسی نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنی مرضی سے اپنے اوپر ڈسپلن عائد کیا ہے۔
وہ ریکارڈ بدلتے رہے۔ یہ کاروزو کی نوجوانی کی آواز تھی، اس کے آخری برسوں کی۔ پھر
ہسپانوی میگوئیل فلیتا کی باری آئی۔ اس کی نقرئی آواز دل میں پیوست ہوتی چلی گئی۔

''سامعین کو یقین نہیں آتا تھا کہ ایسی آواز بھی ہو سکتی ہے'' اناتولی نے تبصرہ کرتے ہوئے
کہا۔ ''لوگ کرسیوں کے سرے پر جھکے ہوئے بیٹھے تھے اور اس کی طرف اس طرح دیکھ رہے تھے گویا
اس نے جادو کر دیا ہو۔ کاش کہ فلیتا جیسی آواز گانے کو ملے۔ میں چھپانا نہیں چاہتا کہ اس کے ہنر پر
مجھے رشک آتا ہے، لیکن میں یہ بھی کہہ دوں کہ اسے حاصل کرنے کا راز بھی مجھے معلوم ہے۔''

جب میں اوپیرا گانے والوں کو سن رہا تھا، جن میں بڑے استاد اور عام سطح کے دونوں قسم کے
گلوکار شامل تھے تو ذہن میں اناتولی کے بارے میں پریشان کن خیالات آنے لگے: فنی تکمیل کی راہ
میں کئی ناقابل گزر رکاوٹیں ہیں۔ ''اس بلندی تک پہنچنا ممکن ہے'' میں نے کہنا چاہا۔

پھر اناتولی نے اپنا ریکارڈ بجانا شروع کر دیا جو اٹلی میں تیار ہوا تھا۔ میں ان کی آواز کو غور
سے سننے لگا۔ ہر سر بالکل صحیح تھا، ساتھ ہی توانا اور لچکیلا۔ ''واقعی غیر معمولی آواز'' ___ یہ الفاظ
رسالے ''آر۔ سی۔ اے اتالیانہ'' کے ہیں۔ اور ان سے میں پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔ میری
پریشانی دور ہو گئی۔ راستے میں کتنی ہی مشکلات کیوں نہ حائل ہوں اناتولی سولووینیکو کے پاس
چوٹی تک پہنچنے کے لئے ضرورت سے زیادہ قابلیت موجود ہے۔ میں اس موسیقار سے متفق ہوں
جس نے اناتولی کے روشن مستقبل کی پیش گوئی کی ہے۔ اور جب وہ خود کہتے ہیں کہ لا اسکالا اوپیرا
تھیٹر میں ''ریگولیٹو'' گانے کے لئے زیادہ مدت درکار نہیں ہے تو میں اس خیال کی بھی تائید کرتا
ہوں۔ لا اسکالا ہی آخر کیوں؟ اس لئے کہ اوپیرا کی دنیا میں میلان کا تھیٹر اوپیرا گانے والوں کی
مہارت کی بلند ترین آزمائش گاہ ہے۔

اناتولی کا چہرہ نوجوانوں کی طرح تازہ ہے لیکن ان کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے ہیں۔
اس لئے مجموعی تاثر عجیب سا ہوتا ہے۔ غالباً وہ میرے خیالات کو تاڑ گئے اور کہنے لگے:

''دیکھئے، وقت انتظار نہیں کرتا۔ اگر مجھے پھر اپنی زندگی کو ترتیب دینے کا موقع ملے تو میں
اسے پہلے کی طرح ہی برقرار رکھوں گا۔ اگر کوئی تبدیلی ہو گی تو بس یہ کہ لڑکپن میں مجھے موسیقی کے
مطالعے اور آواز کی تربیت کے لئے دو تین سال مل جائیں۔''

''کیا ایسے بھی لمحے آتے ہیں جب آپ شکوک اور کمزوری کے شکار ہو جاتے ہیں؟''

''بعض وقت میں اپنے پہلے پیشے کے متعلق بڑے اشتیاق سے سوچتا ہوں، اس میں ہر چیز واضح اور بے کم و کاست تھی۔ کبھی میں مکینیکل انجینئرنگ کی کتاب اٹھاتا ہوں اور اس کی ورق گردانی کرنے لگتا ہوں۔ تعجب ہے کہ ابھی تک میں کچھ بھی نہیں بھولا ہوں۔ میں نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی ہے۔ میرا ایک حصہ ہمیشہ انجینئر رہے گا۔ اسے تسلیم کرنے کے بعد مجھے سکون مل جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شکوک کے لمحات پر عبور پانے کے بعد میں گانے میں نئے جوش و خروش سے مصروف ہو جاتا ہوں۔ پریشانی قابل اجازت ہے ــــ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ناگزیر ہے ــــ لیکن صرف اسٹیج پر۔''

اناتولی پڑھنے کے بے حد شوقین ہیں۔ ان کی لائبریری ادب اور فن کے شاہ کاروں سے بھری پڑی ہے۔ اٹلی میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے فن تعمیر اور مصوری کا بھی مطالعہ کیا۔ ''مجھے دونیتسک کے اپنے ایک استاد کا مقولہ یاد ہے کہ وسیع اور عام ثقافت حاصل کئے بغیر کوئی آدمی سچا فن کار نہیں بن سکتا۔''

یہ کہنا غلط ہوگا کہ اناتولی کو صرف کلاسیکی اوپیرا سے دلچسپی ہے۔ انہیں یوکرین کے لوک گیت اور جدید سوویت نغمے بھی پسند ہیں۔ جو موسیقی وہ پیش کرتے ہیں اس کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس میں یوکرینی گیت ''میں آسمان کو تک رہا ہوں'' اور ''بے چین ہوا'' سے لے کر ''ماسکو کی شامیں'' تک شامل ہیں۔

جب میں نے اناتولی اور ان کی بیوی کو خدا حافظ کہا تو رات کافی ڈھل چکی تھی۔ (کالج میں ان کی دوستی ہوئی، بعد میں اس نے محبت کی شکل اختیار کر لی۔ محبت جدائی کی آزمائش پر پوری اتری۔ جب وہ اٹلی سے واپس آئے تو دوسرے ہی دن دونوں نے شادی رچائی۔)

باہر سڑک پر ٹھنڈک اور نمی تھی۔ اس میں اور اس دنیا میں جو میں نے ابھی ابھی چھوڑی تھی کتنا زبردست فرق تھا۔ وہاں ہم آہنگ زندگی اور فنی تخلیق تھی، سنہرے نغمے اور نقرئی آوازیں تھیں، محبت کا ماحول تھا اور جستجو اور محنت کی فضا تھی۔ یہ کہاوت بالکل صحیح ہے: اصلی خوشی اور گہرے سکون کا سرچشمہ محنت اور صرف محنت ہے۔

از: وکٹر بوخانوف

مکا بازی اور انسان کا کردار

سوویت یونین کے 6 بار چیمپین، دو مرتبہ یورپ کے چیمپین، اولمپکس کا طلائی میڈل جیتنے والے اور ویل بارکر کپ کے فاتح ___ یہ ہے سوویت مکا بازی ولیری پوپینچینکو کی کامیابیوں کی مرعوب کن فہرست۔ اپنے بارے میں وہ کہتے ہیں:

''بچپن میں میں نے کبھی مکا باز بننے کی تمنا نہیں کی۔ میں الیکساندرگرین کی کتابیں بڑی دلچسپی سے پڑھتا تھا اور بس سمندر کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ بزدلی مجھ سے کوسوں دور تھی لیکن کبھی کبھی خوف کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ مجھے بچپن کی سرگرمیاں یاد ہیں، جنہیں ہم شہر ماسکو سے باہر مضافات میں گزارتے تھے۔ بعض مرتبہ میری ماں دیر تک کام کرتی تھیں۔ جب اندھیرا ہونے لگتا تو میں باہر باغ میں آجاتا تھا۔ یہاں مجھے لمبے درختوں اور ان کے مہیب سایوں سے ڈر لگتا تھا۔ لیکن سونی جھونپڑی اور بھی کاٹے کھاتی تھی۔ سونے سے پہلے میں تمام کمروں میں بجلی کی بتیاں روشن کر لیتا تھا۔ اندھیرے میں سونے سے مجھے دہشت ہوتی تھی۔ میری ماں بھی میرے لئے پریشان رہتی تھیں خاص کر جب میں کہیں دور نکل جاتا یا تیرتے ہوئے گہرے پانی میں چلا جاتا تھا۔ کئی سال بعد جب میں تاشقند کے سوودوروف فوجی اسکول میں پڑھ رہا تھا تو میں نے انہیں ماسکو لکھا کہ میں نے مکا بازی شروع کر دی ہے۔ انہوں نے فوراً جواب میں التجا کی کہ میں مکے بازی کا خیال چھوڑ دوں اور شطرنج جیسا کم خطرناک کھیل اختیار کروں۔ میں اس خط کو کبھی نہیں بھول سکتا، وہ 30 صفحوں پر مشتمل تھا! (جہاں تک شطرنج کا تعلق ہے تو میں اس کا بھی اول درجے کا کھلاڑی سمجھا جاتا ہوں)۔ لڑکوں کی مکا بازی کے قومی مقابلے میں میں چیمپین رہا لیکن میری ماں مصر رہیں کہ میں اچھا مکا باز نہیں بن سکتا۔ پھر آہستہ آہستہ انہوں نے اپنی رائے بدلنا شروع کر دی اور میرے مستقبل کے شوقیہ اسپورٹ کو بہتر طور پر سمجھنے لگیں۔''

بہتر ہوگا کہ اب ہم ولیری کی والدہ روفینا واسیلے ونا سے ان کے بیٹے کے متعلق سنیں:

کردار کی مضبوطی

''دلچسپ بات یہ ہے کہ ولیری کی کامیابیوں نے نہیں بلکہ اس کے مسلسل اصرار نے مجھے اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا۔ اس پر میں نے کافی غور کیا۔ آخر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ اگر اس نے

آزمائے بغیر مکے بازی کو خیر باد کہہ دیا تو وہ تمام عمر اپنے فیصلے پر پچھتائے گا اور اسے سچی خوشی کبھی نہیں ملے گی۔ میں نے اس سے کہا ـــــ "اچھا، تو مکا باز بنو، لیکن بڑھیا قسم کے۔"

"لیکن ولیری نے صرف مکے بازی تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا۔ اس کی دلچسپیاں وسیع ہیں۔"

"اس نے سوودروف فوجی اسکول اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لئے لینن گراد کی بحری اکادمی میں داخل ہو گیا۔"

"جب ولیری مکا بازی کی مشق کر رہا تھا تو وہ اکثر مجھ سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ کیا کرتی، میں نے اس موضوع پر کتابیں، رسالے پڑھنا شروع کر دیئے۔ میں نے مکا بازی کے متعلق گرادوپولوف کی کتاب حاصل کر لی اور ابتدا سے آخر تک اسے پڑھ ڈالا۔ اب میں خیالی حریف سے مکا بازی، داؤ پیچ اور جبڑے کی چوٹ وغیرہ سمجھنے لگی تھی! اس کے علاوہ میں ماسکو کے اسپورٹ ہالوں کے چکر لگاتی اور درمیانہ وزن کے مکا بازوں کو دیکھ کر ان کی تمام تفصیلات ولیری کو لکھا کرتی تھی۔"

"میری بڑی خواہش تھی کہ میں مکا بازی کے حلقے میں اپنے بیٹے کو لڑتے ہوئے دیکھوں اور اندازہ لگاؤں کہ اس میں اچھے مکا باز بننے کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ لیکن جب مجھے یہ موقع ملا تو وہاں جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ گیناڈی شاتکوف کا مقابلہ کر رہا تھا اور اسی لئے میں زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اس کے استاد گریگوری کوسیکیانتس نے مجھے دلاسا دیا اور بتایا کہ یہ مقابلہ محض قوت کی آزمائش کے لئے ہے، اسے زیادہ سنجیدہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ ریڈیو پر نتیجے کا اعلان ہوا۔ میں باہر سڑک پر ولیری کا انتظار کر رہی تھی۔ آخرکار میری نظر اس پر پڑی۔ وہ سڑک کی دوسری جانب آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ شام کو گھر پر اس نے مجھ سے صرف یہ کہا کہ وہ پوائنٹ کے لحاظ سے ہارا ہے۔ اس مقابلے کے متعلق ہم نے پھر کبھی بات چیت نہیں کی۔

"1959ء کی گرمیوں میں ولیری درمیانہ وزن کی مکا بازی کے قومی مقابلے کے فائنل میں پہنچ گیا۔ اس کا مقابلہ فیوفانوف سے ہونے والا تھا۔ اس دن میں بہت سویرے اٹھی اور مرکزی بازار گئی۔ گوشت بیچنے والے گوشت لٹکا رہے تھے۔ میں نے ران کا گوشت خریدا۔ ولیری کے استاد کی ہدایت کے مطابق مجھے مقابلے سے ساڑھے تین گھنٹے پہلے گوشت کا نرم قتلہ تیار کرنا تھا۔ گھر پر میں نے اسے نمک اور مکھن کے بغیر برتن میں بھونا، تلنے کی ممانعت تھی۔ ایسا قتلہ کھانے کے بعد دیر

تک پیاس نہیں لگتی۔

"میں ریڈیو پر مقابلے کی تفصیل سن رہی تھی۔ یکا یک کومنٹری کرنے والا چلایا: "مار گرایا!" ریفری نے گننا شروع کر دیا۔ اب یہ میری برداشت سے باہر تھا۔ مقابلے کے لئے اسے خوب تیار ہونا چاہئے تھا... میں نے ریڈیو بند کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ویلری کی آواز تھی:

"اماں، میں جیت گیا!"

"جب وہ بھاگتا ہوا فلیٹ میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھوں میں چیمپین کی جرسی، میڈل اور سند تھی۔ میں نے جلدی جلدی تولیہ پانی میں بھگو کر زخموں پر رکھا اور بستر پر لٹا دیا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ بات کرنے کا موقع کہاں سے ملتا؟"

"اس کے بعد اب میں اس کا ہر مقابلہ دیکھنے جاتی ہوں۔ اگر وہ مشکل میں ہوتا ہے تو مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن اس ڈر سے کہ کہیں وہ دیکھ نہ لے میں اس کا اظہار نہیں کرتی۔"

"بعض وقت میں سوچتی ہوں: ویلری کی کامیابی کا راز کیا ہے؟ کیا یہ قدرت کی دین ہے؟ شاید... میرے خاندان میں کبھی کوئی مکا باز نہیں ہوا۔ ہاں اس کے نانا کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ مار دھاڑ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے! لیکن اس کا ویلری سے کوئی تعلق نہیں۔

"دراصل ویلری کا کردار اس سوال کا جواب دیتا ہے۔ 1960ء میں فیوفانوف سے مقابلہ ہارنے کے بعد اس نے مجھے لکھا تھا:

"اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں مکا بازی چھوڑ دوں گا تو معاف کیجئے آپ غلطی پر ہیں۔ طمانچہ سخت تھا لیکن اسے میں بھولتا جا رہا ہوں، بلکہ بھول چکا ہوں۔ آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ جیسا آپ سوچتی ہیں حالت اتنی بری نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں: مجھے ایسے طمانچے کی ضرورت تھی۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے غلطیاں کر کے کامیابی کا سہرا مخالف کے سر باندھ دیا۔ خیر۔ لیکن تلافی کے لئے کافی وقت ہے۔ آپ نا امید نہ ہوں۔ آپ کا بیٹا ضرور منزل مقصود تک پہنچے گا۔"

"وہ بہت اعلیٰ درجے کا مکا باز ہے۔ میرا مطلب اس کے فن سے نہیں ہے۔ جب اس نے یورپ کے مقابلے کے فائنل میں انگریز حریف رابنسن کو اپنے گھونسوں سے فرش پر لٹا دیا تو یہ

سب میں ٹیلی وژن پر دیکھ رہی تھی۔ پھر کیا دیکھتی ہوں کہ وہ اپنے مفتوح مدمقابل کو اٹھا کر کھڑا کر رہا ہے اور بڑی ہمدردی سے اس کا چہرہ دیکھ رہا ہے۔ یہ ہے ولیری کا کردار ___ مہربان، بے لاگ اور بے انتہا ایماندار۔''

''جاپان جانے سے پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا:

''میں اتنا چاق و چوبند پہلے کبھی نہیں تھا۔ مجھے اپنے اوپر اعتماد ہے۔''

''ولیری کے عزیز ترین دوست بوریس لاگوتین ہیں۔ انہوں نے بھی کہا:

''ہم جیتیں گے۔''

''لیکن اسپورٹ پھر اسپورٹ ہے۔ بعد میں ولیری نے مجھے بتایا کہ گھانا کے مکا باز ڈار کے سے لڑنے سے پیشتر وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اور پولینڈ کے والاسیک کا مقابلہ کرنے سے پہلے ساری رات اسے نیند نہیں آئی تھی۔ والاسیک کو وہ نہیں بھول سکتا تھا۔ دو عالمی مقابلوں میں ولیری نے والاسک کے ہاتھوں ہی شکست کھائی تھی۔''

''آخر کار، ٹوکیو میں اس نے والاسیک کو ہرا دیا اور فائنل میں پہنچ گیا۔ اب اس کا مقابلہ جرمنی کے شولز سے تھا جس نے اولمپکس کے لئے ولیری ہی کی طرح خاص ٹریننگ پائی تھی۔ لیکن ابتدائی راؤنڈ کے پہلے منٹ میں ولیری نے اسے چت کر دیا۔''

''ولیری کا ایک دیرینہ خواب پورا ہو گیا۔''

''جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں ولیری اور بھی چیزوں سے دلچسپی لیتا ہے۔ 1960ء میں اس نے مجھے لینن گراد سے لکھا: ''میں نے ڈی۔ایس۔سی کی تیاری شروع کر دی ہے۔'' جس طرح اس نے مکا بازی کے لئے محنت کی تھی اسی طرح وہ سائنس کی تعلیم پر اور اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے لئے ریسرچ پر بھی محنت کر رہا ہے۔ یہ ہے اس کا کردار۔''

ولیری کے کردار کے بارے میں ''کمسو مولسکایا پراودا'' کے نامہ نگار میخائیل استرلس نے بھی بہت کچھ لکھا ہے جو اولمپک کھیلوں کے وقت ٹوکیو میں تھے۔

دوستی کا اظہار

ٹوکیو میں میں فائنل کے مقابلے کبھی نہیں بھولوں گا۔ میں کوراکوئین ہال میں داخل ہوا اور سو

ویت مکا بازوں کا کمرہ تلاش کرنے لگا۔ اتنے میں قریب ہی قہقہہ سنائی دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ولیری پوپینچینکو کوئی پُر لطف قصہ سنا رہے ہیں۔ اولمپک کھیلوں کے دوران ان کی حالت ایسی ہی رہی۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ کب ہنسنا چاہئے اور کب سنجیدہ رہنا چاہئے۔

''اولیگ! ذرا اور'' ولیری نے آہستہ سے کہا۔ اور جب یہ اعلان ہوا کہ مقابلہ اولیگ گریگوریف جیت گئے ہیں تو ولیری چلائے ''شاباش''۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے سوویت مکا باز کو ''ناقابل شکست'' اطالوی حریف فرانکوزورلو پر فتح حاصل کرنے کے سلسلے میں مبارکباد دی۔

''جب میکسیکو کے مینڈوزا نے اولیگ کو شکست دی تب بھی ولیری پہلے شخص تھے جو اپنے دوست کو تسلی دینے آئے۔ جب بھی دوستوں کو ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے ولیری ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔''

ٹوکیو میں ولیری کے لئے مکا بازی آسان نہیں تھی۔ کون بتا سکتا ہے کہ ڈارکے اور والاسیک کو ہراتے وقت ان پر کیا بیتی؟

پولینڈ کے اس مکا باز سے ولیری کی پہلی مٹ بھیڑ 1957ء میں ہوئی تھی جب ولیری 19 برس کے تھے۔ پولستانی جیت گیا لیکن اس نے کہا کہ اس کا مدمقابل ''ایسا مکا باز ہے جو بڑے امکانات رکھتا ہے۔'' لودز میں 1963ء میں والاسیک نے دوسری مرتبہ ولیری کو شکست دی۔

اس وقت پولینڈ کے اسپورٹ نامہ نگار یرژی ایواشکیوچ نے ولیری کے بارے میں لکھا تھا:

مقابلے کے بعد میں پیشیکوفسکی اور والاسیک کے پاس آیا جو اپنی بیویوں کے ساتھ میز کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ وہیں ولیری بھی موجود تھے۔ دلچسپ گپ شپ ہو رہی تھی۔ ولیری پُراسرار انداز میں مسکرا رہے تھے گویا کہہ رہے ہوں کہ مقابلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے!

''والاسیک ذرا ماسکو پہنچنے تک انتظار کرو۔ وہاں میں تمہیں دکھاؤں گا۔''

''دیکھتے ہی کون کس کو دکھاتا ہے'' پولستانی نے مذاق سے جواب دیا۔ رخصت ہوتے وقت وہ دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے۔ وہ آپس میں اتنے ہی پُرخلوص دوست ہیں جتنے کہ مقابلے کے وقت سخت حریف۔

جب ٹوکیو میں ان کا مقابلہ ہوا تو والاسیک نے تسلیم کیا: ''میں کچھ نہیں کر سکتا۔ ولیری تم مجھ سے میلوں آگے ہو۔''

ویلیری کی داستان ان کے استاد گریگوری کوسیکیانتس کا ذکر کئے بغیر ادھوری رہ جائے گی۔
ان کے بارے میں ویلیری کی یہ رائے ہے:

''میں گھبرانے لگتا ہوں اگر مقابلے کے دن ناشتے کے بعد ان کا رقعہ میز پر نہیں ملتا، یا ان کا عجیب وغریب خواب نہیں سنتا (''ویلیری تم سوچ نہیں سکتے کہ پچھلی رات میں نے خواب میں کیا دیکھا! تم اخروٹ توڑ رہے ہو۔ ایک اخروٹ دوسرے سے زیادہ سخت ہے لیکن تم سب کے سب توڑ ڈالتے ہو'')، یا مقابلے سے دو تین گھنٹے پہلے ان سے حسب معمول یہ جملہ نہیں سنتا: ''چلو، اب ذرا اپنا بدن ڈھیلا کرنا شروع کر دو۔'' بہت سے مکا باز مقابلے کے وقت اپنے استادوں کی قربت کو اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن میرے لئے انتہائی ضروری ہے کہ کوسیکیانتس رسوں کے پیچھے کونے میں کھڑے ہوں اور وقفے کے وقت میرے چہرے پر سے پسینہ پونچھیں اور مشورہ دیں۔ میں ایمانداری سے کہتا ہوں کہ ان کے بغیر میں یہ کامیابیاں حاصل نہیں کر سکتا تھا۔''

اور گریگوری کوسیکیانتس اپنے شاگرد کے بارے میں کہتے ہیں:

اچھا انسان

24 اکتوبر 1964ء میری زندگی میں سب سے زیادہ یادگار دن ہے۔ اس دن ٹوکیو میں شوقیہ مکابازی کی عالمی انجمن نے متفقہ طور پر اعلان کیا تھا کہ ویلیری ویل بارکر کپ کا فاتح ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ویلیری پوپنچینکو کو باقاعدہ دنیا کا بہترین شوقیہ مکاباز تسلیم کر لیا گیا۔

میں وہ منظر بھی نہیں بھولوں گا جب انجمن کے صدر لارڈ رسل نے جو بہت کم گو انسان ہیں ویلیری کو ویل بارکر کپ پیش کیا تھا۔ ویلیری انگریزی زبان میں ان کا شکریہ مشکل سے ختم کر پایا تھا کہ لارڈ رسل نے گرمجوشی سے اسے سینے سے لگایا اور روسی رسم کے مطابق تین بار بوسہ لے کر کہا:

''اگر تم میرے بیٹے ہوتے تو مجھے اس پر فخر ہوتا!''

میں بھی ویلیری کو اپنا بیٹا ہی سمجھتا ہوں۔ بلا مبالغہ میں کہہ سکتا ہوں کہ خود ویلیری اپنے بارے میں اتنا نہیں جانتا جتنا کہ میں جانتا ہوں۔ مکابازی کے حلقے میں وہ مصمم اور دلیر ہوتا ہے لیکن اصل زندگی میں وہ شرمیلے پن کی حد تک منکسر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ روزانہ ٹریننگ کے بعد وہ اس کی کھڑکی کے نیچے گھنٹوں کھڑا رہتا تھا۔ لڑکی کو باہر بلانے میں اسے شرم آتی تھی!

آدمی کا کردار جیتنے کے بجائے ہارنے کے وقت زیادہ واضح نظر آتا ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ہارنے والا مکا باز ریفری، استاد، غرضیکہ کوئی بھی آس پاس ہو اسے اپنی شکست کا ذمے دار ٹھہراتا ہے لیکن اپنی غلطی نہیں دیکھتا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ ولیری اس معاملے میں بالکل مختلف ہے۔ مجھے یاد ہے جب وہ لودز میں والا سیک سے ہارا تھا۔ جوں ہی ریفری نے اپنے فیصلے کا اعلان کیا ولیری آگے بڑھا اور تمام تماشائیوں کے سامنے والا سیک کا ہاتھ اوپر اٹھایا، پھر وہ اس کے استاد اشتام کے پاس گیا اور انہیں مبارکباد دی۔

مکا بازوں کو وزن کے اعتبار سے دس گروپوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشکل کام دوسرے درمیانہ وزن والوں کا ہوتا ہے (75 کلوگرام)۔ اس گروپ کے مکا باز کو ہلکے وزن والے مکا باز کی طرح پھرتیلا اور تیز ہونا چاہئے اور بھاری وزن کے مکا باز جیسا جملہ کرنے میں قوی اور طاقت ور بھی۔ اس گروپ میں ہر سال نئے نئے چیمپین ابھرتے ہیں۔ وزن کے اسی گروپ میں سوویت یونین نے بہترین مکا باز پیدا کئے ہیں ___ کونستنتین گرادوپولوف، یوگینی اگورینکوف اور گینادی شاتکوف۔ لیکن ان میں کوئی بھی ولیری کی طرح چھ بار مسلسل قومی چیمپین نہیں رہا۔

ولیری کے لئے میں کیا تمنا کرسکتا ہوں؟ سب سے پہلے یہ کہ وہ آخر تک چیمپین اور مکا بازی کے حلقے کو خدا حافظ کہنے تک غیر مفتوح رہے۔ میں چاہتا ہوں کہ علمی میدان میں بھی اسے کامیابیاں حاصل ہوں۔ اس نے ڈی۔ ایس۔ ی کی ڈگری حاصل کرلی ہے۔ مجھے امید ہے کہ مستقبل میں وہ مزید ترقی کرے گا۔

مجھے صحیح سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ میں محض مشہور مکا باز ولیری کی قدر نہیں کرتا جو اپنے مدمقابل کو آن کی آن میں فرش پر لٹا دیتا ہے بلکہ اس مکا باز ولیری انسان کی قدر کرتا ہوں جس نے اپنی محنت سے ڈی۔ ایس۔ ی کی ڈگری بھی حاصل کی اور جس کی دیانت، نیکی اور ایمانداری پر میں ہر حالت میں اعتماد کرسکتا ہوں۔

دسمبر 1965ء میں نوجوان کمیونسٹ لیگ کی مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں ولیری پوپنچینکو نے یہ ناقابل فراموش الفاظ کہے تھے:

"ہم اکثر بڑی بڑی کامیابیوں کے سلسلے میں کھلاڑیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ بات قابل فہم

بھی ہے اور ضروری بھی اس لئے کہ اعلیٰ نتیجوں کے لئے جدو جہد کے بغیر اسپورٹ بے معنی ہو جاتا ہے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اسپورٹ مین سماج کے لئے کئی لحاظ سے زیادہ مفید ہو سکتا ہے___ سائنس داں، انجینئر یا موجد کی حیثیت سے... اسپورٹ کے تنگ حلقے میں رہنا بے جا ہے۔ ہر آدمی میں بے شمار پوشیدہ صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ اسے محدود اور یک طرفہ شخصیت رکھنے کے بجائے صلاحیتیں اجاگر کرنا چاہئے اور اپنی شخصیت کو مربوط طریقے سے بھرپور بنانا چاہئے۔ یہ نہیں بھولئے کہ ایک نہ ایک دن اسپورٹ کو خیر باد کہنا پڑتا ہے۔ تو سوال پیدا ہوگا کہ پھر سماج میں کھلاڑی کیا پوزیشن اختیار کرے اور کس طرح اپنا تجربہ نئی نسل کے حوالے کرے۔"

پہلی جگہ حاصل کرنا... ویلیری کی یہ خواہش پوری ہوگئی۔ یہ بات بالکل واضح ہے اگر وہ سچے معنوں میں انسان نہ ہوتے تو کبھی وہ یہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے متعلق وہ خود کہتے ہیں:

"مدت ہوئی وہ زمانہ گزر چکا جب میں مکا بازی کو اپنی مدافعت کرنے یا کسی مصیبت زدہ لڑکی کو بچانے کا ذریعہ خیال کرتا تھا۔ یقین کیجئے کہ باکسنگ کے حلقے سے باہر میں نے کبھی اپنا ہنر نہیں دکھایا۔ میں ایمانداری سے کہہ سکتا ہوں کہ مکا بازی نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے اور میرا کردار ڈھالنے میں بڑی مدد دی ہے۔ جو حضرات مکا بازی کو وحشیانہ کھیل سمجھتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ ان کے برعکس میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دوسرے کھیلوں کے مقابلے میں مکا بازی سے انسان زیادہ تحمل، قوت ارادی اور آزادی سیکھ سکتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ بائرن اور ھیمینگوے جیسی شخصیتیں مکا بازی کی شوقین تھیں۔

"مکا بازی نے مجھے جرأت کا مطلب سمجھایا___ نہ صرف جسمانی لحاظ سے بلکہ اس پہلو سے بھی کہ اپنی رائے پر کس طرح قائم رہنا چاہئے۔ اور مکہ بازی نے ہی مجھے ایک سچا دوست دیا۔ میرا مطلب بوریس لاگوتین سے ہے۔"

"جب میں جیتتا ہوں تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔ یہ بات میں نے کبھی نہیں چھپائی۔ لیکن میرا عقیدہ ہے کہ صرف دیانت سے لڑنے کے بعد ہی آدمی کو جیتنے اور پہلی جگہ حاصل کرنے کا حق ملتا ہے۔ یہ بھی میں نے مکا بازی سے سیکھا ہے۔"

از: یوری زیر چانینوف

جمناسٹک اور حسن

سوانح حیات کا خاکہ

تتیانا وکٹر وونا کرافچینکو

1940ء میں ایک مزدور گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ماسکو کی رہنے والی ہیں۔
جسمانی ورزش کے انسٹی ٹیوٹ (ماسکو) سے ڈگری حاصل کی۔ آج کل بچوں کے اسپورٹ اسکول میں استانی ہیں۔

شادی شدہ ہیں۔ خاوند سوویت فوج میں افسر ہیں۔
تتیانا کرافچینکو فنی جمناسٹک کی ماسٹر ہیں، وہ سوویت یونین کی ایک بہترین جمناسٹک کرنے والی خاتون تسلیم کی جاتی ہیں اور عالمی مقابلے میں دوسرا انعام حاصل کر چکی ہیں۔
پسندیدہ چیزیں: فنی جمناسٹک۔ موسیقی۔ سینما۔ مایاکوفسکی کی شاعری۔ آب دوز ماہی گیری۔ گرمیاں۔

غیر پسندیدہ چیزیں: ریاکاری۔ جاز موسیقی (پُرشور)۔ سردیاں۔

مزید تفصیلات

"تانیا، اس خاکے میں تو آپ کی زندگی اور کردار کے محض خدوخال ہی نظر آتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو ان میں میں کچھ رنگ بھر دوں...
"ٹھیک ہے؟ تو سب سے پہلے یہ کہ آپ بہت حسین ہیں۔"
"جی نہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔"
"آپ ناراض نہ ہوں۔ میرا مقصد تعریف نہیں بلکہ ایک حقیقت بیان کرنا ہے۔"
"جی نہیں، دیکھئے نا میری ناک بہت بڑی ہے اور دھانہ کتنا چوڑا ہے۔"
"اول یہ کہ ہر شخص اپنے چہرے مہرے کو بدصورت خیال کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ میں بدلنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ اور یہ صرف روشنی اور موسیقی کے ماحول میں جمناسٹک تک محدود نہیں ہے۔ یہ میں اس وقت بھی دیکھ رہا ہوں۔ کچھ ہی دیر پہلے آپ ایک نوجوان گرہستن نظر آ رہی تھیں اور بڑے پُرسکون انداز میں کمرے کی چیزیں سلیقے سے جما رہی تھیں... پھر آپ

سوفے پر بیٹھ گئیں اور سر آگے کو جھکائے ہوئے ایک دو سیکنڈ خاموش رہیں۔ اس کے بعد اپنے اور کام کے بارے میں اتنے جوش وخروش سے باتیں کرنے لگیں۔ کتنا تفاوت ہے!

''جب آپ تماشائیوں کے سامنے جمناسٹک کرتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماحول سے بالکل بے خبر ہیں اور آپ کی پوری ہستی سمٹ کر اندرونی ''میں'' کے اندر آ گئی ہے ــــ اسپورٹ مین کے جوہر میں۔

''یاد ہے آپ کو جب آپ نے بلانٹر کی موسیقی ''اسپورٹ کا مارچ'' پر گیند کے ساتھ حسن افزا ورزش کی تھی۔ اس کا موضوع خوشی تھا۔ شادمانی! اس کا مجموعی تاثر چکاچوند ڈالنے والی مسکراہٹ تھا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اسپورٹ بے حد پسند کرتی ہیں اور آپ کا مقصد اسپورٹ کے حسن اور رعنائی کو جمناسٹک کے روپ میں پیش کرنا تھا۔ خاص طور پر آپ اسپورٹ کے مخصوص پہلوؤں کو حسن افزا ورزش کی شکل میں ڈھالنا چاہتی تھیں ــــ مثلاً والی بال کو۔ فرش سے گیند کے ٹکرانے کی کھوکھلی آواز، جال کے اوپر جسم کا اٹھنا، پُرجوش دلچسپ مقابلہ۔''

''یہ ورزش زیادہ کامیاب نہیں رہی۔ مشکل یہ تھی کہ میں والی بال اچھی طرح کھیلنا نہیں جانتی۔''

''صحت پسندی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ جی؟ آپ کو ایسی چیزیں نظر آتی ہوں گی لیکن مجھ جیسے تماش بین کو نہیں دکھائی دیں۔ اس میں اہم چیز کامیابی کے لئے جدوجہد اور اپنے جسم پر مکمل قابو تھا۔ کھیل والی بال ہو یا پنگ پانگ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''دوسری حسن افزا ورزش کو لیجئے ــــ موسیقی کے ساتھ ورزش۔ جی ہاں، لستوف کا مشہور گیت ''تچانکا'' (مشین گن بردار گھوڑا گاڑی) تھا۔ مجھے یاد ہے آپ نے ایک بار کہا تھا کہ اس کے لئے آپ پہلے ذہنی تیاری کرتی ہیں اور اسے اپنا خاص رنگ دیتی ہیں۔ آپ گزرگاہوں میں اس طرح بیزار اور خاموش گھومتی ہیں کہ کسی کو آپ کے قریب آنے کی جرأت نہ ہو۔ مظاہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے ہاتھ میں اسکپنگ رسی نہیں تھی بلکہ تیغ بران چمک رہی تھی یا مشین گن شعلے اگل رہی تھی۔ ہم چلبلے اشارے کرنے والی خاتون کے بجائے سرخ فوج کے ایک ایسے سپاہی کو دیکھ رہے تھے جو میدان جنگ میں کود رہا ہے اور جسے آگ اور دھوئیں، آندھی اور طوفان نے گھیر لیا ہے۔ ایسے وقت آپ اپنے آپ سے قریب تر ہوتی ہیں۔

''میں اسپورٹ کی اصطلاحیں استعمال کرنے کے قائل نہیں ہوں۔ پھر بھی آپ کا کیا خیال

ہے "فری اسٹائل ورزش" یا "آزاد طرز کی ورزش" جیسے فقرے بے معنی چیز نہیں ہیں؟ مجھے یاد ہے کہ آپ لیسٹ کی موسیقی پر اسی قسم کی ورزش کر رہی تھیں۔ اس وقت مجھے ایک منظر یاد آیا جس نے مجھے یہ سمجھنے میں مدد دی کہ آپ کس بات کا اظہار کرنا چاہتی ہیں۔ میں کونتسیوا میں آپ کے گھر میں تھا۔ ایک ریکارڈ بج رہا تھا۔ گانے والے کی آواز بھاری اور چیختی ہوئی تھی۔ شاید ریکارڈ پرانا ہو۔ آپ کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی خاموشی سے موسیقی سن رہی تھی۔ آپ کی پیشانی کھڑکی کے شیشے سے لگی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آپ کے خمیدہ سر اور پُرسکون منحنی ہاتھوں میں موسیقی اتر آئی ہے۔ یہ صدائے بازگشت اور ہم آہنگی تھی۔"

"یہ سکون کی کیفیت نہیں تھی۔ آپ غلطی کر رہے ہیں۔ لیسٹ کی موسیقی میں سکون کے لمحے بہت کم ملتے ہیں۔ اس کی موسیقی تو مسلسل جدوجہد کی موسیقی ہے۔ زندگی بھی ایسی ہے ___ جدوجہد اور کبھی کبھی سکون کے لمحے۔"

"اب میں سمجھا کہ انسٹی ٹیوٹ کے لڑکے آپ کے پاس آتے ہوئے کیوں ڈرتے تھے۔ وہ تندرست، خوبصورت، فیشن ایبل کپڑے پہننے والے نوجوان تھے اور ناچنا بھی خوب جانتے تھے۔ انسٹی ٹیوٹ کی دوسری لڑکیاں انہیں پسند کرتی تھیں۔ لیکن آپ نارضامندی کی نظروں سے بیچاروں کو ڈرا دیتی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ تم غیر سنجیدہ لوگ نالائق ہو!"

"کیا میں ایسی نظر آتی تھی؟ جانتے ہیں آپ، میں حیرت کرتی تھی کہ کوئی مجھے گھر تک چھوڑنے کی پیش کش نہیں کرتا تھا۔ ہمیشہ میں گھر تنہا آیا کرتی تھی۔"

"برسبیل تذکرہ، آپ کے شوہر والنتین نے مجھے بتایا کہ شروع میں وہ آپ سے ملتے ہوئے کتنے شرماتے تھے حالانکہ جب آپ انسٹی ٹیوٹ کے پہلے سال میں تھیں تب ہی سے وہ آپ کو پسند کرنے لگے تھے۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ پہلی بار دیکھتے ہی آپ کی بھوری آنکھیں انہیں خوابوں میں نظر آنے لگی تھیں۔

"اگر پہلی نظر میں محبت واقعی کوئی چیز ہے تو یقیناً آپ نے بھی کچھ تو محسوس کیا ہوگا؟ اب آپ خوش ہیں؟"

"بہت زیادہ، ان پورے پانچ برسوں میں۔ ایک بات جو مجھے پریشان کرتی رہتی ہے یہ ہے کہ میں اچھی گرہستن نہیں ہوں۔ مجھے کھانا پکانا نہیں آتا۔ میں سیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

''وہ کیسے؟''

''میں کتابیں پڑھ رہی ہوں۔ آدمی اور کیسے سیکھتا ہے؟''

''اسکول کے زمانے میں تتیانا ہوشیار طالب علم سمجھی جاتی تھیں۔ ماں نے چاہا کہ وہ اسکول میں سلائی کا کام بھی سیکھیں لیکن ایسی باتوں سے ان کی دلچسپی بہت کم تھی۔ اس کے بجائے تتیانا نے فنی جمناسٹک سیکھنا شروع کر دی۔ شاید بنیاد ہی ٹیڑھی پڑی۔

''ہم اپنی زندگی کی کسی نہ کسی منزل میں سوچتے ہیں: اگر میں نے پھر سے زندگی شروع کی تو کیا کروں گا؟ کیا میں یہی راہ اختیار کروں گا یا کوئی دوسری؟ تتیانا، آپ نے ڈاکٹر بننے کا بھی خواب دیکھا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو فلم میں حصہ لینے کے لئے بھی مدعو کیا گیا تھا، آپ آزمائش میں کامیاب رہی تھیں۔ کیا کبھی آپ اپنی موجودہ پسند پر پچھتاتی ہیں؟''

''بالکل نہیں۔ میں اپنا موجودہ کام کسی دوسرے کام سے کبھی نہیں بدلوں گی۔ آخر کاہے کو!''

''تتیانا، ایک اور سوال۔ آپ بحیثیت استانی کے اپنے آپ کو کیسا سمجھتی ہیں؟''

''غالباً لڑکیاں مجھے توجہ سے نہیں سنتیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مجھے مغز چاٹ خیال کرتی ہوں۔ میری رائے میں اہم چیز انہیں سجاو اور لباس کا ذوق سکھانا ہے ___ صرف جمناسٹک کے لئے ہی نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں بھی۔''

''میں نے دیکھا ہے کہ لڑکیوں کو سبق پڑھاتے وقت آپ کی آواز بہت سنجیدہ ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسٹی ٹیوٹ میں جو چیزیں آپ نے سیکھی تھیں انہیں آپ احتیاط سے دھرا رہی ہیں: ایک، دو، تین۔ مڑو، دو، تین۔ گیند پکڑو، تین۔ جلدی نہ کرو، تین... لیکن جب مشق کے وقت لڑکیوں کو خود دکھاتی ہیں تو آپ کا کوئی ثانی نہیں۔ آپ ہنستی ہیں اور سمجھاتی ہیں (بلکہ صحیح یہ ہوگا کہ لڑکیوں کو محسوس کرانا چاہتی ہیں): ''گیند سے دوستی کرو، اسے اپنا مخالف مت بناؤ۔ اسے رام کرو۔ تم اسے زندہ چیز سمجھو۔ ٹھیک ہے؟ اب مجھے دیکھو۔''

''سبق اس وقت ختم ہوتا ہے جب ہر لڑکی اس ورزش کا مظاہرہ کرتی ہے جو وہ دن میں سیکھ چکی ہے۔ اور یہ تب ہی ہوتا ہے جب وہ پورے نمبر حاصل کرتی ہے۔''

''ٹھہرو، ٹھہرو! مظاہرہ ختم کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ سیدھی کھڑی ہو اور ججوں کا شکریہ ادا کرو۔ پھر تم جا سکتی ہو۔ اچھا تو اب پھر شروع کریں، پھر''...

''بعض لڑکیاں چڑ کر کہتی ہیں: ''ہونہہ۔ یہ مشق نہیں ہوئی، اولمپکس کا مقابلہ ہو گیا!''

''اور تتیانا وکٹر و ونا مسکرا دیتی ہیں ___ بڑی متانت سے لیکن ذرا روکھے پن کے ساتھ ...

اور کہتی ہیں:

''ایک مرتبہ اور ... تصور کرو کہ تم اہم مقابلے میں حصہ لے رہی ہو۔ ترقی کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ ہر مشق کو تم مقابلے کی تیاری سمجھو۔''

''اسکول کے بعد آپ گھر پیدل جاتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو تنہا سوچتے ہوئے پیدل چلنا پسند ہے۔ آپ کے گھر میں میں نے نئے سال کا کارڈ دیکھا ہے جسے آپ کی ایک عزیز ترین دوست لیلیا ظلمت دینووا نے بھیجا تھا۔ اس کارڈ میں گھنی جھاڑیاں دکھائی گئی ہیں اور آگے ایک تنہا شخص جا رہا ہے۔ مماثلت بالکل ظاہر ہے۔ لیکن اس ڈر سے کہ اسے نظر انداز نہ کر دیا جائے لیلیا نے اس شکل کی طرف کھینچ کر لکھا ___ ''تتیانا، یہ تم ہو۔'' مجھے معلوم ہے کہ جب آپ جنگل میں تنہا چہل قدمی کے لئے جاتی ہیں تو اکثر ساتھ ٹرانسسٹر لے جاتی ہیں۔ لیکن آپ بہت کم اسے بجاتی ہیں۔ جی ہاں، موسیقی ایسی ہو کہ وہ درختوں کے نرم جھونکوں، بادلوں کی پرواز اور گھاس کی بالیدگی کے ساتھ سر ملائے۔ وہاں شور و شغب والا جاز بھلا کون سننا پسند کرے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ آدمی اپنے آس پاس کی چیزیں دیکھے اور سوچے۔''

''آپ کیا سوچتی ہیں؟''

''پتہ نہیں۔ دنیا کے بارے میں، اپنے بارے میں بھی۔''

''ایسی باتوں کو الفاظ میں بیان کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ میٹرو میں آپ اکثر لوگوں کے چہرے دیکھتی ہیں اور اندازہ لگانے کی کوشش کرتی ہیں کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ یہ نوجوان لڑکا خوش نظر آتا ہے، وہ عورت غمگین ہے، یہ مرد جس کے ہاتھ میں پورٹ فولیو ہے پریشان دکھائی دیتا ہے اور کونے میں بیٹھی ہوئی وہ لڑکی کس خیال میں ڈوبی ہوئی ہے؟ شاعری؟ ریاضی کا فارمولا؟ یا محبت؟ تتیانا، سچ بتایئے جو آپ حاصل کر چکی ہیں اس سے آپ مطمئن ہیں؟''

''واقعی نہیں۔ میں اکثر محسوس کرتی ہوں کہ میری دلچسپیاں زیادہ وسیع نہیں ہیں۔ مثلاً میں کم پڑھتی ہوں۔''

''کیا پڑھنے کے لئے آپ کو کافی وقت نہیں ملتا؟''

''وقت کی بات بے کار ہے۔ آدمی جب چاہے اور جہاں چاہے پڑھ سکتا ہے... بس میں، ٹرین میں، ہر جگہ۔ میرے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ میں کھڑکی سے درخت دیکھنے لگتی ہوں، خاص کر سردیوں میں جب وہ ترشے ہوئے بلور جیسے نظر آتے ہیں اور ہوا سے ان کی ٹہنیاں جھومتی ہیں۔''

''آپ کا کیا خیال ہے، کیا آپ جمناسٹک کے ذریعے فطرت کا اظہار کر سکتی ہیں؟''

''ظاہری معنوں میں نہیں۔ یہ بہت پیچیدہ معاملہ ہے۔ اگر ہم فطرت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو پہلے ہمیں اس کا مشاہدہ کرنا چاہئے، اسے محسوس کرنا چاہئے۔''

''آپ نے درست کہا۔ زندگی کو قریب سے دیکھنا چاہئے__ شاخوں کی سرسراہٹ میں، لوگوں کی آنکھوں میں، گزرتی ہوئی موٹر کی چمک میں، پرندوں کی پرواز میں اور نالی پر چپکے ہوئے برف میں۔ اسے آپ شعروں اور سمندر کے طوفان میں، موسیقی اور پیروں تلے برف کی چرمر میں اور بچوں کی آوازوں میں سن سکتی ہیں۔ اس کے بعد تشریح کی باری آتی ہے۔ کسی چیز کو دیکھنے کے بعد ہی آدمی اس کے بارے میں گا سکتا ہے۔ اور تشریح کرنا فن کار پر منحصر ہے۔ جہاں تک آپ کا تعلق ہے تو یہ فن کارانہ جمناسٹک ہے۔ ٹھیک ہے نا؟''

''بالکل۔ میرا مطلب بھی یہی تھا۔''

''تتیانا، اب میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے آپ کی دوسری دلچسپیوں کے متعلق بہت کم بات کی ہے۔ آپ کے جمناسٹک کے مظاہرے، کامیابیاں، آپ کی پسند کا لباس اور بالوں کا فیشن، آبدوز ماہی گیری__ یہ سب آپ کی روح کا عکس ہیں۔ لیکن فن سے آپ کی محبت سب پر بھاری ہے۔ اچھا ہے، دلچسپیاں وسیع ہوں، ہمہ پہلو شخصیت کی بات بھی ٹھیک ہے۔ لیکن مبارک ہیں وہ لوگ جن کے لئے ان کا محبوب کام ایک رنگ برنگی، روشن اور چمکیلی دنیا ہے۔

انفرادی انداز

ماریا لسیتسیان__ سوویت یونین کی معزز ٹرینر:

''تتیانا کراچینکو ہم آہنگی کے قانون اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا جمالیاتی ذوق انتہائی گہرا اور تخلیقی تصور بے حد بلند ہے۔ پہلے تتیانا موسیقی پر پوری طرح حاوی نہیں تھیں لیکن

اب وہ اسے سننے اوراس کے متعلق سوچنے پر کافی وقت صرف کرتی ہیں۔"

والینٹینا باتاین___

سوویت یونین کی فنی جمناسٹک کی فیڈریشن کی سکریٹری:

"تتیانا کراچینکو بہت محنتی، مستقل مزاج ہیں اوراپنے فن سے محبت کرتی ہیں۔ پراگ میں عالمی مقابلے کے وقت ایک افسوس ناک حادثہ پیش آیا۔ بالکل آخری دن جب لودمیلا سوینکووا گیند کے ساتھ جمناسٹک کررہی تھیں تو وہ ناکام رہیں۔ اس سے پہلے ان کی پوزیشن دوسری تھی اور تتیانا کی پانچویں۔ ہر شخص فکرمند تھا۔ اگر مقابلے میں کسی جمناسٹک کرنے والی کو حادثہ پیش آتا ہے تو اس کا اثر اس کے ساتھیوں پر بھی پڑتا ہے۔ لیکن تتیانا نے اچھا مظاہرہ کرنے پر اپنا پورا زور لگا دیا___ آزادطرز کی ورزش میں انہیں سونے کا تمغہ، اور گیند کی ورزشوں میں چاندی کا تمغہ ملا اور مجموعی نتیجوں کے لحاظ سے انہوں نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔"

مستقبل

"آنے والے برسوں میں آپ اپنے لئے کیا چاہتی ہیں؟"

"کامیابی حاصل کرنا جہاں میں ابھی تک ناکام رہی ہوں۔ میری یہ بھی تمنا ہے کہ جمناسٹک میں میں ایک نیا عنصر شامل کروں۔ یہ عنصر ایسا ہوگا جسے کسی نے ابھی تک پیش نہیں کیا ہے۔ اسے میں محسوس کررہی ہوں لیکن فی الحال وہ ایک خیال ہی ہے۔"

"دس سال کے بعد آپ کیا پسند کریں گی؟"

"دس سال کے بعد میں ان لڑکیوں سے مقابلہ کرنا چاہوں گی جنہیں میں آج کل سکھارہی ہوں، اوران کی کامیابی پرخوش ہوں گی۔"

از: استانسلاف توکاریف

پرانے معمے کا حل

"تبلیسی یونیورسٹی کے شعبہ علمی ریاضی کے طالب علم اور نوجوان کمیونسٹ لیگ کے ممبر تیموراز وپچوادزے نے لیوویل فارمولے کو صحیح ثابت کر دیا جو ایک سو برس سے سائنس دانوں کے لئے معمہ بنا ہوا تھا۔"

(اخبار سے ایک خبر)

یہ سیدھا سادھا اعلان 1965ء میں اخباروں میں شائع ہوا تھا۔ اس کا تعلق تیموراز وپچوادزے کے ریاضی کے میدان میں ایک غیر معمولی دریافت سے تھا جب وہ یونیورسٹی کے چوتھے سال میں پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ انیسویں صدی کے فرانسیسی ریاضی داں جوزف لیوویل کا فارمولہ صحیح ہے۔

فرانسیسی سائنسی اکادمی کے ممبر جوزف لیوویل اپنے زمانے کے زبردست ریاضی داں تھے۔ انہوں نے بیضوی عمل کا نظریہ اور جامد میکینکس کا بنیادی اصول پیش کیا، وغیرہ۔ وہ ریاضی کے متعلق ایک رسالہ "ژورنال دے ماتیماتیک پیورا اے اپلیکے" بھی پیرس سے شائع کیا کرتے تھے۔ اسی رسالے میں انہوں نے 1865ء میں اپنی تصنیف "قدرتی ہندسوں کو دو درجی شکلوں میں پیش کرنے کے متعلق" شائع کی۔ انہوں نے یہ بات پوری طرح ثابت نہیں کی بلکہ ہندسوں کے اس نظریے کے متعلق کئی غیر ثابت شدہ فارمولے آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ دیے۔

کیا وہ اپنے ہم عصروں کو چیلنج دے رہے تھے یا غیر معمولی تخلیقی قوت رکھنے والے انسان کی حیثیت سے دنیا کے ساتھ دل لگی کر رہے تھے؟ اس کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ بہر حال ایک سو سال کے بعد 1965ء میں جب "لیوویل کے بعض فارمولوں کے متعلق" کے عنوان سے ایک رپورٹ پہلے طالب علموں کی کانفرنس میں اور پھر تبلیسی یونیورسٹی کی عالموں کی کونسل میں سنائی گئی تو ان کا ثبوت فراہم ہوا۔

یونیورسٹی کے طالب علم تیموراز وپچوادزے کے ہاتھ یہ ایک صدی پرانا معمہ کیسے آیا؟ اتفاق سے؟ جی ہاں، اگر ہم امکانات کا قانون مانتے ہیں تو اس کے مطابق "واقعہ" "ا" جو لازمی شرطوں کے تحت رونما ہو سکتا ہے یا نہیں ہو سکتا ان شرطوں کے لحاظ سے اتفاقی ہے۔" چنانچہ لیوویل کا فارمولا حل کرنے کے لئے تیموراز کو تین شرطیں پوری کرنا تھیں:

1- وہ پیدا ہوں

2- وہ ریاضی داں ہوں

3- لیوویل سے دلچسپی لیں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ شرطیں پوری ہوئیں اور واقعہ ''ا'' رونما ہوا۔

اس اہم دریافت کا اندازہ لگانے کے لئے میں تبلیسی یونیورسٹی کے شعبہ سائنس کے سربراہ پروفیسر مگنارادزے اور پروفیسر لومادزے سے ملا جنہوں نے تیموراز کو ہندسوں کا نظریہ پڑھایا تھا۔ انہوں نے بڑے تحمل سے مجھے جدید علم ریاضی کی اہمیت سمجھائی اور بتایا کہ ریاضی کے طریقے کس طرح تیزی سے ہماری روزمرہ کی زندگی میں داخل ہو رہے ہیں۔ روسی ادبی نقاد پیساریف نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ریاضی انسانی دانش کی سب سے نیک تخلیق ہے، اسے احتیاط سے اور ایمانداری کے ساتھ پروان چڑھانا چاہئے۔ یہ الفاظ سننے کے بعد میں نے تیموراز وپخوادزے کی دریافت کی قیمت محسوس کی۔ یہ نہ صرف ریاضی کی ترقی میں ایک دین تھی بلکہ اس سے نوجوان ریاضی داں کو بھی اپنی تحقیقات میں بڑی مدد ملی۔ تیموراز اسے ڈی۔ ایس۔ سی کی ڈگری کے لئے بطور مقالہ پیش کر سکتے تھے لیکن اپنے استاد کے مشورے پر ایسا نہیں کیا۔

لیوویل فارمولے کے سلسلے میں تیموراز کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں سنسنی خیز اطلاعات اور مبالغہ آمیز باتیں سب ہی شامل ہیں۔ تصویروں میں ان کا چہرہ بھی ذرا حیرت زدہ دکھائی دیتا ہے۔ جب میں تیموراز سے ملا تب ہی مجھ پر اس حیرت کا راز کھلا۔

انہوں نے بڑی سادگی سے کہا:

''مجھے اس بات کا بالکل یقین ہے کہ پچھلے سو برسوں میں دنیا کے بڑے بڑے ریاضی داں لیوویل کے غیر حل شدہ فارمولے پر مغز پچی نہیں کر رہے تھے اور نہ سائنس دانوں نے یہ مسئلہ حل ہونے پر بوکھلاہٹ میں اپنے سر کھجائے۔ لیکن یہ بھی چھپانا نہیں چاہتا کہ میں اپنی کامیابی پر مسرور ہوں۔'' اپنے متعلق اس سے زیادہ تیموراز نے اور کچھ نہیں کہا۔

ایک نوجوان بقراط سے نہیں بلکہ ایک بے تصنع، بردبار اور باصلاحیت انسان سے میری جان پہچان اس طرح شروع ہوئی۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ کس چیز نے انہیں اس ایک صدی پرانے فارمولے کی جانب مائل کیا تو انہوں نے سادگی سے جواب دیا:

''اس کے حسن نے۔''

میں ریاضی کے فارمولوں کے ''حسن'' کے متعلق کافی پڑھ چکا تھا لیکن جب پہلی بار اپنے کانوں سے سنا تو عجیب محسوس ہوا۔

میں نے سیاہ تختے پر نظر دوڑائی۔ اس پر ہندسوں اور نشانوں کے پیچیدہ جال پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں ایسے کم تھے جو میں نے اسکول میں پڑھے تھے۔ ہندسوں کی قطاروں پر ادھر ادھر ایسے الفاظ لکھے تھے جو پڑھے ضرور جاسکتے تھے لیکن مجھ ناچیز کے لئے ان کا مطلب سمجھنا ناممکن تھا۔ مثلاً __ ''اس طرح''، ''دوسری طرح''، ''اس لئے''، ''برابر ہے'' وغیرہ۔

ایسے موقعوں پر اکثر لوگ ''جی''، ''جی ہاں'' کہہ کر اپنی جہالت چھپا لیتے ہیں۔ میں یہ نہ کرسکا اور شرم سے میرے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

تیموراز نے فوراً میری مدد کی:

''آپ جانتے ہیں، مجھے فٹ بال کھیلنے میں اب بھی مزہ آتا ہے۔''

میری شرمندگی دور کرنے کے لئے انہوں نے موضوع بدل دیا اور اپنے بچپن کی باتیں سنانے لگے جب وہ لڑکوں کی کہاوت ''جہاں گیند ہے وہاں سب لڑکے ہیں'' کے مطابق دوڑ کر فٹ بال کے میدان جایا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ جارجیا کی جونیئر ٹیم میں کھیلتے تھے اور 1954ء سے وہ ہر اچھے میچ کو دیکھنے جاتے رہے ہیں حالانکہ اسکول میں ان کے ریاضی کے استاد ایاشویلی نے ایک دفعہ کہا تھا: ''فٹ بال تمہارے لئے نہیں ہے۔''

فٹ بال سے تیموراز کی دلچسپی کوئی اہم موضوع نہیں ہے۔ میں نے اس کا ذکر صرف اس لئے کیا کہ اس سے ان کے کردار کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی میز پر ریاضی کا ایک سوال رکھا ہوا تھا جسے پروفیسر آسانی سے کسی دوسرے کو دے سکتے تھے۔ سہ پہر کو انہیں فٹ بال کا دلچسپ میچ دیکھنا تھا۔ اس کا ٹکٹ جیب میں تھا۔ ریاضی کا سوال حل کرنے میں دیر ہوسکتی تھی اور وہ میچ دیکھنے سے محروم ہو سکتے تھے۔ لیکن تیموراز نے اسے واپس نہیں دیا یہ سوچ کر کہ ''پروفیسر یہ نہ خیال کریں کہ میں سوال کو حل نہیں کرسکتا''۔ سب کچھ ٹھیک رہا۔ انہوں نے سوال بھی حل کرلیا اور فٹ بال کا میچ بھی دیکھ لیا۔

تیموراز اسکول میں ریاضی اس لئے پسند کرتے تھے کہ وہ اسے آسانی سے سمجھ لیتے تھے اور اس میں امتحان پاس کرنا مشکل نہیں ہوتا تھا۔ جب وہ نوجوان کمیونسٹ لیگ کے ممبر بنے تو ان کی

سرگرمیاں زیادہ تر ریاضی کے گرد رہیں۔ اس سلسلے میں قسمت نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ جب ان کے دوستوں نے دیکھا کہ ریاضی میں ان کی اچھی صلاحیت ہے تو انہوں نے ان کی ہر طرح سے مدد کی تاکہ یہ صلاحیت اور چمکے۔ چنانچہ ریاضی کے مقابلے منظم کئے گئے اور اسکول میں ابتدائی ''سائنسی'' کام شروع کیا گیا۔ ان میں تیموراز نے کئی کامیابیاں حاصل کیں اور نوجوان کمیونسٹ لیگ کے بہت سے انعام پائے۔ اس کے علاوہ اپنی پچھلی اور حال کی (مجھے یقین ہے کہ مستقبل کی بھی) کامیابیوں کے متعلق استاد کے رول پر بہت زور دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اچھا استاد اپنے طالب علم کا مستقبل ڈھالنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

ان کے خاندان میں کوئی بھی ریاضی داں نہیں ہے۔ طالب علم تیموراز کے مستقبل پر وراثت نے نہیں بلکہ اچھی اتالیقی نے اثر ڈالا ہے۔ ان کے استاد ایاشویلی نے کئی بار اپنے شاگرد کو ریاضی کے مقابلوں میں شریک کرایا۔ وہاں انعام حاصل کرنے کے بجائے وہ فٹ بال کے میدان میں دوڑتے رہے۔ لیکن ایاشویلی نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی اسی رائے پر جمے رہے کہ لڑکے میں صلاحیت ہے، وہ ضرور ابھرے گی۔

تیموراز کی زندگی میں نیا موڑ کب شروع ہوا، اس کے بارے میں انہیں ٹھیک یاد نہیں ہے۔ غالباً اس وقت جب انہوں نے اسکول سے سونے کا تمغہ حاصل کر کے اور داخلے کا امتحان بہترین نمبروں سے پاس کرنے کے بعد یونیورسٹی کے پہلے ہی سال میں ہندسوں کے نظریے پر کام کرنا شروع کر دیا تھا جو عام طور پر آخری سال کے طالب علم کرتے ہیں۔ یا پھر اس وقت جب چوتھے سال کے طالب علم کی حیثیت سے انہوں نے سائنس کے میدان میں ایک ''غیر معلوم'' راستہ کھولا اور ان کی تصانیف ''جارجیا کی سائنس اکادمی کی رپورٹ'' میں شائع ہونے لگیں۔ نہیں، یہ اتفاقی کامیابیاں نہیں تھیں جنہیں ہم نیا موڑ کہہ سکیں۔ یہ ان کی ابتدائی تربیت اور ان کے عزم کا منطقی نتیجہ تھیں۔

تیموراز سمجھتے ہیں کہ حسن اتفاق سے انہوں نے لیوویل کا معمہ حل کیا ہے۔ لیکن ان کے دوستوں کی قطعی رائے ہے کہ یہ ماحصل ہے ان کی مسلسل مشقت اور انتہائی ثابت قدمی کا، ان کی مضبوط قوت ارادی اور اپنے مضمون سے سچی لگن کا۔ اگر کسی ریاضی داں کو فارمولے میں واقعی حسن نظر آتا ہے تو اسے وہ یقینی حل کرلے گا۔

از: یوری موسیشویلی

ایک نئی سائنس کا بانی

یہ ستمبر 1961ء کی بات ہے۔ سوویت یونین کے کونے کونے سے لوگ بڑی تعداد میں قزاخستان کے ایک شہر جمبول میں جمع ہوئے۔ ان میں ڈاکٹر، زراعت کے ماہر، جانوروں کے معالج، علم حیاتیات کے عالم اور مویشی پالنے والے سب ہی شامل تھے۔

آخر اتنے بہت سے ماہر ریگستان کے بالکل کنارے پر آباد اس چھوٹے سے شہر میں کیوں وارد ہوئے؟ پچاس برس ہوئے اسی جمبول (پہلے جس کا نام اولئے اتا تھا) کے ایک چھوٹے سے مکان میں جانوروں کے ڈاکٹر کونستنتین اسکریابن نے علم کرمیات (Helminthology) پر کام کرنا شروع کیا تھا۔ یہ سائنس کی بالکل ایک نئی شاخ تھی جس نے مستقبل میں طب، مویشی کے علاج کے علم اور علم زراعت پر اپنا زبردست اثر ڈالا۔

اب پچاس برس کے بعد اسکریابن پھر جمبول میں تھے۔ قزاخستان کی سائنس اکادمی نے اس چھوٹے سے مکان میں، جہاں علم کرمیات نے جنم لیا تھا، اکادمیشن اسکریابن نامی عجائب گھر قائم کر دیا۔ اور 82 سالہ بزرگ اسکریابن ہی افتتاحی رسم ادا کرنے کے لئے بلائے گئے۔ پچاس برس کی جدائی کے بعد، دل جذبات سے لبریز، آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے اس مشہور سائنس داں نے پتھر کی پرانی جھونپڑی کی دہلیز کو پار کیا۔ یہیں سے ان کی شہرت کی شاہراہ شروع ہوئی تھی۔

اس اہم واقعہ کو چند ہی ہفتے گزرے ہوں گے کہ میں کونستنتین اسکریابن کے ماسکو کے فلیٹ میں موجود تھا اور کرمیات کے آغاز کی مسحور کرنے والی داستان سن رہا تھا۔

''اس سائنس کا پورا مطلب اور اس کی اہمیت سمجھنے کے لئے ایک سادہ حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے۔ بدقسمتی سے 50 فیصدی لوگوں کو اس کا علم ہی نہیں ہے اور باقی لوگ بہ ضد اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ آج ہم کرۂ ارض کے باسی نہ صرف نوع انسان، صاحب فکر انسان کے دور میں رہتے ہیں بلکہ اس دور میں بھی جب زندگی کی کئی دوسری شکلوں کا حیرت انگیز ارتقا جاری ہے۔ ان میں طفیلی کیڑے بھی شامل ہیں۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے! طفیلی کیڑے ہر جگہ ہی پائے جاتے ہیں __ انسانوں، پالتو اور جنگلی جانوروں، پرندوں، مچھلیوں اور گھونگھوں کے سب کے جسموں میں۔ وہ زمین، پانی اور یہاں تک کہ پودوں میں بھی رہتے ہیں۔''

چوبیس سو سال ہوئے طب کے بانی بقراط نے ان کیڑوں کو ''ھیل منتھز'' (Helminths) کا نام دیا تھا۔ آج تک ہم طفیلی کیڑوں کی تمام قسموں کے لئے یہی مشترکہ نام استعمال کرتے ہیں۔ اس مشترکہ زمرے کی بے شمار مختلف قسمیں اور کنبے ہیں اور پھر ان کی تحتی تقسیم بھی ہے۔ اگر دنیا کے

پرندوں، مچھلیوں اور جانوروں کی تمام قسموں کو جمع کیا جائے تو ان پر طفیلی کیڑوں کی قسمیں بھاری ہوں گی۔ برسبیل تذکرہ یہ مخلوق اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ ہماری دھرتی، اور اپنے شکاروں سے کہیں زیادہ پرانی جن پر وہ زندہ رہتی ہے۔ ایک پرانی لاطینی کہاوت ہے کہ عقل پختہ عمر کا تحفہ ہوتی ہے۔ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ طفیلی کیڑے کیوں بڑے اطمینان سے "میزبان" جسموں میں داخل ہو جاتے ہیں۔

مویشیوں کے ڈاکٹر پالتو جانوروں کی آنتوں، پھیپھڑوں، آنکھوں، شریانوں میں، یہاں تک کہ بھیجے میں بھی ایک ہزار سے زیادہ مختلف قسم کے طفیلی کیڑے دریافت کر چکے ہیں۔ اور جہاں تک حضرت انسان کا تعلق ہے تو اس کے جسم کے اندر ڈیڑھ سو سے زیادہ قسم کے یہ کیڑے براجمان رہتے ہیں۔ زمین پر ان طفیلیوں کے جھنڈ کے جھنڈ گھومتے پھرتے ہیں جہاں سے وہ پودوں کی جڑوں، پتیوں اور پھلوں پر مسلسل دھاوے بولتے رہتے ہیں۔

یہ ذرات جیسے جانور زندہ چیزوں کو جتنا نقصان پہنچاتے ہیں اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ لوگوں کی صحت برباد کرتے ہیں، مویشیوں کی صلاحیت پیداوار کم کرتے ہیں اور فصلیں تباہ کرتے ہیں۔ ایسے موذیوں سے دنیا کو نجات دلانا اس نئی سائنس، علم کرمیات اور اس کے بانی کونستنتین اسکریابن کا مقصد ہے۔

یہ اسکریابن ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے معلوم کیا کہ طفیلی کیڑے کوئی اتفاقی شے نہیں ہیں اور انسان اور دوسری جاندار مخلوق کے لئے ان کی حیثیت بے ضرر "پڑوسی" کی نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسکریابن سے پہلے بھی دوسرے لوگ اس مسئلے پر کام کر چکے تھے۔ لیکن ان کی تحقیقات الجھی ہوئی اور نامکمل تھیں۔

خود بقراط نے طفیلی کیڑوں کو ایک قسم کے سانپ سے خلط ملط کر دیا تھا۔ اور سکندر اعظم کے محترم معلم ارسطو سمجھتے تھے کہ مختلف کیڑوں مکوڑوں کی ابتدائی شکلوں اور طفیلی کیڑوں میں فرق نہیں ہے۔

یہاں تک کہ یورپ کے سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹروں کا پختہ عقیدہ تھا کہ طفیلی کیڑے معجزہ کی طرح "میزبان" جسم کے اندر خود بخود پیدا ہوتے ہیں اور بڑھتے ہیں۔ ان ڈاکٹروں میں اگر اختلاف تھا تو بس یہ کہ وہ کس مادے سے جنم لیتے ہیں۔ اکثریت کا خیال تھا کہ وہ "میزبان" جسم کے خون اور دوسرے رس سے پیدا ہوتے ہیں۔ بعض کی رائے تھی کہ صرف کھائی ہوئی غذا کے ذروں سے۔

سائنس دانوں اور ڈاکٹروں کو یہ معلوم کرنے کے لئے کہ طفیلی کیڑے کس طرح زندہ رہتے ں اور زندہ چیزوں کو چھوت لگاتے ہیں کئی دھائیاں لگ گئیں۔ تب یہ بات دریافت ہوئی کہ ان یڑوں کے ارتقا کے پیچیدہ دور ہوتے ہیں اور وہ اپنی زندگی کے مختلف دوروں میں مختلف جسموں ں رہتے ہیں۔ انیسویں صدی کی آٹھویں دھائی میں ڈاکٹروں اور مویشیوں کے معالجوں نے جو ں مسئلے پر کام کر رہے تھے اچھا خاصا مواد جمع کر لیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ بہت سی بیماریاں ن ہی طفیلی کیڑوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

لیکن اسے بدقسمتی کہئے کہ اس نوزائیدہ سائنس کی ترقی کے راستے میں انسان کی کیڑوں سے پرانی حقارت آن کھڑی ہوئی۔ ان "بے ضرر" ہم مکینوں سے اکثر وبیشتر ڈاکٹروں اور مویشیوں کے معالجوں کی بے تعلقی کا سبب دراصل یہی تھا۔

آج بھی ایسے بہت سے لوگ ملتے ہیں جو اس کے قائل نہیں ہیں کہ طفیلی کیڑوں کو خاص اہمیت دی جائے۔ ان ہی "بے عقیدہ" لوگوں کے خلاف اکادمیشن اسکریابن گویا ہوئے۔ یہ ننھی "بے ضرر" مخلوق جو نقصان پہنچاتی ہے، اس کی انہوں نے صرف دو مثالیں پیش کیں۔ پہلی مثال: سوویت یونین میں ہر سال دماغ کی ایک بیماری سے لاکھوں بھیڑیں مر جاتی ہیں اور اس بیماری کی جڑ یہی چھوٹے کیڑے ہیں۔ دوسری مثال: چنونا (Ascaris) بیماری سے مویشی کو اور زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ اگر تین جوان سور اسی بیماری کا شکار ہو جائیں تو ان کا وزن گھٹ کر سور کے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے برابر ہو جاتا ہے۔ اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ مذبح میں جو بیمار مویشی رجسٹر کی گئی اس کا دو تہائی حصہ ان ہی طفیلی کیڑوں کا شکار تھا۔

پچاس سال ہوئے اسکریابن نے طفیلی کیڑوں کے پہنچانے والے زبردست نقصان کا تخمینہ لگا کر خطرے کی گھنٹی بجائی تاکہ سوئی ہوئی دنیا جاگ اٹھے اور اس خطرناک حالت کو محسوس کرے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ملک نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔

سوویت یونین میں طفیلی کیڑوں کی سائنس کا پہلا شعبہ 1917ء میں کھولا گیا۔ 1920ء میں اسکریابن مستقل ماسکو منتقل ہو گئے اور یہاں انہوں نے علم کرمیات کے کل یونین انسٹی ٹیوٹ کے تحت تحقیقات کے لئے کئی ادارے قائم کئے۔

یہ نئی سائنس ڈگمگاتے ہوئے اپنے پہلے قدم بڑھانے لگی۔ لیکن اس وقت بھی اسکریابن کی دور رس نگاہیں بہت آگے دیکھ رہی تھیں۔ تب انہوں نے اس خیال کا پرچار کیا کہ سوویت یونین کو

"طفیلی کیڑوں کے خلاف یہ اہم جنگ اپنی ہی سرزمین تک محدود نہیں رکھنا چاہیے۔ بلکہ کرمیاتی بیماریوں کا قلع قمع کرنے کے اپنے علم اور منصوبوں سے تمام دنیا کو واقف کرنا چاہیے۔" تقریباً چالیس برس پہلے یہ خیال بالکل خیالی پلاؤ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت سے اب تک سوویت سائنس داں اس میدان میں جو وسیع کام کر چکے ہیں اس سے کامیابی کا دن قریب آ گیا ہے۔

اکادیمشن اسکریابن، اکادمی کے طالب علموں اور کارکنوں نے سوویت یونین کا کرمیاتی نقشہ تیار کیا۔ اس کے لئے اس وسیع وعریض ملک کے مختلف حصوں میں 350 سے زیادہ مہمیں بھیجی گئیں۔

مویشیوں کے علاج کی اکادمی کے ایک کمرے میں میری نگاہ اسی نقشے پر پڑی جس میں وہ تمام راستے دکھائے گئے تھے جن پر سے اسکریابن کے شاگرد ایک زبردست کام کو انجام دینے کے لئے گزرے تھے۔ ماسکو سے لال لال لکیریں بالٹکی ریپبلکوں، دونباس، مشرق بعید اور جزیرے نما کولا تک جاتی تھیں۔ تحقیقات کے سلسلے میں طالب علم اوب، ارتش اور اینی سی دریاؤں تک پہنچے تھے۔ انہوں نے آرمینیا، وسطی ایشیا، یاقوتیہ اور یورال کی بادہ پیمائی کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورے سوویت یونین میں ایک مربع میل بھی نہیں جسے ان ثابت قدم تحقیق کرنے والوں کے پیروں نے نہ چھوا ہو! وسطی ایشیا کے ریگستانوں اور یامال ٹنڈرہ میں انہیں کس چیز کی تلاش تھی؟ وہ کیا شے تھی جس نے ان میں سائبیریا کے تیز وتند دریاؤں کو پار کرنے اور قفقاز کی کھڑی چڑھائیاں سر کرنے کی ہمت پیدا کی؟

شمال بعید میں دریائے اوب کے نشیبی حصے میں اسکریابن اور ان کے مددگاروں نے اس طفیلی کیڑے پیدا ہونے کا ایک بہت بڑا مرکز دریافت کیا، جو مچھلیوں کے اندر رہتا ہے اور آدمی کو چھوت لگاتا ہے۔ اس طرح انقلاب سے پہلے شمال کی چھوٹی قومیں جس پُر اسرار بیماری کا شکار ہوا کرتی تھیں اس کا پتہ لگا لیا گیا اور اس کی درجہ بندی بھی کر لی گئی۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسے جڑ سے مٹانے کے لئے تدبیریں اختیار کی جارہی ہیں۔

کونستنتین اسکریابن نے ایک دفعہ لکھا تھا: "شمالی بارہ سنگھے سے لے کر ریگستان کے اونٹ تک، بری اور آبی پرندوں سے لے کر جنگلی جانوروں تک جن سے سمور یا غذا حاصل ہوتی ہے، مچھلیوں اور پالتو جانوروں سے لے کر خود انسان تک ــــ یہ ہے ہماری تحقیق کا میدان۔"

اسکریابن وسیع معلومات حاصل کرنے کی غرض سے مختلف میدانوں کے ماہرین کو یکجا کرتے ہیں ــــ مویشیوں کے معالجوں، ڈاکٹروں اور ماہرین حیاتیات کو۔ ان تینوں پیشوں کے

لوگ ان کی ہر مہم میں شامل ہوتے ہیں۔ کچھ برسوں سے مہموں میں زرعی کرمیات کے ماہر بھی شریک ہونے لگے ہیں۔

پچھلی چند دہائیوں میں مٹھی بھر جوشیلے ماہروں نے طفیلی کیڑوں کی سینکڑوں نئی قسمیں اور کنبے دریافت کیے ہیں۔ سوویت سائنس داں انتہائی مضر طفیلی کیڑے علیحدہ کر چکے ہیں جو نہ صرف جانوروں، پرندوں اور مچھلیوں کو نقصان پہنچاتے ہیں بلکہ کپاس، چقندر، تمباکو کے کھیتوں اور چائے اور لیمو جیسے پھلوں کے باغات کو بھی تباہ کرتے ہیں۔

علم حیوانات کی تاریخ میں تحقیقات کے پیمانے کے لحاظ سے اسکریابن کی مہموں کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ دنیا میں طفیلی کیڑوں کا سب سے بڑا مجموعہ ماسکو کے ایک خاص عجائب گھر میں ہے۔ یہ نتیجہ ہے مختلف جغرافیائی علاقوں کے دو لاکھ سے زیادہ جانوروں کے معائنوں اور جانچوں کا جو ان کی موت کے بعد کی گئیں! ان میں طفیلی کیڑوں کی دو سو نئی قسمیں اور ایک سو نئے کنبے دریافت کرنے کا سہرا ان ہی زبردست حیاتیاتی کھوجوں کے سالار کے سر ہے!

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علم حیوانات کے لئے اسکریابن کی تحقیقات بے انتہا قیمتی ہیں۔ لیکن جب مجھے علم کرمیات کے کل یونین انسٹی ٹیوٹ میں طفیلی کیڑوں کا یہ بہت بڑا ذخیرہ دکھایا گیا اور مشہور اکادمیشن نے بتایا کہ اب سائنس داں اس بے شمار مخلوق کی درجہ بندی کرنے اور اس کی نسلی کڑیاں جوڑنے میں کامیاب ہو چکے ہیں تو میں نے سوچا: یہ سب کس لئے ہے؟ کیا کرمیات کے ماہروں نے کیڑوں کا شکار کھیلنے کے لئے اور رعب ڈالنے والی الماریوں میں اپنی فتوحات کی نشانیاں سجانے کے لئے ضرورت سے زیادہ جوش تو نہیں دکھایا؟

جب میں کونستنتین اسکریابن سے پھر ملا تو تڑ سے یہی سوال کر ڈالا۔ اس پر انہوں نے ذرا بھی تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ان سے یہ سوال پہلے بھی کئی بار کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے آہستہ آہستہ جواب دینا شروع کیا:

''میں گوئٹے کے الفاظ میں آپ کو جواب دینا چاہتا ہوں: حقائق کے ناامید ڈھیر میں کھو جانے سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی پہلے تحقیق کرنا اور پھر کلیہ قائم کرنا سیکھے۔ لیکن اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ انسان کے ذاتی تجربے کی طرف لوٹا جائے۔ اگر پودوں کے انسٹی ٹیوٹ میں آپ کو بیج کے نمونے دکھائے جائیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ کو ان کے مفید ہونے پر شبہ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ آئندہ کبھی نہ کبھی ان میں سے بعض بیج اچھے پودے اگانے کے لئے کام آ سکتے ہیں۔ لیکن

نباتیات کے ماہر گھاس پھوس بھی جمع کرتے ہیں۔ اگر زراعت کے ماہر یہ جاننا چاہیں کہ کون سی گھاس پھوس ضرررساں ہے اور اس کے خلاف کب اور کیسے جدوجہد کی جائے تو اس کا بھی جمع کرنا ضروری ہے۔ ہم کرمیات کے عالم اسی قاعدے پر چلتے ہیں۔ آپ پریشان ہیں کہ ہم نے ضابطوں کا ایک باقاعدہ چارٹ تیار کیا ہے۔ اچھا تو فرمایئے، مینڈیلیف کے چارٹ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ یقینی یہ بھی ایک نظام ہے ___ کیمیائی عناصر کا نظام۔ ایک ڈاکٹر یا مویشی کا معالج کرمیاتی بیماری کی تشخیص کس طرح کرسکتا ہے اگر وہ یہ نہیں جانتا کہ کس قسم کے طفیلی کیڑے سے یہ بیماری لگی ہے۔ ہم نئے دریافت کئے ہوئے طفیلی کو علم حیوانات کے چارٹ میں مناسب جگہ پر رکھتے ہیں جس سے اس کی حیاتی خصوصیات معلوم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے اس لئے کہ متعلقہ طفیلی کیڑوں کے ارتقا کے دور یکساں ہوتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر کیڑوں کے خلاف موثر احتیاطی تدبیریں اختیار کرنے میں ہمیں چارٹ اور قاعدے سے مدد ملتی ہے۔"

ابھی تک سوویت یونین کا کرمیاتی نقشہ مکمل نہیں ہوا ہے۔ ہماری تحقیقات کو مکمل کرنے کے لئے ہماری مہموں کو بہت کچھ کرنا ہے، انہیں کئی اور راہوں پر سفر اور بہت سے علاقوں کی چھان بین کرنا ہے۔ پھر بھی اس نقشے کو طبی خدمات کے مختلف ادارے استعمال کر رہے ہیں۔ اس نے سوویت یونین میں جنگلات کے کارکنوں، چڑیا گھر کے ملازموں، سبزی اگانے والوں، اسٹور کیپروں، مچھلیوں کا پالن پوسن کرنے والوں اور بچوں کے ڈاکٹروں کو ان کے کام میں بہت مدد دی ہے۔ یہ نقشہ محض جغرافیائی حقائق کا اعلان نہیں ہے بلکہ بیماریوں کے خلاف لڑنے میں ایک تعمیری منصوبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

سوویت سائنس داں اسکریابن کی قیادت میں انسان پر ان مضر اثرات کا مطالعہ کرنے میں مصروف ہیں جو طفیلی کیڑے پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ طبی کرمیات ایک نئی سائنس کی حیثیت سے بیماری کے خلاف جنگ میں نیا ہتھیار ثابت ہو رہی ہے۔ اور اس سائنس کی کامیابی بڑی حد تک کونستنتین اسکریابن کے ایثار اور عزم کی مرہون منت ہے۔

اسکریابن نے جلد ہی محسوس کرلیا تھا کہ پچھلے ڈھائی ہزار برسوں میں ڈاکٹروں نے مریضوں کو کیڑوں کی بیماری سے شفا دینے کے لئے جو کچھ کیا ہے اس نے حالت کو بہتر بنانے کے بجائے بدتر بنا دیا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ مریض کے جسم سے کیڑے نکال تو دیئے لیکن ان سے ہی آس پاس کے ماحول کو آلودہ کر دیا۔ اگر حقیقت دیکھی جائے تو گذشتہ صدیوں سے ڈاکٹر اور مویشیوں کے معالج زمین کو کرمیاتی بیماریوں سے دوبارہ آلودہ کرتے رہے ہیں!

اس سلسلے میں 1925ء میں بالکل نیا رویہ اختیار کیا گیا۔ عارضی شفا دینے کے بجائے طفیلی کیڑوں کو جڑ سے مٹانے اور ان کی پیدائش روکنے کے لئے مختلف تدبیریں اختیار کی گئیں۔ یہ تدبیریں نہ صرف انسانوں اور جانوروں کے لئے بلکہ روگی زمین، پانی، سبزیوں، مکانوں یہاں تک کہ کپڑوں کے لئے بھی تھیں۔ اپنے نئے طریقے کی تشریح کرتے ہوئے اسکریابن نے لکھا کہ بیماری پر کس طرح کنٹرول کیا جا سکتا ہے: "کیڑوں سے چھٹکارا پا کر نہیں بلکہ ان کی عام چھوت کے خلاف جدوجہد کر کے، مریضوں کو دواؤں کے ذریعے عارضی شفا دے کر نہیں بلکہ ترقی یافتہ علاج اور حفاظتی تدابیر سے جراثیمی گرد و پیش کو ختم کر کے، نہ صرف الگ الگ افراد کو مدد دے کر بلکہ لوگوں کو دوا دے کر اور مویشی کا علاج کر کے بڑے پیمانے پر آبادی کو پوری طرح تندرست کر کے، نہ صرف مرض کے مارے ایک شخص کی انسان دوست امداد کر کے بلکہ منظم طبی اور معاشی کام کے ذریعے ہم اشتراکی تعمیر کے فرائض پورے کر سکتے ہیں۔"

اس صدی کی تیسری دہائی میں کونستنتین اسکریابن کی پہل پر مہموں نے یہی اہم "طبی اور معاشی کام" شروع کیا۔ جہاں کہیں بھی سائنس داں اور ڈاکٹر طفیلی کیڑوں کے سرچشمے دیکھتے فوراً وہ اردگرد کے تمام علاقے اور آبادی کو جراثیم سے پاک کرنے میں جٹ جاتے تھے۔ قریوں میں، وسطی ایشیا کے دیہات میں، مچھیروں کی بستیوں میں، چھوٹے بڑے شہروں میں وہ کہیں بھی ہوتے "چلتا پھرتا ہسپتال" کھول دیتے۔ یہاں مہم کے ممبر مقامی آبادی کا طبی معائنہ کرتے، انہیں دوائیں تقسیم کرتے اور مقامی ڈاکٹروں کو علاج جاری رکھنے کی ہدایتیں دیتے تھے۔

چوتھی دہائی میں کیڑوں کے روگ کے خلاف لڑائی صرف مہموں کی ذمے داری نہیں رہی۔ اب صحت عامہ کی وزارت کونستنتین اسکریابن کے تعاون سے کرمیاتی بیماریوں کے علاج اور ان کی روک تھام کی تدبیروں کے متعلق ہدایتیں مرتب کر کے انہیں عام کرنے لگی۔ ان میں سے ایک اہم ترین تدبیر اسکولوں، بالک گھروں، کارخانوں اور فوجی دستوں کا عام معائنہ اور ان کی ٹھیک صفائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کرمیات کے ماہروں کی کل یونین کانفرنسیں بھی ہوئیں جہاں جراثیم ختم کرنے کے لئے دس سے پندرہ سالہ منصوبے تیار کئے گئے۔

1944ء میں کونستنتین اسکریابن نے ایک منصوبہ پیش کیا جس کا مقصد سوویت یونین میں زیادہ خطرناک طفیلی کیڑوں کو نئے طریقے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا تھا۔ اس کا نام انہوں نے "تاراج" (devastation) رکھا۔

اپنے اس نئے طریقے کے بارے میں اسکریابن نے لکھا: ''طفیلی کیڑوں کے خلاف یہ نہ تحفظ ہے اور نہ عارضی دفاع بلکہ مکمل جنگ ہے۔ یہ محض طفیلی کیڑوں کے خلاف ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی کے ہر دور میں جنم دینے والی ہر چیز کے خلاف جدوجہد ہے۔ اور اس کا مقصد انہیں مکمل طور پر صفحۂ ہستی سے مٹا دینا ہے۔''

اسکریابن کے کیڑوں کو مکمل طور سے مٹانے والے طریقے میں دو باتیں شامل تھیں ___ پہلی، طفیلی کیڑوں کے خلاف سرگرمیوں میں تمام معلوم ذرائع کا استعمال، دوسری، ایسے حالات کا پیدا کرنا جب کیڑے نہ زندہ رہ سکتے ہوں اور نہ پیدا ہو سکتے ہوں۔ اس کا مطلب تھا کیڑے بردار چیزوں کو ختم کرنا، بیماری کے جراثیم کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بڑھانا وغیرہ وغیرہ۔ دوائیں اور رہائش، پانی کی فراہمی اور صفائی، متوازن غذا اور جانوروں کی دیکھ بھال ___ ان سب باتوں کا مقصد بیماری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا اور طفیلی کیڑوں کے خلاف جنگ میں فتح حاصل کرنا تھا۔

اس کام کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سوویت یونین میں ہر سال تقریباً تین کروڑ لوگوں کا طبی معائنہ اور علاج کیا جاتا ہے۔

سال بہ سال ان طبی خدمات کا دائرہ بھی بڑھتا جا رہا ہے جن کا تعلق مویشی کی کرمیاتی بیماریوں سے ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو: 1941ء میں ڈاکٹروں نے ایک کروڑ چالیس لاکھ مویشیوں کا معائنہ اور علاج کیا تھا۔ 1961ء میں مویشیوں کی تعداد جن کا معائنہ کیا گیا 13 کروڑ 40 لاکھ تھی! آج تمام ملک میں ایسے سائنسی اداروں کا جال پھیلا ہوا ہے جو مویشیوں کے ڈاکٹروں اور ماہروں کو ان کے کام میں ہر ممکن مدد دیتے ہیں۔ ان اداروں کی رہبری سوویت سائنس اکادمی کی کرمیاتی تجربے گاہ اور اسکریابن کا قائم کیا ہوا علم کرمیات کا کل یونین انسٹی ٹیوٹ کرتے ہیں جو ماسکو میں واقع ہیں۔ جس طرح فوجی ہیڈ کوارٹروں میں اہم مہمیں تیار کی جاتی ہیں اسی طرح ان دو عمارتوں کے اندر طفیلی کیڑوں کے خلاف جدوجہد کرنے اور ان سے سوویت یونین کو ہمیشہ کے لئے نجات دلانے کے طریقے مرتب کئے جاتے ہیں۔ پھر انہیں عمل میں لایا جاتا ہے۔

سائنس داں ایسے طریقے مرتب کر چکے ہیں جو ملک میں مویشی کے لئے خطرناک ترین 20 قسم کے طفیلی کیڑے اور انسان کے لئے 8 قسم کے سب سے خطرناک چھوت لگانے والے کیڑے مکمل طور پر ختم کرنے میں کام آئیں گے۔

اس بارے میں اسکریابن نے لکھا: ''ہمیں امید ہے کہ دو قسم کے طفیلی کیڑے جنہیں سوویت

سائنس داں رفتہ رفتہ ختم کر رہے ہیں تھوڑے عرصے میں صرف عجائب گھر ہی میں دیکھے جا سکیں گے ... آنے والی نسلیں ان کے نمونے دیکھ کر تعجب کریں گی کہ بیسویں صدی کے پہلے نصف میں ڈاکٹر اور مویشیوں کے معالج آخر یہ کیسے برداشت کرتے رہے کہ دو خطرناک کیڑے انسانی آبادی کے درمیان پیدا ہوں اور زندہ رہیں۔''

وہ دن دور نہیں جب اسکریابن کا خواب پورا ہوگا۔ پچھلے چند برسوں میں طفیلی کیڑوں کی بیماریاں برابر ختم ہو رہی ہیں۔ اور اسکریابن کا منصوبہ مکمل تاراج آخری لڑائی کے لئے زور پکڑ رہا ہے۔

☆☆☆

''سائنس داں کی توانائی اور اس کی بے بہا قیمت کا سرچشمہ دراصل اس کے شاگرد اور چیلے ہوتے ہیں۔ میری نظر میں شاگردوں کے بغیر سائنس داں محض ایک تنہا محقق رہ جاتا ہے۔ اس پر ترس کھانا چاہئے اس لئے کہ وہ غیر فطری اور خودغرض زندگی گزار رہا ہے۔ سائنس داں کی زندگی کا لب لباب صرف انقلابی نئے نظریوں کو ترقی دینا نہیں ہے۔ اس کا مقصد حیات یہ ہونا چاہئے کہ آنے والی نسلوں کو، نوجوانوں کو اپنا علم سونپے جو اپنے استاد کے خیالات کو فروغ دیں، انہیں مکمل بنائیں اور عمل میں انہیں استوار کریں'' یہ ہیں اسکریابن کے الفاظ۔

اور وہ کبھی محض الفاظ تک محدود نہیں رہے۔

سوویت یونین میں آپ کو کرمیات کا ایک بھی ایسا ماہر نہیں ملے گا جو اپنے آپ کو اسکریابن کا شاگرد نہ سمجھتا ہو۔ اور ان کی تعداد مرعوب کن ہے۔ آج سوویت یونین میں 1300 سے زیادہ لوگ علم کرمیات کے میدان میں کام کر رہے ہیں، اور وہ دو نسلوں ــــ سائنس میں اسکریابن کے ''بیٹوں'' اور ''پوتوں'' پر مشتمل ہیں۔ ملک میں ایک بھی ایسی ریپبلک یا علاقائی مرکز نہیں ہے جہاں اس بڑے سائنسی کنبے کے فرد کام نہ کرتے ہوں۔

سائنس داں کے شاگرد اس کے لئے فخر و مسرت کا باعث ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ اس کی سائنسی ابدیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ لیکن ہر سائنس داں، یہاں تک کہ مشہور ترین سائنس داں بھی آنے والی نسلوں کو اپنا علم نہیں دیتا۔ اپنا مکتب خیال قائم کرنے کے لئے سائنس داں کو نہ صرف غیر معمولی ذہانت کا مالک بلکہ شخصیت کا بھی حامل ہونا چاہئے۔ ایک معلم جو اپنے شاگردوں کا ایثار اور ان کی وفاداری حاصل کرنا چاہتا ہے اس میں یہ صلاحیت ہونا چاہئے کہ وہ ان کے دل و دماغ جیت سکے۔ سائنسی خیال کے ایک مکتب کو ''جنم دینے'' کی مسرت صرف ان ہی لوگوں کو میسر ہوتی ہے جو

فراخدلی سے اپنے علم، یہاں تک کہ اپنی روح کی گہرائیوں میں بھی دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک پروفیسر صاحب کرمیات کے انسٹی ٹیوٹ میں کام کرتے تھے۔ وہ ایک پیچیدہ تجربے میں کامیاب رہے۔ انہوں نے تجربے گاہ میں ایک قسم کے ایسے گھونگھے کی نسل افزائی کرلی جس کا کرمیاتی بیماریاں پھیلانے میں بڑا حصہ ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ وہ اپنے ہم کاروں کو اپنا طریقہ سمجھائیں تو پروفیسر صاحب ہنسنے لگے اور فرمایا: انہیں دوسروں کی دریافتوں کی نقل نہیں کرنا چاہئے بلکہ خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونا چاہئے۔ نتیجہ کیا نکلا؟ مدت سے یہ حضرت پنشن پر ہیں اور ظاہر ہے، ان کا ایک بھی شاگرد نہیں ہے جو ان کے کام کو آگے بڑھا رہا ہو۔ ایسے لوگ اس گھونگھے کی یاد دلاتے ہیں جو ہماری جھیلوں اور دریاؤں کو گندہ کرتا رہا ہے اور 40 کروڑ برس سے اپنے خول میں بالکل بند ہے، دنیا سے الگ تھلگ اور کسی بھی ممکن ارتقا سے عاری۔

کتنا زمین آسمان کا فرق ہے ایسے لوگوں میں جو بخل سے کام لے کر علم کی ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں، اور اسکریابن کے کھلے اور فراخدل کردار میں۔ ایسا بارہا ہوا ہے کہ کونستنتین اسکریابن نے کسی نوجوان شاگرد کو بلایا اور اپنی الماری سے ایک موٹا سا لفافہ نکال کر کہا:

''یہ مواد ایک خاص قسم کے طفیلی کیڑے کے بارے میں ہے۔ اسے میں نے پانچویں دھائی تک جمع کیا تھا۔ تم ہوشیار نوجوان ہو۔ لو یہ لفافہ اور اس میں تا حال باتیں شامل کرلو۔ ممکن ہے اس سے اچھا مقالہ تیار ہو جائے۔''

ایسے بے شمار کتنے ہی لفافے الماری سے نکالے گئے اور نوجوان طالب علموں کو دیئے گئے۔ اور بے شمار بار ہی اسکریابن نے اپنے رفقاء کار کو مقالوں کے موضوع تجویز کئے، انہیں اپنے خیالات سے مستفید کیا۔ جب ان کے جانشینوں نے ان پر کام کیا تو وہ اہم مقالے تسلیم کئے گئے۔ پھر گھر پر، انسٹی ٹیوٹ میں اور ڈاک کے ذریعے لامتناہی بحث و مباحثے! ہزاروں ہی لوگوں نے اسکریابن کی غیر معمولی ذہانت کے سیر حاصل چشمے سے چلو بھر بھر کر پیا ہے۔

اس میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے کہ طالب علموں نے اسکریابن سے بحیثیت استاد بہت کچھ سیکھا۔ وہ اسکریابن سے بحیثیت انسان اور بھی زیادہ سیکھ سکتے ہیں۔

تقریباً پندرہ سال ہوئے اسکریابن کے ایک شاگرد الکسئی اسپاسکی، جو خود بعد میں اکادمیشن بنے، اس نتیجے پر پہنچے کہ اسکریابن کی طفیلی کیڑوں کی ایک درجہ بندی بالکل صحیح نہیں ہے۔ حقیقت بہر حال حقیقت تھی۔ نوجوان محقق اس معاملے کو بالکل چھپانا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ ہمت کر کے انہوں نے

اس سوال پر اپنے استاد کونستنتین اسکریابن سے بات چیت کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اپنے بچاؤ کے لئے باقی ابواب میں سے متنازع باب الگ رکھ دیا۔ اسے فوراً پروفیسر کو دکھانے سے وہ ذرا خائف تھے۔

اسکریابن کی نگاہ اس پر پڑی تو پوچھا: ''یہ کیا ہے؟''

الجھن کے عالم میں اسپاسکی نے یہ ناخوشگوار باب پروفیسر کو بڑھا دیا۔ ناراضگی سے اپنی مونچھیں انگلیوں سے کریدتے ہوئے اسکریابن اپنے شاگرد کی دلیل پڑھنے لگے۔ ہر صفحہ پڑھنے کے بعد ان کی ناراضگی بڑھتی گئی۔ آخرکار باب کو میز پر رکھ کر بولے:

''میں تم سے اتفاق نہیں کرسکتا!''

اسپاسکی اپنے مقالے کے منتشر ورق جمع کر رہے تھے کہ اسکریابن نے ہاتھ کے فصیح اشارے سے انہیں روکا اور کہا:

''نہیں۔ مہربانی کر کے اپنے مقالے کو یہیں چھوڑ دو۔ میں اسے چھپنے کے لئے دوں گا... جتنی جلد ممکن ہو سکتا ہے! آخر تمہاری بھی تو دلیلیں ہیں۔''

وقت نے ثابت کر دیا کہ نوجوان سائنس داں صحیح تھے۔ اسکریابن پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ یہی نہیں، وہ اپنے شاگرد کے نتائج کے پرچارک بھی بن گئے۔

ایسی مثالوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ایک مرتبہ جب وکٹوریا گیختر نے اپنے معلم اسکریابن سے کہا کہ انہیں ان کے ایک نظریے سے اختلاف ہے تو انہوں نے جواب دیا:

''اسکریابن غلطی پر ہے'' یہ لکھنے سے تم مت گھبراؤ۔ تم بہت سے تجربے کر چکی ہو۔ ایسے تجربے کے نتیجے جس کی تیاری اچھی طرح کی گئی ہو کسی بھی علمی ڈپلومے سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔''

کونستنتین اسکریابن نے اپنے دل کی بات لکھی: ''ایک سچا عالم کبھی اس بات سے خائف نہیں ہوتا کہ اس کے باصلاحیت شاگرد قدرت کے نئے نئے مظہر دریافت کریں گے، نئے نظریوں کو ترقی دیں گے اور سائنسی کامیابیوں میں اپنے معلموں سے بازی لے جائیں گے... ایسے شاگردوں پر تو فخر کرنا چاہئے اس لئے کہ ان کے بغیر سائنس، انجینئرنگ، فن یا ادب میں کوئی ترقی ممکن نہیں۔''

اسکریابن اپنے اردگرد کے کارکنوں میں کام سے محبت پیدا کر دیتے ہیں، لمبے چوڑے لیکچروں کے ذریعے سے نہیں بلکہ خود اپنی مثال سے۔

مجھے ایک واقعہ یاد ہے۔ اسکریابن اور ان کی اہلیہ اپنے گھر سے ماسکو کے قریب ہی ایک آرام گھر کو روانہ ہو رہے تھے۔ موٹر پر سوٹ کیس لادنے میں بہت زیادہ وقت لگنے پر میں قدرتاً متوجہ

ہوا۔ یہ بات میری عقل سے بالا تھی کہ دو پختہ عمر کے لوگ اپنے ساتھ اتنا زیادہ سامان لے جا رہے ہیں۔ آرام گھر کے اپنے کمرے میں جب اسکریابن سامان کھول رہے تھے تو کیا دیکھتا ہوں کہ سوٹ کیس کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکریابن ایک چلتا پھرتا کتب خانہ ساتھ لے آئے ہیں تاکہ خود بقول ان کے ''چھٹیوں میں تھوڑا بہت کام کرلوں۔'' جب میں نے یہ واقعہ کونستنتین اسکریابن کی قریب ترین ہم کار پروفیسر نادیژدا شیخوبالووا کو سنایا تو وہ مسکرا کر بولیں:

''مجھے اس پر کہیں زیادہ حیرت ہوتی اگر آپ کہتے کہ وہ کتابوں کے بغیر گئے تھے۔''

خواہ چھٹیاں ہوں یا نہیں اس پروفیسر کے ساتھ ہمیشہ کتابیں رہتی ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ سخت کام کی وجہ سے ان کی کتنی چھٹیاں ''برباد'' ہوئی ہوں گی۔ اور کتنی مرتبہ صحت گاہ کے ڈاکٹروں نے ضابطے توڑنے پر اسکریابن کو ٹوکا ہوگا (اکثر وہ کام کی میز پر صبح کے دو تین بجے تک بیٹھے رہتے ہیں!)۔ اور خود کونستنتین اسکریابن ڈاکٹروں اور قریبی دوستوں کی کوششوں پر خوب طنز کرتے ہیں جو ان کی عادتیں بدلنا چاہتے ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے ہیں:

''ہسپتال یا صحت گاہ میں آرام کے وقت سے زیادہ بہتر کام کرنے کا اور کوئی وقت نہیں ہوتا۔ اس میں جو چیز مخل ہوتی ہے بس وہ ڈاکٹر صاحبان ہیں۔''

کیسلا وودسک سے ''آرام'' کرنے کے بعد جب اسکریابن لوٹے تو ''نیماٹوڈولوجی (Nematodology) کے اصول'' کی مکمل جلد چھپنے کے لئے تیار ان کے ساتھ تھی۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ علاج کے بعد براہ راست ہسپتال سے وہ نیا مضمون پریس کو دینے کے لئے ایڈیٹر کے پاس پہنچے۔ سخت بیماری کی حالت میں جب دوسرا انسان اپنے آپ کو اپنی پریشانیوں میں مبتلا رکھتا ہے ان کے خیالات اس وقت بھی کام پر مرکوز رہتے ہیں۔

سائنسی فکر کا مکتب ایک ایسا گروپ نہیں ہوتا جسے محض مشترک مقصد اور کام متحد کرتا ہے۔ اس کے لئے دوستی، باہمی عزت اور لحاظ بھی انتہائی اہم ہے۔ اسکریابن کا مکتب پرانی اور نئی نسلوں کے درمیان دوستی اور لحاظ کا مکمل نمونہ ہے۔ آپ کونستنتین اسکریابن کی قائم کی ہوئی کسی بھی تجربے گاہ، شعبے یا انسٹی ٹیوٹ چلے جائیے آپ یہی ماحول اور مشہور پروفیسر کی جانب نئی نسل کی گہری عزت اور تحسین و توصیف کا جذبہ پائیں گے۔ میرے خیال میں اس محبت کا راز خود اسکریابن کے کردار میں پوشیدہ ہے۔

اسکریابن میں لوگوں کو یاد رکھنے کی بے پناہ صلاحیت ہے، خاص کر ان کی جن میں وہ سائنس

سے لگاؤ دیکھتے ہیں۔ جنگ سے پہلے کی بات ہے جب اسکریابن منسک میں اتفاق سے ایک ریسرچ طالب علم سے ملے تھے۔ وہ تجربوں میں بڑے انہماک سے مصروف تھا۔ یہ ملاقات کوئی لمحے بھر کی ہوگی۔ پانچ سال کے بعد اسکریابن نے سنا کہ یہ طالب علم کونستنتین ریژکوف محاذ جنگ سے زندہ لوٹ آیا ہے اور اس نے اپنے مستقبل کے متعلق ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ وہ فوراً نوجوان کا نام پہچان گئے اور اسے یہ تار بھیجا: ”درخواست کے فارم جلد بھیجو۔ مزید ریسرچ کے لئے سفارش کروں گا۔“

ریژکوف ہی ایسا تنہا شاگرد نہیں ہے جسے کونستنتین اسکریابن نے ”دریافت“ کیا ہو۔ تقریباً وہ تمام ہی لوگ، جو ”اسکریابن کی فوج“ کہلاتے ہیں اور تیس چالیس سال سے ان کے ساتھ کام کر رہے ہیں، صوبوں سے آئے ہیں۔ بہتوں کو انہوں نے مہموں کے وقت ”دریافت“ کیا۔ لیکن ان کے بہت سے شاگرد نئی دلچسپ سائنس کرمیات کی کشش سے خود ہی ماسکو آئے اور پروفیسر اسکریابن کے کمرے کے باہر اضطراب کی حالت میں انہوں نے اپنے آپ کو پایا۔ پھر مختصر سی ملاقات کے بعد وہ اسکریابن کی دانش اور نیک دلی سے متاثر ہو کر ہمیشہ کے لئے ٹھہر گئے۔ اب ان میں کئی سائنس کے ڈاکٹر اور پروفیسر ہیں۔ اس فہرست میں درجنوں اور لوگوں کے نام بھی گنائے جاسکتے ہیں جو پانچویں، چھٹی اور ساتویں دھائیوں میں اس ”برادری“ میں شامل ہوئے۔

اسکریابن کہتے ہیں: ”میرا پختہ عقیدہ ہے کہ ہر نوجوان ڈاکٹر، ہر نوجوان سائنس داں کو امید پرست ہونا چاہئے۔ امید پرستی خیال کی ہمت افزائی کرتی ہے، اسے ابھارتی ہے اور بالیدگی عطا کرتی ہے۔ وہ ہماری ادراکی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہے۔ اس کے برعکس قنوطیت جذبات کو دباتی ہے اور انہیں شل کر دیتی ہے۔ انسان کو فائدہ پہنچانے کے بجائے اس کا اثر منفی اور مضر ہوتا ہے۔“ اسکریابن کی رائے میں امید پرستی کردار کا کوئی اتفاقی نتیجہ نہیں بلکہ انسان کے پورے نظریہ حیات کی بنیاد ہے۔ ان کی اپنی زندگی کا مقصد ان تمام لوگوں میں انسان کی جبلی نیکی اور سائنسی تحقیقات کے شاندار مقاصد پر اعتماد پیدا کرنا ہے جو ان کے آس پاس کام کرتے ہیں اور جو انہیں اپنا قابل احترام معلم سمجھتے ہیں۔

☆☆☆

اسکریابن بیرونی دنیا میں اچھی طرح مشہور ہیں جہاں ان کے نظریات اس صدی کی تیسری دہائی سے ہی اہم خیال کئے جانے لگے تھے۔ لیکن مغربی دنیا نے 1930ء میں پہلی بار کرمیات کے اس مشہور سوویت ماہر کی آواز سنی جب انہوں نے عالمی اپی زوٹک (Epizootic) کانفرنس (پیرس) میں اور پھر عالمی ویٹرنری کانگرس (لندن) میں لیکچر دیئے۔ لندن میں ان کا لیکچر انقلابی کہا

جاسکتا ہے اس لئے کہ اس وقت تک یورپ میں طفیلی کیڑوں سے متعلق کوئی مخصوص آزاد سائنس نہیں تھی۔ اس کے علاوہ پہلی بار ایک سوویت پروفیسر نے عالمی کرمیاتی کانگرس بلانے کی تجویز کی تھی۔ اس زمانے میں یورپ کے چوٹی کے ماہرین کرمیات ایک نئی آزاد سائنس کی تشکیل کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ کرمیاتی بیماریاں جانوروں کی دوسری قسم کی بیماریوں سے زیادہ اہم نہیں ہیں۔

وقت گزرتا گیا اور کرمیات کے سوویت ماہروں کی کامیابیاں مشرق و مغرب میں وسیع پیمانے پر مشہور ہوتی گئیں۔ لندن کانگرس کے تیس برس بعد ایک مشہور ہندستانی مویشیوں کے معالج پروفیسر تھاپڑ نے کرمیاتی کانگرس منعقد کرنے کے سلسلے میں اپنے روسی رفیق کار کا حوالہ دیا اور یہ تجویز بھی کی کہ کرمیات کے ماہرین کے عالمی اجلاس میں کن کن لوگوں کو دعوت دی جائے۔

1936ء میں اسکریابن نے پہلی مرتبہ بلغاریہ کا سفر کیا۔ اس وقت اس ملک میں جہاں شاہ بورس حکمران تھا وہ پہلے سوویت پروفیسر تھے جنہیں داخل ہونے کی اجازت ملی تھی۔ سرکاری حکام خائف تھے کہ کہیں سوویت اکادمیشن سے دلچسپی کے مظاہرے نہ ہوں۔ چنانچہ ان کے لیکچروں کے لئے انہوں نے شہر صوفیہ میں ایک چھوٹا سا ہال فراہم کیا۔ اس کا نعم البدل یوں مل گیا کہ جب علم حیاتیات کے طالب علم اور پروفیسر لیکچر سننے آئے تو انہوں نے اپنے مہمان کا بڑا پُرجوش خیر مقدم کیا۔

صوفیہ یونیورسٹی کے ایک لیکچرر کونستنتین ماتوف ان لوگوں میں تھے جنہوں نے اسکریابن کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا تھا۔ سولہ سال کے بعد 1952ء میں ایک ثقافتی وفد کے رہنما کی حیثیت سے اسکریابن پھر بلغاریہ گئے اور اپنے پرانے رفیق کار سے ملے۔ اسکریابن اپنے بیرونی دوروں کے وقت بھی حسب معمول کسانوں، وزیروں، سائنس دانوں، طالب علموں اور زراعت کے ماہروں سب ہی سے ملاقاتیں کرتے ہیں، لیکچر دیتے، صلاح و مشورے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں اور عمل ہدایتیں دیتے ہیں۔ اس دورے کے بعد ہی بلغاریہ کی سائنس اکادمی نے سوویت یونین کی مثال سامنے رکھتے ہوئے کرمیاتی تجربے گاہ کھولی جس کا رہنما کونستنتین ماتوف کو مقرر کیا گیا۔

یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی۔ اس سلسلے میں پروفیسر ماتوف نے لکھا: "بلغاریہ میں کرمیات کی سائنس نے کونستنتین اسکریابن کے زیر اثر اور براہ راست ان کی رہنمائی میں ترقی کی اور کر رہی ہے۔" انہوں نے مزید لکھا: "اکادمیشن اسکریابن کی کئی تصانیف ایک مدت سے طالب علموں اور مویشیوں کے معالجوں کے نصاب میں شامل ہیں۔"

اسکریابن پانچ بار بلغاریہ جا چکے ہیں۔ ہر بار جب بھی وہ وہاں گئے انہوں نے اپنی آنکھوں

سے دیکھا کہ طفیلی کیڑوں کے خلاف سرگرمیاں وسعت اور کارگری کے لحاظ سے برابر بڑھتی جارہی ہیں۔ اپریل 1958ء میں کونستنتین اسکریابن متفقہ طور سے بلغاریہ کی سائنس اکادمی کے ممبر چنے گئے۔ اسی سال حکومت بلغاریہ نے اپنے ملک کی سائنس کی ترقی میں ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں گیورگی دمیتروف کا آرڈر عطا کیا۔ اس کے علاوہ ان کے رفیق کاروں نے مویشیوں کے علاج کے اعلیٰ انسٹی ٹیوٹ صوفیہ میں کرمیات کے شعبے کو اسی مشہور روسی سائنس داں کے نام سے نوازا۔

صرف بلغاریہ ہی وہ تنہا سوشلسٹ ملک نہیں ہے جس نے اسکریابن کو اعزاز دیئے ہیں۔

کونستنتین اسکریابن کے مشورے پر تحقیقات کے لئے مختلف ملکوں کو مختلف کرمیاتی بیماریاں "بانٹ دی گئیں"۔ مثلاً پولینڈ کو عالمی پیمانے پر مرض ترخینیا (Trichinosis) کا مطالعہ حوالے کیا گیا۔ ہنگری کے حصے میں ردائیت (Fascioliasis) کی بیماری آئی۔ اور سوویت یونین نے قنفذیہ (Echinococcus) کے خلاف جدوجہد شروع کی۔ سمجھوتے کے مطابق ہر ممبر ملک کی یہ ذمہ داری قرار پائی کہ وہ مناسب تحقیقاتی کام منظم کرے، اس میدان سے متعلق تمام لٹریچر حاصل کرے اور کرمیات کی مخصوص شاخ سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے ممبر ملک کو تمام ضروری معلومات مفت فراہم کرے۔ ابتدا میں تمام ممبر ملک سوشلسٹ تھے۔ کچھ عرصہ بعد اسکریابن کے منصوبے نے ان ملکوں کی سرحدیں پار کرلیں۔ اب پولینڈ والوں کے ساتھ مغربی جرمنی کے عالم، انگریز اور امریکی سائنس داں پولینڈ کی سائنس اکادمی کی رہنمائی میں ترخینیا کے مسئلے پر کام کررہے ہیں۔ ایک عالمی رسالہ جس کے کرتا دھرتا پروفیسر اسکریابن ہیں سائنس دانوں کی اس بین الاقوامی برادری کی معاونت کرتا ہے۔

یورپ اور امریکہ میں کرمیات کے متعلق سوویت تصنیفات بڑے پیمانے پر پڑھی جاتی ہیں اور وہاں انہیں سراہا جاتا ہے۔ کرمیات کے ماہروں کی امریکی سوسائٹی نے ایک خاص "روسی کمیٹی" قائم کی ہے۔ اس کا کام انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لئے روسی ماہرین کرمیات کی مناسب تصانیف کا انتخاب کرنا ہے۔ ابھی تک یہ کمیٹی اسکریابن، شیخوبالووا اور شولز کی تصنیف "نیماٹوڈولوجی (Nematodology) کے اصول" کی تمام جلدیں اور پروفیسر اسپاسکی کی ضخیم کتاب "سیسٹوائیڈولوجی (Cestoidology) کے اصول" شائع کر چکی ہے۔ "کرمیات اور زرعی مویشی پر بیماریوں کا ہجوم" جس کے مؤلف یرشوف ہیں امریکہ میں مویشیوں کے علاج کے طالب علموں کو پڑھائی جاتی ہے۔

سائنس سرحدوں کی پابند نہیں ہے۔

1972ء میں کونستنتین اسکریابن کی رحلت ہوگئی۔ اگر ان کی داستان حیات اور سائنس کی دنیا میں ان کے قابل قدر اضافہ پر قلم اٹھایا جائے تو ایک مضمون تو کجا اس کے لئے کئی جلدیں درکار ہیں۔ انہوں نے آنے والی نسلوں کو ورثے میں کیڑے ختم کرنے کا جو نظریہ دیا، صرف اسی کے لئے تاریخ میں ان کا نام ایسے عظیم انسان دوست شخصیتوں کی طرح ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا جیسے لوئی پاسٹیر، رابرٹ کوخ، ڈانیل زبولوٹنی، ولادیمیر ھافکن، رونلڈ روس اور الیکزینڈر فلیمنگ۔ لیکن ان کا ایک مزید کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے سائنسی فکر کا اپنا مکتب قائم کیا اور کرمیاتی بیماریوں کے خلاف جدوجہد کرنے کے لئے ایسی زبردست سرکاری تنظیم کھڑی کی جس کی دنیا میں مثال نہیں ملتی۔

کونستنتین اسکریابن نے اپنے وطن کے لئے جو خدمات انجام دیں انہیں اچھی طرح سراہا گیا ہے۔ ایک بڑا دخانی جہاز جو دریائے والگا پر چلتا ہے ان ہی کے نام سے منسوب ہے۔ پہاڑ تیان شان کی ایک اونچی چوٹی، اسکریابن کے نام سے مشہور ہے۔ مویشی کے علاج کے طالب علم نو واچیر کاسک انسٹی ٹیوٹ کے اسکریابن نامی طفیلی کیڑوں کے شعبے میں پڑھنے جس سڑک سے آتے ہیں اس پر بھی بیسویں صدی کے مشہور ترین ماہر کرمیات کا نام نظر آتا ہے۔ اسی طرح علم کرمیات کا کل یونین انسٹی ٹیوٹ ماسکو میں اور قرغیزیہ کا زرعی انسٹی ٹیوٹ اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس منکسر اور سادہ مزاج انسان پر دنیا بھر سے اعزازات کی بارش ہوئی ہے۔ یہ کتنے فخر کی بات ہے کہ انہیں پانچ مرتبہ آرڈر آف لینن، تین مرتبہ محنت کے سرخ پرچم کا آرڈر اور سرخ ستارے کا آرڈر مل چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے دو ریاستی انعام اور لینن انعام بھی حاصل کئے ہیں۔ دنیا کی کئی سائنس اکادمیوں اور انجمنوں نے انہیں اپنا اعزازی ممبر بنایا ہے۔

از: مارک پوپوفسکی